[illegible]

مضامین ڈار

[illegible]

[illegible]

[illegible]

پبلشر

لیٹ پروفیسر ڈار پبلیکیشن کمیٹی بمبئے

ماروتی لین۔ رگوناتھ دادا جی اسٹریٹ بمبئی ۱

کتاب ملنے کا پتہ

کرنٹ بک ہاؤس

ماروتی لین، رگھوناتھ دادا جی اسٹریٹ ہارنبی روڈ
بمبئی نمبر ۱

پرنٹر پبلشر اورینٹیل جوبرز الائنس بلڈنگ ۹ ۳۴۳ ہارنبی روڈ بمبئی ۱ نے قادری پریس محمد علی روڈ بمبئی
سے کرلیٹ روفیسر ڈار پبلیکیشن کمیٹی بمبئی کیلئے کرنٹ بک ہاؤس ماروتی لین رگھوناتھ دادا جی اسٹریٹ
ہارنبی روڈ بمبئی ۱ سے شائع کیا۔

فہرست

پیش لفظ

مرحوم پروفیسر محمد ابراہیم ڈار کے مقالات پر "پیش لفظ" لکھنے کی مجھ سے فرمائش ہوئی ہے۔ ——— مگر میں تو ان چند سطور کو جو آج لکھ رہا ہوں پیش لفظ نہیں کہوں گا۔ بلکہ ان کے لئے "پس لفظ" کی اصطلاح تجویز کروں گا۔ کیونکہ یہ سطور میں اپنے مرحوم دوست کے مرنے کے بعد لکھ رہا ہوں۔ اس لحاظ سے یہ فرض جو یوں بڑا خوشگوار ہوتا اب کسی حد تک غم انگیز سا محسوس ہو رہا ہے۔ ابراہیم صاحب سے میرے تعلقات کی ابتداء ۱۹۲۷ء میں ہوئی جب وہ عربی میں ایم، اے پاس کر چکنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی میں عربی کے ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے اور میں ان دنوں عربی فارسی مخطوطات کی مشرح فہرست سازی پر مامور تھا۔ شروع شروع کے چند مہینے قدرے تکلف میں گذرے۔ میں طبعاً کم آمیز آدمی ہوں۔ جب تک مجھے یہ اچھی طرح معلوم نہیں ہو جاتا کہ کوئی شخص میرا بالکل ہم مزاج ہے اس وقت تک اس سے میری طبیعت کھلتی ہی نہیں۔ اس لئے شروع میں بیگانگی سی رہی۔ شاید ابراہیم بھی اسی وجہ سے کچھ جرأت نہ کر سکے۔ اور معاملہ محض علیک سلیک تک محدود رہا۔ مگر یہ حالت دیر تک قائم نہ رہی، اور آخر "رفع حجاب" کی ایک صورت خود بخود نکل آئی۔ اور وہ یوں کہ میں اس زمانہ میں ایک مخفی نام سے اخبارات میں خصوصاً زمیندار میں سیاسی مضامین لکھا کرتا تھا۔ یہ بڑی سیاسی گرم بازاری کا زمانہ تھا۔ اس زمانہ میں ہر شخص کو کسی نہ کسی مسلک سے وابستہ ہونا ہی پڑتا تھا۔ میں مولانا محمد علی کے زیر اثر اور جامعہ کا تربیت یافتہ ہونے کے سبب وطن پرست جماعتوں کا طرف دار تھا۔ نہرو رپورٹ کی تدوین ہو چکی تھی۔ اور مسلم لیگ کانگریس کی کشمکش کی ابتداء تھی، ——— میرے مضامین سرکار پرستوں کے مسلک کے خلاف ہوتے تھے۔ اور میں

لکھتا بھی محنت سے تھا۔ ادھر ابراہیم صاحب آغاز سے ہی وطن پرست آزاد خیال آدمی تھے۔ ان کے بیشتر بھائیوں کے بھی عقائد یہی تھے۔ ابراہیم صاحب جب کبھی زمیندار میں میرے مضامین پڑھتے ان کا اپنی گفتگوؤں میں ذکر کیا کرتے ——— کبھی تنقیداً کبھی تحسیناً ——— مگر میں بڑی احتیاط سے ان سے اپنی "صورت" کو چھپانے کی کوشش کرتا۔ غرض وہی مضمون تھا — "لڑکا بغل میں ڈھنڈورا شہر میں"۔ مگر یہ "چھپنا لکنا" دیر تک نبھ نہ سکا۔ ابراہیم صاحب بڑے زیرک آدمی تھے وہ بہت جلد میرے "انداز قد" کو پہچان گئے۔ اور بالآخر مجھ سے "اقبال جرم" کرا ہی لیا۔

آغاز تعلقات کی یہ کہانی اس لئے "درازتر" بیان ہوئی ہے کہ اس کے بعد عمر بھر کے گہرے مراسم کی کہانی مختصر بیان کرنی ہے۔ میرے ان کے مراسم گہرے تھے۔ بہت گہرے، ہر بزم میں یک جا اور ہر محفل میں ہم نوا ——— اس دلی محبت اور قلبی موانست کا سلسلہ آخری وقت تک جاری رہا۔ پنجاب یونیورسٹی کی ریسرچ سکالری کے بعد وہ بسلسلہ ملازمت بمبئی چلے گئے۔ اس زمانے میں بھی ان سے میرے تعلقات کا عالم وہی رہا۔ اکثر خط وکتابت رہتی تھی۔ جب وہ پنجاب آتے تو وہی پرانا دور تازہ ہو جاتا۔ مرحوم بڑے خلیق، ملنسار، ہمدرد اور ایثار پیشہ شخص تھے۔ علمی جستجو ان کی خاص تفریح تھی۔ حافظہ بہت تیز تھا۔ جو چیز ایک دفعہ پڑھ لیتے کبھی نہ بھولتی تھی۔ نہایت صاف گو، اور بے ریا آدمی تھے۔ حیلہ وفن سے ناآشنائے محض، متوکل، قناعت پسند، منکسر المزاج، غرض بے شمار اوصاف کے مالک تھے۔ جن میں سے ہر ایک ان کو مقبول بنانے کے لئے کافی تھا۔ بہر حال ابراہیم صاحب خوب آدمی تھے۔ عمر کے آخری ایام میں بیماری کی خبریں اکثر سننے میں آتی تھیں۔ آخر ایک دن دفعتہً یہ خبر جاں گزا سننے میں آئی کہ ابراہیم صاحب اس دنیا سے چل بسے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

ع دل بھی چھٹا رفیق جو اپنا قدیم تھا

بڑا افسوس ہوا۔ ان اوصاف کے لوگ آج کل کہاں ملتے ہیں۔ میں نے ان کی موت کو ایک علمی حادثہ کی نظر سے دیکھا اور اس حیثیت سے تادیر ان کا ماتم کیا۔ مجلس یادگار ابراہیم

کی داد دینی پڑتی ہے کہ انھوں نے مرحوم کی علمی یادگاروں کو محفوظ کر لینے کا فیصلہ کیا۔ اور یہ مجموعہ مرتب کیا۔

اس مجموعہ میں پروفیسر ابراہیم ڈار کے جتنے بھی مضامین ہیں ان سے دو باتیں صاف صاف نمایاں ہیں۔ ایک ان کی وسعت نظر، دوسری ان کی تنقیدی گرفت، ——— اور یہ دونوں خوبیاں اُن کے اور میرے مشترک استاد پروفیسر شیرانی کی ممتاز خصوصیات تھیں مرحوم پروفیسر شیرانی کے فیض صحبت سے پروفیسر ابراہیم کی ان صلاحیتوں میں اور بھی چمک پیدا ہوئی۔ موجودہ مقالات سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہوتی ہے کہ ابراہیم تحقیق و تنقید میں شیرانی اسکول کے ممتاز ترین فرد تھے۔ پیش نظر مقالات میں بھی پروفیسر ابراہیم نے اپنے استاد کی حمایت کا حق خوب خوب ادا کیا ہے۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ پروفیسر شیرانی نے جس استیعاب اور جامعیت سے شمس العلماء کی غلطیوں کو پکڑا تھا۔ ابراہیم صاحب کے مقالوں میں بھی استیعاب، جامعیت اور گرفت کی وہی شان نظر آتی ہے' واقعات و مسائل کی تاریخی تحقیق تو خیر بڑی وسیع شئے ہے اس تک تو ہر شخص کی رسائی بقدر سعی ہوتی ہے مگر انداز بیان کی انفرادیت سے کچھ اور ہی بات پیدا ہوجاتی ہے۔ اس قسم کے تاریخی مباحثوں میں ادب کا سا حسن جس عنصر سے پیدا ہوتا ہے وہ حسن بیان پر ہی منحصر ہے پروفیسر شیرانی کی اکثر تاریخی اور مناظراتی تحریروں میں ادبی لطف پایا جاتا ہے، اور یہی خوبی پروفیسر ابراہیم کی تحریر میں بھی ہے۔ متانت اور قطعیت کے ساتھ ساتھ شگفتگی اور کشادگی ان کی تحریر کا خاصہ ہے۔

تاریخیات میں بحث و مناظرہ کے دو بڑے ارکان ہیں۔ اوّل امر واقعہ کی صحت و عدم صحت کی بحث۔ دوم بیان کے ایسے انداز جن سے بیانات دل نشین ہوجائیں، پہلے رکن سے مخاطب میں تیقن کی اور دوسری چیز سے قارئین کی طبائع بھی لطف و انبساط کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ مناظرہ میں عموماً لطیف سے طنز کے ذریعے بڑے بڑے معرکے سر ہوجاتے ہیں۔ کھلی ظرافت ایسی متین تحریروں کے لئے مناسب نہیں ہوتی بس دھیمی سی طنز یہ چوٹ حریف کو بے بس ہی تو کر دیتی ہے۔ شمس العلماء مولوی عبد الغنی

میں یہی کمی تھی کہ وہ اپنے قارئین کے دل میں گدگدی پیدا نہیں کر سکے۔ اور سامعین و قارئین کا یہ تبسم ہی دراصل کسی انشا پرداز کی کامیابی کا ثبوت ہوتا ہے۔ مگر پروفیسر ابراہیم اپنے استاد شیرانی کی طرح اس فن سے خوب واقف تھے۔ چنانچہ ان مقالات میں ہم ان کے اس کمال کے مظاہرے باربار دیکھتے ہیں ـــــ اور جتنی بار دیکھتے جاتے ہیں اتنی ہی بار بچارے شمس العلماء کی حالت قابل ترحم ہی معلوم ہوتی ہے۔

ہندوستان میں مغلوں سے قبل فارسی ادب کی تنقید پروفیسر ابراہیم کا شاہکار ہے ـــــ اس کی جزئیات و تفصیلات، طرز استدلال اور طریق بحث اور مقالہ نگار کی وسعت نظر کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور دل میں ایک حسرت سی پیدا ہوتی ہے کہ اے کاش ـــ ایسے ہونہار فاضل کو کچھ دیر اور کام کرنے کا موقع ملتا۔ ان کی تحریر دل سے بڑی بڑی توقعات پیدا ہوتی ہیں۔ مگر افسوس کہ موت کا بے پناہ ہاتھ ان کو ہم سے چھین کر لے گیا اور وہ اس سے زیادہ کام نہ کر سکے۔

دیوان خواجہ اجمیری اور شیخ عطار کی تصانیف والے مضامین غلط انتساب سے متعلق ہیں ـــــ اور خوب ہیں، یہ بھی پروفیسر شیرانی کے رنگ کے مضامین ہیں اور ان ہی کے نصب العین، انداز تحقیق اور اسلوب بیان کا عکس لئے ہوئے ہیں۔ ان میں بھی ش گرد پر استاد کے فیوض کا پرتو صاف نظر آتا ہے۔ ان مضامین میں ان تاریخی غلط فہمیوں کا ازالہ ہے جن کو شہرت عام نے حقائق کا درجہ دے رکھا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ جو باتیں صدیوں سے مسلمات میں داخل ہو چکی ہوں ان کی تردید کوئی آسان کام نہیں، ـــــ اس کے لئے تو بڑی جامع اور گہری تحقیق کے علاوہ پرزور انداز بیان کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ دونوں اوصاف ان مضامین میں پائے جاتے ہیں۔ جن کی مدد سے ابراہیم صاحب اس مشکل مرحلے کو کامیابی سے طے کر سکے ہیں۔

ابراہیم صاحب کے باقی مضامین میں سے "حیات شبلی پر ایک نظر" اس لئے خصوصی توجہ کا مستحق ہے کہ اس میں وہ ایک بڑی آزمائش سے کامیاب نکلے ہیں۔ اس مضمون میں مقالہ نگار کو دوگونہ تکلیف درپیش تھی ـــــ وہ گویا چکی کے دو

پاٹوں کے درمیان پس رہے تھے۔ ایک طرف مولانا ابوالکلام دوسری طرف مولانا سید سلیمان ندوی ——— اور وہ ٹھہرے دونوں کے عقیدت مند ——— اس سبب سے اس بحث میں انھیں سخت آزمائشوں سے گذرنا پڑا مگر میرا اندازہ یہ ہے کہ وہ اس دشوار گذار منزل سے بخیر وخوبی وکامیابی سے عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ یوں یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ مضمون میں جھکاؤ مولانا ابوالکلام کی طرف ہے اور مرحوم علامہ سید سلیمان ذرا نقصان میں رہے ہیں۔

اس مجموعے میں اقبال پر ان کے دو مضمون ہیں اور دونوں اچھے ہیں مگر میری رائے میں "اقبال کی وطن دوستی والا مضمون نسبتاً ناتمام اور محتاج تکمیل ہے اور کسی حد تک سیاسی جوش کے تحت لکھا گیا ہے۔ اسی وجہ سے اس کی علمی روح خاصی کمزور ہے البتہ اقبال اور عربی شعراء ایک ایسا موضوع ہے جو اچھوتا بھی ہے اور نہایت اہم بھی ——— اس موضوع پر آج تک بہت کم لکھا گیا ہے حالانکہ اقبال نے اپنی عجمی لَے کے اعتراف کے باوجود نوائے عربی سے اپنی سرشاری کا پرزور الفاظ میں ذکر کیا ہے مگر تعجب کی بات یہ ہے کہ اقبال کی نوائے عربی کو سمجھنے کی کسی نے کوشش نہیں کی۔ اقبال پر اسلامی حکمت کا اثر بھی ایک لحاظ سے عربی اثرات ہی کی ایک صورت ہے۔ خصوصاً "حکمت ایمانی" کے اثرات جن کی بنیاد ہی قرآن وحدیث پر ہے۔ مگر اس کا مکمل تجزیہ ابھی تک نہیں ہوا اور عربی شاعری اور عربی ادب سے استفادہ کی داستان تو کسی نے چھیڑی ہی نہ تھی۔ غالباً پروفیسر ابراہیم ہی پہلے شخص ہیں جن کو اس اہم موضوع کی طرف توجہ ہوئی ——— انھوں نے مطالعہ اقبال کی اس ضروری بحث پر قلم اٹھا کر بڑی اہم خدمت انجام دی ہے۔ اور حق یہ ہے کہ وہ اسکی پوری اہلیت بھی رکھتے تھے۔ عربی ادب سے ان کا تعلق دیرینہ تھا۔ وہ عربی ادب کے شاہکاروں کا گہرا مطالعہ کئے ہوئے تھے۔ اس کی صحیح روح سے باخبر تھے اور اسکی جاندار اور شاندار روایات کا وسیع علم رکھتے تھے ——— اسی استعداد کے سہارے وہ اس اہم مضمون سے اچھی طرح عہدہ برآ ہو سکے ہیں۔

باقر علی ترمذی والا مضمون ایک "ذاتی تاثر" ہے جو انھوں نے ایک جگری دوست کی موت پر لکھا ہے ۔ اس سے مرحوم پروفیسر ابراہیم کی شرافت، خلوص، ہمدردی، محبت اور مہر و الفت کا بھی بڑا ثبوت ملتا ہے، ـــــــ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے دوستوں اور رفیقوں کے غم کو کس طرح محسوس کرتے تھے ۔ وہ اُن کے کتنے قریب ہو جاتے تھے ـــــــ اُن سے کتنا جذباتی لگاؤ پیدا کر لیتے تھے ـــــــ وہ کتنے وفادار اور وفاداری میں کتنے استوار تھے ـــــــ وہ صرف نباہ کے قائل نہ تھے، وفا اور ثابت قدمی میں اعتقاد رکھتے تھے ۔ یہ سب خوبیاں ان میں تھیں اور جو خوبیاں انھوں نے مرحوم باقر علی ترمذی میں ثابت کی ہیں وہ سب خود اُن کی اپنی ذات میں بھی موجود تھیں ۔

میں دیکھتا ہوں کہ اس مجموعے میں وہ مضامین موجود نہیں جو پروفیسر ابراہیم نے لاہور کے اورنٹیل کالج میگزین میں جاحظ وغیرہ لکھے تھے ۔ انھوں نے ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے جاحظ کی کتاب البخلاء کا ترجمہ انگریزی میں کیا تھا ـــــــ اسی زمانے میں انھیں جاحظ کی تصانیف کا امعان نظر مطالعہ کرنے کا موقع ملا تھا ۔ اور انھوں نے اس پر کچھ مضامین لکھے تھے جو میری دانست میں بڑے پُراز معلومات اور خیال انگیز مضامین تھے ۔ مناسب یہ ہوگا کہ دوسری طباعت میں یہ مضامین بھی شامل کر لئے جائیں ۔

یہ سرسری سے خیالات ہیں جو مجھ سے اس مجموعہ مقالات کے سلسلے میں مرتب ہو سکے ہیں ۔ اس تحریر کے لکھتے وقت میں طبیعت کو کچھ سنبھال نہ سکا ۔ کیونکہ کسی دوست کی لوح مزار تیار کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے ۔ تاہم تعمیل ارشاد پر مجبور رہوں ۔ اور ڈاکٹر ظہیر مدنی اور مرحوم پروفیسر ابراہیم ڈار پبلیکیشن کمیٹی کا شکر گذار ہوں کہ انھوں نے مجھے بھی اس کام میں شریک ہونے کا موقعہ دیا ـــــــ اور اس طرح مجھے اپنے مرحوم دوست سے ان مضامین

کے ذریعہ "نصف الملاقات" کی مسرت حاصل ہوئی۔ اور اس طرح پاکیزہ یادوں کی یادگار قائم کرنے کا ایک خوشگوار فرض بھی ادا ہو گیا۔

سید عبداللہ
یونیورسٹی پروفیسر اردو
پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور

یونیورسٹی اورنٹیل کالج
لاہور

مرحوم ڈار

گذشتہ نو سال کے عرصے میں اسماعیل کالج کی محفل علم و ادب کے تین ایسے رکن اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے جن کی یاد ہمارے دلوں میں ہمیشہ تازہ رہے گی۔ اس بزم کے صدر نشین ڈاکٹر بدل الرحمٰن سنہ ۱۹۴۷ء میں رحمٰن حقیقی کو پیارے ہو گئے۔ کالج کے لئے یہ صدمۂ عظیم تھا۔ مرحوم کی سرپرستی میں کالج نے جو ترقی کی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ صرف کالج ہی ان کا مرہونِ منت نہیں، بلکہ بمبئی شہر کے مختلف علمی و تعلیمی ادارے اس چراغِ ہدایت سے منور ہوتے رہے ہیں۔ ابھی آنکھ کے آنسو خشک ہونے ہی پائے تھے کہ ڈاکٹر باقر علی ترمذی اعلیٰ تعلیم کے لئے قاہرہ گئے سنہ ۱۹۵۱ء میں اس عروس البلاد کی آغوش میں ہمیشہ کے لئے سو گئے۔ اس جوان مرگی اور کالج کی بدقسمتی کا شورِ ماتم ابھی ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ اس بزم کے تیسرے سرگرم رکن پروفیسر محمد ابراہیم صاحب ڈار نے داغِ مفارقت دیا۔ علمی فضا میں اس محشر خیز تلاطم سے جو اثرات پیدا ہوئے ہیں اس کا اندازہ کرنا ناممکن ہے، ڈار صاحب کی موت صرف ان کے اہل و عیال ہی کے لئے باعثِ رنج و غم نہیں ہے بلکہ یہ قومی سانحہ ہے۔ بیسیوں جویندگان علم ان کی رہبری سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئے۔

ڈار صاحب اہل کشمیر سے تھے۔ کشمیر کا ایک برہمن خاندان ڈار، ڈر اور در کے نام سے مشہور ہے۔ اسی جماعت کے ایک فرد ڈار صاحب کے دادا مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ یہ بزرگ اپنے آبائی وطن کو ترک کر کے تلاشِ معاش میں لاہور آ گئے اور یہیں بود و باش اختیار کر لی ان کے بیٹے یعنی ڈار صاحب کے والد شیخ حبیب اللہ لاہور میں گورنر کے عملہ میں ملازم تھے، ملازمت سے سبکدوش ہونے پر شیخ صاحب نے ٹھیکیداری کا سلسلہ شروع کیا۔ اسی سلسلہ میں یہ لاہور سے امرتسر آ گئے۔ جہاں مستقل بود و باش اختیار کر لی۔

شیخ صاحب نے یکے بعد دیگرے تین عقد کئے۔ آخری بیوی سے چھ فرزند پیدا ہوئے جن میں سے دو نے صغر سنی میں وفات پائی۔ باقیوں میں سے ڈار صاحب کے بڑے بھائی

شیخ یوسف نے درویشی اختیار کر لی۔ دوسرے بھائی شیخ محمد یامین سن شعور سے تادمِ مرگ ملکی سیاست میں الجھے رہے۔ یہ سوشلسٹ جماعت کے ایک سرگرم رکن تھے۔ ان کی انتہا پسندی کی وجہ سے حکومت برطانیہ نے انھیں ۱۹۴۲ء میں نظر بند کر دیا تھا۔ دورانِ قید میں یہ قیدِ فرنگ و قیدِ حیات دونوں سے آزاد ہو گئے۔ ڈار صاحب کے چھوٹے بھائی عبد الغنی صاحب نے بھی اپنی خاندانی روایت کو زندہ رکھا۔ جنگِ آزادی کے ابتدائی دور سے یہ انڈین نیشنل کانگریس کے ایک جانباز سپاہی کی طرح خدمت انجام دیتے رہے۔ اور اپنی خدمات کی وجہ سے کئی سال اس کی مجلس عاملہ کے بھی سرگرم رکن رہ چکے ہیں۔ اس وقت پنجاب کے ایم۔ ایل۔ اے کی حیثیت سے خدمت الناس میں مصروف ہیں۔

ڈار صاحب میں بھی خاندانی جذبۂ حریت بدرجہ اتم موجود تھا۔ اس جذبۂ حریت نے اپنے ظہور کے لئے علم و ادب کی جولانگاہ تجویز کی۔ ان کی تقریر و تحریر دونوں میں ان کی فطرت کے اس وصفِ خاص کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ڈار صاحب کی ثانوی تعلیم امرت سر کے اسلامیہ ہائی اسکول میں ہوئی۔ "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" یہ ابتدا سے اپنی ذکاوت و ذہانت کے ثبوت پیش کر کے اپنے استادوں اور ہم درسوں سے خراج تحسین حاصل کرتے رہے۔ تقریر و تحریر میں شاید ہی کوئی طالب علم ان پر سبقت لے گیا ہو۔ میٹرک کے امتحان میں صوبۂ پنجاب کے کل مسلمان طلباء میں ڈار صاحب اول رہے۔ اور وظیفہ حاصل کیا۔ میٹرک کے بعد بی۔ اے تک امرت سر کے خالصہ کالج میں تعلیم حاصل کی۔ عربی اُن کا محبوب مضمون تھا۔ بی۔ اے میں بھی امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوئے۔ ایم۔ اے کے لئے انھیں لاہور جانا پڑا۔ جہاں خوش قسمتی سے پرنسپل محمد شفیع صاحب جیسے عالم متبحر سے اکتسابِ علم کا موقع ملا۔ ڈار صاحب بھی ہونہار تھے، شفیع صاحب کی نظر نے انھیں تاڑ لیا تھا۔ موصوف نے ان کی تربیت میں خاص دلچسپی لی اور اس طرح شفیع صاحب کی توجہ خاص کی وجہ سے ان کی لیاقتوں کو ابھرنے کا زرّیں موقع مل گیا۔ ڈار صاحب بھی اس احسانِ عظیم کو کبھی نہ بھولے۔ اکثر اپنے استاد کے علم و فضل اور رعب و جلال کا تذکرہ چھیڑتے تو گھنٹوں مزے لے لے کر بیان کرتے۔ شفیع صاحب سے یہ بہت مرعوب تھے۔ فرماتے تھے کہ "آج بھی شفیع صاحب سے اتنا ہی ڈرتا ہوں جتنا زمانۂ طالب علمی میں ڈرا کرتا تھا۔ مولوی فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات میں بھی محض اپنے استاد کے حکم کی تعمیل اور خوشنودی کے

خیال سے شریک ہوا تھا۔ ورنہ خود اس کا آرزومند نہیں تھا" ایم اے کا امتحان عربی سے دیا۔ اور اس میں بھی اول درجے میں کامیاب ہوئے۔ اور میک لیوڈ اسکالرشپ حاصل کی اور سنہ ۲۸ء سے سنہ ۳۱ء تک پنجاب یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے شفیع صاحب کی نگرانی میں جاحظ کی کتاب الحیوان پر چند مضامین سپرد قلم کیئے۔ اسی دوران میں جاحظ کی کتاب البخلا کا اردو میں ترجمہ کیا۔ جو پنجاب یونیورسٹی میں محفوظ ہے۔ ایم اے کے بعد ڈار صاحب امرتسر چلے آئے تھے۔ کیونکہ ان کے والد کو ان کی جدائی منظور نہیں تھی۔ ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے جب ڈار صاحب کا تقرر ہوا تو شفیع صاحب نے انھیں لاہور میں رہنے کو کہا۔ یہ موقع ڈار صاحب کے لئے بہت ہی آزمائش کا تھا، ایک طرف والد کی محبت کا پاس، دوسری طرف استاد کی خوشنودی کا خیال، ڈار صاحب نے کسی کو ناراض ہونے کا موقع نہیں دیا انھوں نے تقرر منظور کرلیا۔ مگر روزانہ امرتسر سے لاہور جاتے۔ اگرچہ اس میں انھیں بڑی زحمت ہوتی۔ لیکن ڈار صاحب نے یہ تکلیف گوارا کرلی۔

ڈار صاحب کے لئے یہ زمانہ نہایت مبارک و مسعود ثابت ہوا۔ اسی زمانے میں انھیں دور کے جید عالم و محقق حافظ محمود شیرانی کی صحبتوں سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ شیرانی صاحب سے ڈار صاحب کی ملاقات کا واقعہ نہایت دلچسپ ہے۔ لاہور کی کسی ادبی صحبت میں شیرانی صاحب مقالہ پڑھنے والے تھے۔ اس مجلس میں ڈار صاحب بھی شریک تھے۔ اس زمانہ میں شیرانی صاحب کی تنقید شعر العجم مولانا شبلی کے موافقین و مخالفین کی صحبتوں کا موضوع بحث بنی ہوئی تھی۔ شیرانی صاحب کو دیکھتے ہی ڈار صاحب کو تنقید شعر العجم یاد آگئی۔ چونکہ ڈار صاحب بڑے منچلے شخص تھے، دل چاہا کہ شیرانی صاحب کے ایک آدھ چٹکی لے لیں۔ شیرانی صاحب مجلس برخاست ہونے کے بعد باہر نکلے ہی تھے کہ ڈار صاحب ان کی طرف لپکے اور راستہ روک کر یہ کہتے ہوئے گذر گئے۔ شیرانی صاحب! تنقید اور تنقیص میں کیا فرق ہے؟ ڈار صاحب کے اس طرز عمل سے ان کی فطرت کے اہم گوشے واضح ہوجاتے ہیں۔ یہ بھی ظاہر ہوجاتا ہے کہ ابتدائی دور میں بھی انھیں اپنی رائے پر پورا بھروسہ تھا۔ اور اس کے اظہار میں یہ کبھی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے۔ شیرانی صاحب جیسے بزرگ سے ڈار صاحب کا یہ انداز گفتگو

کوئی "مستحسن" بات نہیں تھی۔ لیکن ڈار صاحب مقتضائے فطرت سے مجبور تھے۔ وہ کسی سے محبت کرتے تو اتنی شدت کے ساتھ کرتے کہ اس کے خلاف ایک لفظ سننے کو تیار نہ ہوتے، اس سے پہلے کہ شیرانی صاحب سوال کا جواب دیں، ان کا نکتہ چین جا چکا تھا لیکن شیرانی صاحب بھی تھے بڑے سخت، ڈار صاحب کی کھوج میں رہے اور موقع پاتے ہی ڈار صاحب کو چائے پر مدعو کیا اور اس صحبت میں اپنا جواب تفصیل سے پیش کر دیا۔ شیرانی صاحب کے جواب سے ڈار صاحب کی تشفی ہوئی یا نہیں یہ کہنا مشکل ہے۔ لیکن یہ اُن کے علم و فضل سے بہت متاثر ہوئے۔ اور اس دن سے یہ انھیں اپنا استاد ماننے لگے۔ ان دونوں کے درمیان محبت کا ایک ایسا مضبوط رشتہ قائم ہو گیا تھا کہ آخری دم تک نہ ٹوٹ سکا۔ شیرانی صاحب نے اپنے انتقال سے پہلے اپنی ایک پوتی کو یہ ہدایت کر دی تھی کہ میرے مرنے کی اطلاع ابراہیم صاحب کو ضرور لکھ بھیجنا۔ جب اس مضمون کا خط ڈار صاحب کو ملا تو ان کے رنج و غم کی انتہا نہ تھی۔ میں نے یہ منظر دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ انھیں اپنے قریبی عزیز کے مرنے کا بھی اتنا افسوس نہ ہوا ہوگا۔ نہ ٹھیک سے کھانا کھاتے، نہ کام میں جی لگتا۔ کئی دن یہ حالت رہی، آخر ان کے احباب نے کسی طرح ان کا غم غلط کیا۔ شیرانی صاحب سے اُن کی عقیدت مندی کی جھلکیاں ان کی تحقیق و تنقید میں مل جاتی ہیں۔ ڈار صاحب نے دونوں میدانوں میں اپنے استاد کے نقش قدم پر چلنے کی پوری کوشش کی، اور واقعہ ہے کہ ڈار صاحب نے حق شاگردی ادا کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ ۱۹۴۶ء میں ڈار صاحب نے شیرانی صاحب سے استفسار کیا کہ شمس العلماء عبدالغنی کے جواب تنقید کا جواب الجواب لکھ رہے ہیں، یا نہیں، شیرانی صاحب اس وقت اپنی عمر کی آخری منزل پر تھے، جواب لکھ بھیجا "مجھ میں اور قبر میں اب بہت کم فاصلہ رہ گیا ہے۔ اگر آپ جواب کی ضرورت سمجھتے ہیں تو جواب دیجئے" ڈار صاحب نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ اور ایک نہایت مدلل مضمون لکھ کر رسالہ "اردو" دہلی کو اشاعت کے لئے بھیجا، لیکن بدقسمتی سے ۱۹۴۷ء میں انجمن ترقی اُردو کے کتب خانہ اور دفتر کے ساتھ یہ مضمون بھی انسانیت سوز بربریت کی آگ کی نذر ہو گیا تھا۔ ڈار صاحب نے یہ مضمون دوبارہ لکھا۔

۱۹۳۱ء میں فارسی ادب کے استاد کی حیثیت سے ڈار صاحب کا تقرر گجرات کالج

احمد آباد میں ہوا۔ احمد آباد کے زمین و آسمان ان کے لئے نئے تھے۔ کچھ مہینے انھیں بہت اجنبیت محسوس ہوئی۔ لیکن بہت جلد سازگار ماحول پیدا ہو گیا۔ انھوں نے اپنے علم و فضل، منکسر مزاجی اور خوش طبعی سے طلباء اور شہر کے اہل ذوق حضرات کو گرویدہ بنا لیا۔ اور اس طرح کالج کے باہر بھی شہر کی ادبی سرگرمیوں میں یہ حصہ لینے لگے۔ اس زمانہ میں گجرات کالج میں صدر شعبۂ فارسی کی حیثیت سے پروفیسر نمازی صاحب کام کر رہے تھے۔ چونکہ ڈار صاحب کا خاص مضمون عربی تھا، اس لئے نمازی صاحب انھیں اپنے شعبہ کے لئے زیادہ موزوں نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ ایک دفعہ اثنائے گفتگو میں یہاں تک کہہ دیا کہ اگر انتخاب کا مجھے اختیار دیا جاتا تو میں کبھی آپ کو پسند نہ کرتا۔ کوئی فارسی داں کو لیتا۔ ڈار صاحب کی انصاف پسندی دیکھئے کہ انھوں نے نمازی صاحب سے کلّی اتفاق کیا۔ اور دل میں ذرا میل نہ لائے۔ مگر کچھ دن گذرنے کے بعد نمازی صاحب ڈار صاحب کی فارسی دانی سے اتنے مطمئن ہو گئے کہ کالج کے بڑے درجے کی مشکل کتابیں بھی ان کے ذمے کر دیتے تھے۔ قیام احمد آباد میں تاریخ گجرات ان کا محبوب مشغلہ بن گیا تھا۔ اس شوق کے محرک ایک طرف احمد آباد کے وہ آثار قدیمہ جن میں اُن کے بانیوں کے سطوت و جلال کی جھلکیاں ایک حساس شخص کے دل میں تلاطم برپا کر دیتی ہیں۔ اور دوسری طرف گجرات کالج کے ایک پروفیسر شری کامی سیریٹ صدر شعبۂ تاریخ تھے جو تاریخ گجرات مرتب کر رہے تھے انھیں فارسی ماخذوں کے سلسلہ میں کسی فارسی داں کی مدد درکار تھی۔ لہٰذا ڈار صاحب نے اپنے ایک شریک کار کی علمی اعانت کے خیال سے کتب تواریخ کا مطالعہ شروع کیا۔ ڈار صاحب کے مضامین خلجیوں کے عہد میں گجرات، سلاطین گجرات کے عہد میں علمی تمدنی ترقیاں، مرات احمدی کے ماخذ وغیرہ اسی تاریخ بینی کے شوق کا نتیجہ ہیں۔

سنہ ۳۹ء میں ڈار صاحب کا تبادلہ بمبئی کے اسماعیل کالج میں ہوا۔ چھ سات سال کے قیام احمد آباد میں احباب کے اخلاق کریمانہ نے انھیں اتنا متاثر کیا کہ یہ احمد آباد چھوڑنے میں پس و پیش کر رہے تھے۔ دوسری طرف اہل احمد آباد بھی اس تبادلے سے خوش نہ تھے، بااثر لوگوں نے اس حکم کی منسوخی کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور کامیاب بھی ہوئے لیکن اسکی منسوخی کا حکم اس وقت صادر ہوا جب ڈار صاحب بمبئی آچکے تھے۔ ڈار صاحب نے واپس

جانا مناسب نہیں سمجھا۔ اور یہیں اپنے عہدے کا چارج لے لیا۔

بمبئی کا ادبی ماحول احمد آباد سے بہت مختلف تھا۔ کالج میں ڈاکٹر جن مرحوم، داؤد پوتا، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، ڈاکٹر ہمدانی، سراج حسن نقوی، (صدر شعبۂ سائنس) جیسے ماہر اساتذہ کا اجتماع تھا۔ عربی، فارسی، اردو اور اسلامک کلچر کے میدانوں میں ان لوگوں کی شہ سواری مسلّم تھی۔ مگر ڈار صاحب نے بھی کالج کے اندر اور کالج کے باہر بہت جلد تقریروں کے ذریعے سے اپنی علمی لیاقت کا سکہ بٹھا دیا۔ اگرچہ ڈار صاحب کو اچھا مقرر ہونے کا کبھی دعویٰ نہ تھا۔ اور حتی الامکان تقریر سے گریز کرتے تھے، لیکن جن لوگوں کو ان کی تقریروں سے مستفید ہونے کا موقع ملا ہے وہ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ ڈار صاحب نہایت کامیاب مقرر تھے۔ یہ اپنی تقریر کبھی قلم بند نہ کرتے صرف ذہن میں اس کا خاکہ محفوظ رکھتے تھے۔ حیات شبلی پر ایک ناقدانہ تقریر بمبئی کے اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام توسیعی لکچرز کے سلسلے میں کی تھی، جس کو ۵۰ء میں جب ــــ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے نوائے ادب کا اجرا ہوا تو میری درخواست پر اُسے قلم بند کر دیا۔ اس زمانے میں ڈار صاحب نے کئی دوسرے مضامین بھی لکھے جن میں سے مغلوں سے قبل فارسی ادب اور انڈو پرشین لٹریچر قابل ذکر ہیں اول الذکر ۴۲ء میں رسالہ اردو میں شایع ہو چکا ہے۔ اور موخر الذکر بھنڈارکر انسٹی ٹیوٹ پونا کی استدعا پر "WORLD LETERATURE VOLUME" کے لئے ۴۵ء میں لکھا گیا تھا۔

ڈار صاحب کو بمبئی کی علمی فضا راس آ گئی تھی۔ یہاں تصنیف و تالیف کے لئے ماحول سازگار تھا۔ ان کی ذہنی کاوشوں کے قدردان بھی اس جگہ موجود تھے۔ مگر ۴۶ء میں انھیں پھر گجرات کالج احمد آباد بھیجا گیا۔ بمبئی کو چھوڑنے کی وجہ سے انھیں روحانی کوفت ہوئی، یہ تبادلہ باعث زحمت تھا۔ جنگ کا زمانہ تھا۔ رہائشی مکانوں کی قلت، گرانی کی گرم بازاری، چھ سات بچوں کی پڑھائی کا سوال اور سب سے اہم بات بیوی بچوں سے جدائی۔ غرض تمام فکروں اور پریشانیوں کے ہجوم کے ساتھ ۲۰ جون کو احمد آباد پہنچ گئے۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ جب احمد آباد سے آنا نہیں چاہتے تھے، اس وقت زبردستی وہاں سے بمبئی بھیجے

گئے، اور اب کی بار مجبوراً بمبئی سے احمد آباد جانا پڑا۔

ڈار صاحب سے میری ملاقات اسی زمانے میں ہوئی۔ اگرچہ ان کے علم وفضل سے ناواقف نہیں تھا۔ ان کے حسن اخلاق کے متعلق احمد آبادی احباب سے بہت کچھ سن چکا تھا، لیکن بالمشافہ ملاقات کا پہلا موقع تھا۔ انھیں قریب سے دیکھنے اور اُن کے علم وفضل سے مستفید ہونے کا موقع میسر آیا۔ میں احمد آباد میں سید مصطفےٰ احسن صاحب قادری کے بنگلے کے (دیوان کا بنگلہ) ایک حصہ میں رہتا تھا۔ قادری صاحب ڈار صاحب کے قدردان دوستوں میں سے تھے۔ ڈار صاحب بھی ۲۰ر جون کو احمد آباد پہنچ کر پہلے ان ہی کے ہاں فروکش ہوئے، اور قریب ایک سال اسی جگہ گذارنا پڑا۔ ہم دونوں میں کچھ دن تو مغائرت رہی لیکن رات دن ساتھ اُٹھنے بیٹھنے کا اتفاق ہوا۔ ایک دوسرے کے مزاج سے واقف ہوتے گئے۔ اور بہت جلد اجنبیت وغیریت کے پردے درمیان سے اٹھ گئے۔ اور یک جہتی اس حد تک بڑھ گئی کہ ایک روح دو قالب ہوگئے۔ ڈار صاحب سے میری وابستگی کئی حیثیت سے رہی، چہار سالہ دوستانہ تعلقات چہل سالہ قدیم معلوم ہوتے تھے۔ اور چار سال میں میں نے ڈار صاحب سے جو کچھ حاصل کیا وہ دس سال میں بھی نہ کر سکتا تھا۔ یہ میرے استاد اور محسن تھے۔ عمر میں، علم وفضل میں، تجربے میں یہ مجھ سے بہت بڑے تھے۔ لیکن مجھے ان کا ایک بے تکلف بلکہ گستاخ دوست ہونے کا فخر حاصل ہے۔ ان کی مہربانیوں اور غمگساریوں کو بیان کرنے کے لئے ایک الگ مضمون درکار ہے۔ ایک آدھ مثال کے ساتھ اتنا کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ میری محرومیوں کا وہی بدنصیب اندازہ کر سکتا ہے جسے کسی مخلص دوست نے داغ مفارقت دیا ہے۔ فلک کج رفتار نے اس مشفق و مہربان دوست کو مجھ سے بہت جلد علیحدہ کر دیا۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد

ایک ملاقات میں برسبیل تذکرہ کہیں مجھ سے یہ سن لیا کہ میں فارسی عربی کی دو ایک کتابیں پڑھنا چاہتا ہوں۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ ۴۷ء کے سیاسی خلفشار کی وجہ سے سکون کہاں نصیب تھا کہ ڈھنگ کا کوئی کام ہوتا۔ میں تو حقیقت میں بھول چکا

تھا، مگر ڈار صاحب نہیں بھولے تھے۔ ایک روز ایک کتاب لے کر گھر پر آ دھمکے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد برسرِ مطلب آ گئے۔ اور مجھ سے کہا کہ اس کتاب میں چند مشکل مقامات ہیں۔ وہ میں سمجھا دوں گا۔ میں نے جواب دیا "بہتر ہے میں ہفتہ میں دو تین روز آپ کے گھر آ کر پڑھ لیا کروں گا۔" (اس وقت انھیں کرایہ پر مکان مل چکا تھا، جو میری قیام گاہ سے تین میل کے فاصلہ پر تھا)، فرمایا "نہیں جناب! میں یہیں آ کر پڑھا دیا کروں گا۔" اس بات پر دیر تک حجت ہوتی رہی لیکن وہ میری ایک نہ مانے۔ ہفتہ میں دو روز آتے اور مجھے چند مقامات بتا دیتے۔

دوستی کے معاملے میں بہت مخلص تھے، لیکن اتنے ہی سخت بھی تھے۔ اس امر میں یہ چند اصولوں کے سختی سے پابند تھے۔ اور اپنے دوستوں سے بھی ایسی ہی توقع رکھتے تھے۔ دوستی میں مفت کرم داشتن کو یہ گناہ کبیرہ تصور کرتے تھے۔ مولانا مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی ڈار صاحب کے دوستوں میں خصوصیت رکھتے ہیں۔ مولانا کو اُن سے عشق تھا۔ پندرہ روز میں ایک دن ڈار صاحب کے گھر آتے اور یہ کہتے ہوئے زینہ چڑھتے "بلا کشانِ محبت بہ کوئے ڈار روند" بعض اوقات کسی مسئلہ پر سخت اختلاف رائے ہوتا۔ لیکن دونوں عالم دوست وضع داری کے اتنے پابند تھے کہ صحبت کے ختم ہوتے ہی اختلافات بھی دفن کر دیتے۔

ڈار صاحب کے لئے قیام احمد آباد کا دور بہت ہی صبر آزما تھا۔ اگرچہ احمد آباد اُن کے لئے وطنِ ثانی کا حکم رکھتا تھا۔ قادری صاحب کا بنگلہ ان کے اپنے گھر کے مانند تھا۔ احباب کا اجتماع تنہائی محسوس نہیں ہونے دیتا تھا۔ بایں ہمہ اہل و عیال سے دوری ان کے لئے سوہانِ روح تھی۔ قریب ۱۹۴۷ء میں مکان کا انتظام ہو گیا۔ اہل و عیال احمد آباد آ گئے مگر سیاسی خلفشار ان کے لئے روحانی کوفت کا باعث ہوا۔ ہر طرف سے وحشت ناک خبروں نے سکونِ قلب غارت کر دیا تھا۔ کئی بار ان کے اہل و عیال کو قادری صاحب کے بنگلے میں پناہ گزیں ہونا پڑا۔ دو ایک دفعہ تو یہ خود اپنا گھر چھوڑ کر بنگلے میں چلے آئے۔ لیکن دو ایک موقعوں کے بعد پھر اپنا مکان نہیں چھوڑا۔ جب انھیں خطرہ سے آگاہ کیا جاتا تو کہتے "ایسے جینے سے عزت کے ساتھ مر جانا بہتر ہے۔"

اسی دوران میں ڈار صاحب کے خسر کا لاہور میں انتقال ہو گیا۔ گھر بھر کے لئے یہ باعث

رنج و غم تو تھا لیکن مزید براں فسادات کی آگ اتنی ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی کہ بیوی بچے لاہور تک کا سفر کر سکتے۔ ان حالات میں صرف کالج کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اس کے علاوہ لکھنے لکھانے کا کوئی کام نہ کر سکے۔ ان پریشانیوں کے باوجود وضع داری اور معمول میں کبھی فرق نہ آنے دیا۔ ڈار صاحب کے خسر کے انتقال کو پندرہ روز بھی نہ ہوئے ہوں گے کہ کالج کے عربی شعبہ کے ایک پروفیسر جناب بہاوالدین صاحب دادر کرکسی سلسلہ میں افریقہ جا رہے تھے۔ ڈار صاحب نے انھیں رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ میں نے ہر چند سمجھایا کہ ان حالات میں اس کا کوئی موقع نہیں ہے۔ ڈار صاحب کہنے لگے "میں خود جانتا ہوں کہ یہ دعوت بے موقع ہے۔ مگر دادر کر صاحب یہ خیال کریں گے کہ چونکہ وہ میرے ماتحت پروفیسر ہیں اس لیے انھیں میں نے نظر انداز کر دیا" ڈار صاحب میں ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے ماتحتوں اور چھوٹوں کو کبھی اپنے سے چھوٹے ہونے کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے، اپنے شاگردوں کو ہمیشہ دوست کہتے اور ان کی عزت کرتے۔

۱۹۴۸ء جون میں ڈار صاحب دوبارہ اسماعیل کالج آگئے۔ جہاں تک علمی و ادبی مشاغل کا تعلق ہے ان کی زندگی کا یہ دور بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس دور میں انھوں نے غیر معمولی مستعدی اور انہماک کا ثبوت دیا۔ یہ ان کی علمی زندگی کا شباب تھا۔ اس وقت ان کے مطالعے اور تجربے کا پیمانہ چھلک رہا تھا۔ اس انہماک کے کئی اسباب تھے۔ جن میں ایک سبب ان کے ایک دوست اور شریک کار ڈاکٹر ترمذی مرحوم بھی تھے۔ ان کی تحریک پر ڈار صاحب نے کئی مضامین لکھے۔ حیات شبلی پر ایک نظر، ریاض الانشاء پر تنقید و تبصرہ فریدالدین عطار، خواجہ معین الدین کے دیوان سے متعلق نئی تحقیقات، الغزالی اور تعلیمی مسائل، بوعلی سینا، گجری، اقبال اور حب وطن، اور اقبال اور عربی شعراء اسی آخری دور کی یادگار ہیں۔ ان مضامین کے علاوہ شبلی اور ان کے نکتہ چیں، قاطع برہان، دساتیر وغیرہ ایسے موضوع تھے جو ان کے ذہن میں چکر لگا رہے تھے۔ ان مضامین کی داغ بیل بھی ڈال چکے تھے، اقبال بھی ان کے پیش نظر تھے، افسوس کہ ان کے اشہب قلم کی رفتار سے ان کے رخش عمر کی رفتار زیادہ تیز نکلی۔

اس زمانے میں اگرچہ کئی مضمون لکھنے میں مصروف رہے تاہم نہ کالج کے فرائض انجام دینے میں کوتاہی کی نہ طلبہ کی علمی اعانت سے کبھی گریز کیا۔ استاد کی حیثیت سے ڈار صاحب ایک بے مثل شخص تھے، شاگردوں کا گھر پر ہجوم رہتا۔ چھوٹی جماعت سے لے کر پی، ایچ، ڈی تک کے طلباء استفادے کی غرض سے آجاتے۔ لیکن کسی وقت بھی نہ اپنی مصروفیات کا ذکر کرتے نہ کسی قسم کے صلے کی تمنا کرتے اور نہ ہی اپنا احسان جتاتے، علمی، ادبی امداد سے انکار ان کے نزدیک بہت بڑا گناہ تھا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ انھیں کسی چیز کا علم نہ ہوتا۔ مگر یہ معلومات بہم پہونچانے کے لئے کبھی پہلوتہی نہ کرتے۔ دو چار روز کی مہلت مانگ کر سب سے پہلے مطلوبہ اطلاع حاصل کرتے، اور طالب تک پہونچا دیتے علمی معاملات میں ان کی ایمانداری کا یہ عالم تھا کہ کالج میں دوشنبہ کو ایم اے اسلامک کلچر کے دو گھنٹے لیتے تھے، جس کی تیاری کے لئے سنیچر اور اتوار کا دن مخصوص کر دیا تھا۔ بڑی چھان بین کے بعد اپنے لکچرز ترتیب دیتے۔ خود کہتے تھے کہ ڈیڑھ گھنٹہ کے کام کے لئے میرا ڈیڑھ دو دن جاتا ہے۔

اسی طرح یہ اپنی ذات اور اپنے اثر رسوخ سے مستحق لوگوں کو فائدہ پہنچانا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ بے شمار غریب اور مستحق طلباء نے ان کے اس جذبۂ ہمدردی سے فائدہ اٹھایا ہے۔ بعض لوگوں نے تو اعلیٰ عہدیداروں سے بھی ان کے ذریعے اپنے کام نکلوائے ہیں۔ مگر جو کچھ جائز طریقے پر ہوسکتا وہی کرتے۔ اپنے اثر و رسوخ سے کبھی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ ان کاموں میں انھیں تکلیف بھی اٹھانا پڑتی۔ لیکن بامروت ایسے تھے کہ کبھی انکار نہ کرتے۔

فطرتاً مزاج میں نرمی اور ملائمت تھی۔ درگذر ان کا بڑا وصف تھا۔ لیکن علمی مباحث میں نرمی کے قائل نہ تھے۔ ۱۹۵۱ء میں حکومت ہند کی طرف سے دہلی میں کل ایشیا تمدنی کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ ہندوستان کے ایک نمائندے کی حیثیت سے ڈار صاحب بھی اس میں مدعو تھے۔ اس موقع پر مولانا ابوالکلام آزاد سے کسی ایک ملاقات میں کوئی علمی بحث چھڑ گئی۔ ڈار صاحب نے اس موقع پر ایک تحقیقی نکتے پر اختلاف کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کیا۔ اسی طرح اپنے سیاسی خیالات و عقیدوں میں یہ بہت سخت تھے۔ سیاسی امور کا مطالعہ ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ یہ ابتدا سے نیشنلسٹ گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔

ڈار صاحب کی مالی حالت اچھی نہیں تھی۔ قلیل تنخواہ میں نو بچوں کی پرورش و پرداخت اور تعلیم کا خرچ برداشت کرنا ان کے لئے آزمائش کی انتہا تھی۔ لیکن مزاج میں قناعت کا وصف تھا۔ بہت صبر و برداشت سے کام لیتے۔ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا تو کیا اپنی تنگ دستی کا ذکر بھی خودداری کے خلاف سمجھتے تھے۔ ان حالات میں بھی وضع داری کے اتنے پابند تھے کہ بمبئی اور احمد آباد میں ان کی مسافر نوازی اور سیر چشمی مشہور ہے۔ ۱۹۵۱ء میں قاضی عبدالودود صاحب ایک دو ماہ کے لئے بمبئی تشریف لائے تھے، اس وقت ڈار صاحب علالت کی وجہ سے صاحب فراش تھے۔ قاضی صاحب ان کی عیادت کے لئے گئے۔ قاضی صاحب سے یہ پہلی ملاقات تھی، باوجود اپنی علالت کے ڈار صاحب نے قاضی صاحب سے دوپہر کے کھانے کے لئے اصرار کیا قاضی صاحب نے محض دلجوئی کے خیال سے منظور کر لیا۔ اور ان کے سامنے تھوڑا بہت خاطراً کھا لیا۔

۱۹۵۲ء میں ڈار صاحب کو حکومت کشمیر میں ہسٹاریکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے جانے کا موقع مل رہا تھا لیکن درس و تدریس سے انھیں ایسا عشق تھا کہ کسی قیمت پر اُسے چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔

اکتوبر ۱۹۵۳ء میں اہل احمد آباد نے ایک ضعیف العمر صوفی منش شاعر حضرت کلیم کی جبلی منانے کا فیصلہ کیا۔ بمبئی سے ندوی صاحب، ڈار صاحب اور میں مقالے پڑھنے کے لئے یاد کئے گئے تھے۔ ندوی صاحب اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے جلسہ کی صدارت کے فرائض انجام دے کر فوراً لوٹ آئے۔ لیکن احباب کے اصرار پر ہمیں کچھ دنوں کے لئے رکنا پڑا۔ اس موقع پر اہل احمد آباد نے ڈار صاحب سے جس عقیدت کا اظہار کیا وہ بیان سے باہر ہے۔ خاطر تواضع میں لوگ بچھے جاتے تھے۔ یہ ان کے حسن اخلاق اور ملنساری کا نتیجہ تھا۔ آٹھ دس روز تک صبح سے رات کے ایک بجے تک وقت کچھ اس طرح گذرتا تھا گویا ہر روز روز عید اور ہر شب شب برات تھی۔ ڈار صاحب بڑے نازک مزاج تھے، لیکن خیال خاطر احباب کی وجہ سے خواب و خورش میں بے احتیاطی کا خیال نہ کیا۔ یہی بے احتیاطی مہلک مرض کے ظہور کا بہانہ ہوئی۔

۲۰ر اکتوبر کو ہم احمد آباد سے لوٹے۔ نقاہت و بے خوابی کی وجہ سے ڈار صاحب کی طبیعت مضمحل رہنے لگی۔ خیال تھا کہ ایک آدھ ہفتے میں یہ کسل دور ہو جائے گی لیکن طبیعت سنبھلنے کے بجائے بیٹھتی ہی گئی۔ ۲۰ر نومبر کو اسپتال لے جایا گیا۔ جہاں ڈاکٹروں کی تشخیص سے معلوم ہوا کہ گردے بیکار ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹروں اور طبیبوں نے اپنی کوششوں میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا لیکن مرض لاعلاج تھا۔ کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ اس موقع پر ڈار صاحب کے احباب و تلامذہ نے جو تیمارداری اور خدمت کی اسکو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اُن کے حسن سلوک اور شفقت و مہربانی کا نتیجہ تھا۔ آخر کار چھ ماہ کی شدید علالت کے بعد ۷ ارمئی کو صبح گیارہ بجے اس پیکر علم و عمل نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

ڈار صاحب اُن مخصوص لوگوں میں سے تھے جنھیں دنیا میں اکتساب علم کے علاوہ اور کوئی شوق نہیں ہوتا ہے۔ قدرت نے انھیں وہ تمام صلاحیتیں عطا کی تھیں جو ایک محقق، نقاد، اور قابل استاد ہونے کے لئے ضروری ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کم و بیش ۲۵-۳۰ مضامین لکھے جن میں سے ہر ایک وسیع مطالعہ اور عمق نظر کا نتیجہ ہے۔ ڈار صاحب کو اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں کے ادب سے شغف تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ تاریخ و اسلامک کلچر بھی ان کے مرغوب مضامین رہے ہیں۔

پیش نظر انتخاب میں صرف گیارہ مضمون شامل کئے گئے ہیں جو تحقیق و تنقید سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک مضمون کسی نہ کسی رسالے میں چھپ چکا ہے۔ تحقیق و تنقید کے میدان میں ڈار صاحب نے اپنے استاد حافظ محمود شیرانی کے نقش قدم پر چلنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ایک محقق و نقاد کی حیثیت سے ڈار صاحب کی کامیابی کا راز اس میں مضمر ہے کہ انھوں نے اپنے موضوع پر حاوی ہوئے بغیر کبھی نہ قلم اٹھایا نہ زبان کھولی۔ جب انھیں تلاش و تحقیق سے کلی اطمینان ہو جاتا تب ہی اظہار خیال کرتے اور وہ بھی اتنے اعتماد کے ساتھ کہ پھر کسی قیمت پر اپنی رائے بدلنے پر تیار نہ ہوتے۔

اُن کے تنقیدی مضامین میں بعض جگہ غم و غصہ اور طنز کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ لیکن ایسے موقعوں پر ڈار صاحب نے کبھی ادب کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ایسے مقامات پر اکثر ان کا قلم رک جاتا اور موزوں الفاظ کی تلاش میں گھنٹوں غور کرتے رہتے۔ ڈار صاحب کے طرز تحریر میں سنجیدگی و متانت پائی جاتی ہے۔ انھیں زبان پر قدرت حاصل تھی۔ پیچیدہ مسائل اور مشکل نکات کو بھی اتنی صاف ستھری زبان میں

پیش کیا ہے کہ مصنف کے مافی الضمیر سے واقف ہونے میں قاری کو ذرا دقت پیش نہیں آتی۔ غرض مرحوم کے مضامین شوقِ تلاش و جستجو، وسعت مطالعہ اور انتقادی صلاحیتوں کے ایسے نمونے ہیں جو اس وادی کے رہروں کے لئے مشعل راہ کا کام دیں گے۔

اس موقع پر "لیٹ پروفیسر ڈار پبلیکیشن کمیٹی" کا ذکر ضروری ہے۔ ڈار صاحب کے انتقال کے بعد بمبئی میں مختلف علمی، ادبی، تعلیمی اداروں اور احباب و تلامذہ کی طرف سے بتاریخ ۲، جون ۵۳ء ایک عام تعزیتی جلسہ منعقد کیا گیا تھا۔ اس جلسہ میں مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرنے کے بعد یہ تجویز ہوئی کہ ڈار صاحب کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مضامین کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ اور اس کی فروخت سے جو رقم وصول ہو وہ ان کے پسماندگان کو دیدی جائے۔ اس کام کی انجام دہی کیلئے جلسہ میں جناب پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی، مولانا میر محمد شہاب مالیر کوٹلوی، سید شہاب الدین صاحب دسنوی، سید جمال الدین صاحب قادری ادکیل، ڈاکٹر احمد جوناس، پروفیسر عالی جعفری۔ پروفیسر اکبر علی ترمذی۔ ضیاء الدین صاحب دیسائی سید ظہیر الدین صاحب قادری اور سید ظہیر الدین مدنی پر مشتمل کمیٹی بنائی گئی۔ مضامین کی طباعت و اشاعت کے لئے تخمیناً دو ہزار روپے کی رقم کی ضرورت تھی۔ لیکن ان کے چند دوستوں اور شاگردوں نے اپنی طرف سے پہلے ہی رقم مذکور مہیا کر دی تھی۔

پیش نظر انتخاب کے علاوہ ڈار صاحب کے ابھی کئی ایسے مضامین موجود ہیں جن کی اشاعت سے ارباب ذوق ضرور خوش ہوں گے اور اسلامک کلچر کے طلبا کو ان سے خاص طور پر فائدہ پہنچے گا۔ اگر خاطر خواہ مالی امداد حاصل ہوگی تو بقیہ مضامین کو بھی منظر عام پر لانے کی کوشش کی جائے گی۔

سید ظہیر الدین مدنی
صدر شعبۂ اردو
اسمٰعیل یوسف کالج جوگیشوری بمبئی

جہاں آرا بیگم کی ایک غیر معروف تصنیف صاحبیہ

جہاں آرا بیگم کا شمار ان تیموری بیگمات میں سے ہی جنھوں نے علم و فن کی سرپرستی و قدردانی میں امتیاز حاصل کیا ہی۔ اس کی گوناگوں خوبیوں کا ذکر "بادشاہ نامہ" اور "عمل صالح" کے صفحات پر جا بجا موجود ہی۔ وہ ان خوش نصیب مغل شاہزادیوں میں سے ہے جنھیں صاحبِ تصنیف کہا جا سکتا ہے۔ بچپن سے ہی اس کا طبعی میلان اولیائے کرام اور صوفیائے عظام کے مقدس گروہ کی طرف تھا۔ اور اسی میلان نے آہستہ آہستہ اس کے بھائی دارا شکوہ کے اثر سے ایک غیر فانی شوق کی صورت اختیار کر لی تھی یہی فطری ذوق اس بات کا محرک ہوا کہ جہاں آرا نے بزرگان دین کے سوانح و حالات کو اپنی تصنیفات کے لئے منتخب کیا۔ اس کی سب سے زیادہ مشہور تصنیف مونس الارواح ہے جس میں اس نے حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمتہ اللہ علیہ کے سوانح حیات لکھے ہیں۔ لیکن آج میں اس کی ایک دوسری تصنیف کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو ابھی تک گوشۂ گمنامی میں پڑی ہوئی ہے اور جسے بیگم نے مونس الارواح کی تالیف سے دو سال پہلے لکھا تھا۔

جہاں آرا کی اس گمنام تالیف کا نام صاحبیہ ہے۔ اس مختصر رسالے میں جس کے کل اُنیس اوراق ہیں۔ اس نے اپنے پیر و مرشد ملّا شاہ بدخشی کے حالات قلم بند کئے ہیں اس رسالے کا ایک قلمی نسخہ احمد آباد کے ایک کتاب خانہ میں موجود ہے۔ اس کتاب خانہ کا نام آپا راؤ بھولا ناتھ لائبریری ہے۔ اور اس کی بنیاد ۱۸۷۰ء میں رکھی گئی تھی۔ آپا راؤ کے دادا سارا بھائی مہتہ نے مرہٹہ گردی کا پُر آشوب زمانہ دیکھا تھا۔ اس کے فارسی خطوط کا ایک مجموعہ دو جلدوں میں معدن الانشاء

۱۔ اصل نسخہ دستخطی بیگم صاحبہ لکھنؤ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

کے نام سے اسی کتاب خانہ میں محفوظ ہے۔ اس کی ایک دوسری کتاب کا نام تاریخ مرہٹہ در گجرات ہے۔ سارا بھائی کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا تاریخ مظفر شاہی کا نادر نسخہ بھی اسی کتاب خانہ میں موجود ہے۔

بیگم نے رسالے کے شروع اور آخر میں نہایت صراحت کے ساتھ اس کا نام "صاحبیہ" لکھا ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ غالباً یہ ہو سکتی ہے کہ یہ شہزادی بیگم صاحب[1] کے لقب سے مشہور تھی۔

اس رسالے پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے جہاں آرا کے روحانی ذوق اور ذہنی کیفیت کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ اسے اولیائے کرام اور بالخصوص خواجہ اجمیریؒ سے حد درجہ عقیدت تھی۔ اس عقیدت کا صحیح اندازہ مونس الارواح کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے یہ خواجہ صاحب کی محبت اور عقیدت کا ہی نتیجہ تھا کہ بیگم کسی چشتی بزرگ کی مرید ہونا چاہتی تھی لیکن مشیت ایزدی کو یہ منظور نہ تھا۔ اور بیگم کو بحالت مجبوری قادری مشرب میں شریک ہونا پڑا جس میں اس کا بھائی دارا شکوہ پہلے سے داخل تھا۔ ملّا شاہ کی مرید ہونے سے پہلے بھی جہاں آرا کا یہ حال تھا کہ جہاں کہیں اسے کسی بزرگ کی موجودگی کا علم ہوتا فوراً وہاں پہنچتی، اور نذر نیاز پیش کرتی۔ چنانچہ اس رسالے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے بھائی دارا شکوہ کے کہنے پر شہر گجرات (پنجاب) کے مشہور بزرگ شیخ دولہ کی خدمت میں نیاز بھیجی اور ان سے فیض چاہا۔ اسی طرح اس نے حاجی عبداللہ صاحب سے بھی فیض کی درخواست کی جو تال جلال گکھر کے حوالی میں رہتے تھے۔

اس رسالے میں جہاں آرا بیگم نے ملّا شاہ بدخشی کے اوصاف و محاسن پر پوری روشنی ڈالی ہے۔ یہاں تک کہ ان کے لباس اور خوراک تک کا بھی پورا حال لکھا ہے۔ اس نے اپنے مرید ہونے کا واقعہ بھی کسی قدر تفصیل سے درج کیا ہے۔

---

[1] عمل صالح جلد اول صفحہ ۸۰ مرتبہ یزدانی صاحب۔ اس کتاب میں جا بجا جہاں آرا کو بیگم صاحب کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔

یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ اگرچہ جہاں آرا کی اس تصنیف کا سُراغ کسی دوسری جگہ نہیں ملتا۔ لیکن میکڈونلڈ نے اپنی مشہور کتاب اسلام[۵۱] میں دینی زندگی اور مسلک "The religious life and attitude in Islam" میں فان کریمر کے حوالے سے ملا شاہ بدخشی کے ایک دوسرے مُرید توکل بیگ کے کسی رسالے کا ذکر کیا ہے۔ جس میں توکل بیگ نے اپنے مرید ہونے کا واقعہ بیان کیا ہے۔ اور ساتھ ہی ایک شہزادی فاطمہ نامی کے مُرید ہونے کی روداد بھی درج کی ہے۔ لیکن یہ روداد شہزادی کے اپنے الفاظ میں نقل کی گئی ہے فاطمہ کا لفظ میکڈونلڈ کے لئے ایک لاینحل معمّا بن کر رہ گیا ہے۔ لیکن پروفیسر قانون گو کا یہ قیاس درست معلوم ہوتا ہے کہ توکل بیگ نے جہاں آرا کو فاطمۃ الزمانی کے نام سے یاد کیا ہے۔ اور ان کے خیال کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ جہاں آرا کے یہی الفاظ بعینہٖ رسالہ "صاحبیہ" میں پائے جاتے ہیں قیاس کہتا ہے کہ توکل بیگ نے یہ عبارت جہاں آرا کے رسالے سے نقل کی ہے۔ میکڈونلڈ کی انگریزی عبارت اور جہاں آرا کے اصلی الفاظ میں ایک فرق بہت نُمایاں ہے اور وہ یہ کہ اس فقرہ "اے ملا شاہ چراغ تیموریہ را تو روشن کردی" کا ترجمہ میکڈونلڈ کے یہاں اس طرح ہے:۔

"O Molla Shah for what reason did you illumine that Timuria" (تم نے اس تیموری کو کیوں روشن کیا؟)

شاہجہاں کے متعلق اس کے عہد میں یا اس کے بعد جتنی بھی تاریخی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں دارا شکوہ اور جہاں آرا کے درمیان دلی محبّت و اتحاد کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن اس اجمال کی تفصیل جہاں آرا کے قلم سے دیکھنے کے قابل ہے۔ وہ اپنے بھائی کو "عارف کامل"۔ "نورعین" و "عین نور" اور "مملکت باطن

---

[۵۱] کتاب مذکور صفحہ ۱۹۵ سے ۲۰۵ تک۔ [۵۲] اسلام میں دینی زندگی اور مسلک صفحہ ۲۰۴۔

وظاہر" کا ولی عہد کہہ کر یاد کرتی ہے۔ جب داراشکوہ قندھار کی مہم کے لئے روانہ کابل ہوتا ہے۔ تو یہ عارضی جدائی دونوں پر بہت شاق گذرتی ہی۔ اور جب کچھ مدت بعد جہاں آرا بھائی سے کابل میں جا ملتی ہی تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ شروع شروع میں داراشکوہ ہی اس کا مرشد و رہبر تھا۔ اور بیگم نہایت واضح الفاظ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہی۔ بیگم کا مندرجۂ ذیل فقرہ ان کے انتہائی اتحاد و یگانگی کا آئینہ دار ہی" ما ہر دو یک روحیم کہ در دو قالب دمیدہ شدہ
و یک جانیم کہ در دو جسم آمدہ"۔

بیگم نے یہ رسالہ ۲۷ رمضان المبارک ۱۰۵۱ھ میں لکھا۔ عام طور پر خط نستعلیق ہی۔ لیکن کہیں کہیں شکستہ آمیز بھی ہی۔ ایک صفحہ پر کوئی سترہ سطریں ہوں گی۔ رسالہ کا اکثر حصہ کرم خوردہ ہی۔ کوئی تعجب نہیں۔ اگر یہ رسالہ بیگم کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہو۔ کتابت کی نمایاں غلطی ایک ہی ہی۔ اور مُوتُوا قبلَ اَنْ تَمُوتُوا کو اَنْتَ مُوتُوا کر کے لکھا گیا ہی۔ پہلے صفحے پر سر تحریر کے طور پر ھو الفرد لکھا ہی اور رسالہ کا آغاز یوں ہوتا ہی: "حمد و سپاس نا محدود مر خدائے را کہ بذات خویش احد و مطلق است"۔ رسالے کے آخر میں بیگم نے کچھ اشعار ملا شاہ کی تعریف میں لکھے ہیں۔ جن میں انھیں اپنا پیر و خدا۔ دین و پناہ اور شاہ والا کہہ کر یاد کرتی ہی۔ رسالے کا اختتام اس دعا پر ہوتا ہی کہ بیگم کے وجد و استغراق اور معرفت میں روز بروز اور ساعت بہ ساعت اضافہ ہوتا رہے۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد رسالہ "صاحبیہ" کے مطالب اختصار کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں:۔

مولانا شاہ کے اوصاف و کمالات حدِ شمار سے باہر ہیں۔ لیکن بیگم نے حصول سعادت کی خاطر یہ رسالہ لکھا ہی۔ اور اس نے اپنے حالات کتاب میں اس لئے درج کر دئے ہیں کہ اس کا نام اس کے پیر و مرشد کے نام کے بعد لکھا جائے اور ان کے نام کی برکت سے خدا اسے بخشش دے۔ اور ان

کے طالبوں اور عقیدت مندوں کے زمرے میں اُٹھائے۔

مولانا شاہ کا مولد و وطن موضع ارکسا ہی جو بلدۂ روستاق کا ایک گاؤں ہی اور روستاق مملکت بدخشاں کے توابع میں سے ہی چنانچہ مولانا شاہ خود فرماتے ہیں۔

ملک من از ملکہا ملک بدخشاں آمدہ

از بلاد از روستاق و از قُرا از ارکسا

آپ کے والد کا نام مولانا عبدی بن مولانا سلطان علی بن حضرت قاضی فتح اللہ ہی۔ اور آپکے اسلاف میں سے ہر ایک قاضی کے لقب سے ملقب ہی۔ لیکن ان بزرگوں نے کبھی قضاوت کے فرائض سرانجام نہیں دئے۔ بلکہ ہمیشہ ان کا پیشہ رضا و تسلیم رہا ہے۔ آپ کی والدہ کا نام حضرت بی بی خاتون ہی وہ عارفۂ کاملہ اور رابعۂ دہر تھیں۔ اور اس دنیائے فانی سے رحلت فرما چکی ہیں مولانا شاہ کے دو بھائی ہیں۔ اور ایک بہن۔ بہن حضرت سے ایک سال چھوٹی ہیں۔ اور اپنے وطن ارکسا میں سکونت رکھتی ہیں۔ دو بھائی ملا ّ نیک محمدؐ اور ملا ّ سلطان علی ہیں۔ یہ دونوں معرفت الٰہی کے حصول کے لئے ہندوستان میں حضرت کی خدمت میں تشریف لائے اور آپ کے ارشاد کے مطابق اپنے وطن واپس چلے گئے۔

مولانا شاہ نے اپنا دیوان بلاغت نشان جس میں قصائد اور حقیقت سے بھری ہوئی غزلیں اور رُباعیاں ہیں، مجھے عنایت کیا ہی۔ دن رات اس کتاب کو میں اپنے ہاتھ میں اور اپنے پیش نظر رکھتی ہوں اور اس کو ورد زبان بناتی ہوں۔ میرا اعتقاد ہی کہ اس زمانے میں حضرت کی طرح کسی دوسرے نے توحید کو بیان نہیں کیا اور نہ کریگا۔ بیگم نے اپنے پیر کی کچھ رباعیاں اس رسالے میں نقل بھی کی ہیں۔

مولانا شاہ بچپن سے لے کر اکیس برس تک موضع ارکسا میں رہے اور آپ سے بہت سی کرامتیں ظاہر ہوئیں۔ اس کے بعد آپ علوم ظاہری کی تحصیل کیلئے بلخ تشریف لے گئے۔ آپنے ان علوم میں بہت جلد دسترس حاصل کرلی۔ لیکن

چونکہ حقیقت کا شوق آپ پر غالب تھا۔ آپ بلخ میں زیادہ نہ ٹھہر سکے اور وہاں سے ہندوستان فردوس نشان میں تشریف لائے اور سب سے پہلے کشمیر کو اپنے نور سے منوّر کیا۔ اُس وقت آپکی عُمر پچیس سال تھی۔ کشمیر میں تین سال تک آپ نے طالب علموں کی سی زندگی بسر کی۔ بعد ازاں شیخ کی تلاش میں کشمیر سے لاہور پر نور میں وارد ہوئے۔ اُس وقت لاہور حضرت میاںمیر صاحب کے وجود مسعود سے منوّر تھا۔ اور جب مولانا شاہ کو حضرت میاں جیو کا علم ہوا۔ تو آپ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ایک سال تک طلب و شوق کی آزمائش کے لئے میاںمیر صاحب نے مُلّا شاہ سے استغنا برتا۔ لیکن ملّا شاہ کمال عقیدت واخلاص سے میاںمیر صاحب کی خدمت میں حاضر رہے۔ جب میاںمیر صاحب کو یقین ہوگیا کہ ان کی طلب صادق ہے تو آپنے اپنی پوشیدہ دلی عنائت و مہربانی کو آشکارا کر دیا۔ اور انھیں اپنے حلقہ ارادت میں لے لیا۔ ملّا شاہ نے انیس برس میاںمیر صاحب کی خدمت میں اس طرح گذارے کہ سردی کے زمانے میں لاہور میں رہتے تھے۔ اور موسم گرما میں اپنے پیر کی اجازت سے کشمیر تشریف لے جاتے تھے۔ اور کشمیر میں گرمی کا زمانہ بسر کرنے کی وجہ یہ تھی کہ آپ کا مزاج بہت گرم تھا۔ اس زمانے میں آپنے بہت ریاضتیں کی ہیں۔ اور آپ کی ریاضت شاقّہ کی ایک مثال یہ ہے کہ ان اُنیس برسوں میں اور اس مدّت سے چند سال پیشتر اور میاںمیر صاحب کی وفات کے بعد پانچ سال تک آپنے پہلو زمین پر نہیں لگایا۔ اب اگرچہ پہلو زمین پر لگاتے ہیں۔ لیکن خواب کا نام نشان نہیں۔ دُنیا کی فانی لذّتوں سے آپنے منہ موڑ رکھا ہے۔ غیریت کے تمام پردے دُور ہو چکے ہیں۔ اور آپ مطلب اعلیٰ اور مقصد اقصیٰ کو پہنچ چکے ہیں۔

حضرت اپنے مریدوں کو ریاضات شاقّہ اور ترک و تجرید کی تلقین نہیں کرتے۔ آپ زیادہ زور اس بات پر دیتے ہیں کہ ماسوا سے دلی ترک و تجرید ضروری ہے۔ ہاں شب بیداری کے لئے اپنے مریدوں کو کچھ تاکید ضرور کرتے ہیں آپ اپنے عقیدتمندوں اور اخلاص کیشوں کے علاوہ کسی دوسرے سے صحبت نہیں

رکھتے۔ اور آپ کی محفل میں ہر وقت معرفت و حقیقت کے چرچے رہتے ہیں۔ خدائے تعالیٰ نے آپ کی صحبت اور زبان میں بہت تاثیر دے رکھی ہے۔ اکثر شیعہ حضرات آپ کی گفتگو سن کر اہل سُنّت کے حلقے میں آ گئے ہیں۔ اور کئی غیر مسلم حلقہ بگوش اسلام ہو گئے ہیں۔ آپ کی بدولت آپ کے ارادت کیش حضرت سرورِ دو عالم صلعم کی مجلس میں شریک ہوتے ہیں۔ بعض مُریدوں کو آپ کے فیض باطنی سے پہلے روز ہی کشف ہو جاتا ہے۔

آپ اپنی زبان مبارک سے فرماتے ہیں کہ میری نماز کبھی قضا نہیں ہوئی۔ اور نہ ہی میں کبھی ایسے عارضے میں مبتلا ہوا ہوں کہ میری نماز فوت ہوگئی ہو۔ میں نے ہمیشہ وقت پر نماز ادا کی ہے۔ آپ نماز باجماعت کے بہت حامی ہیں۔ اور جب تک مُلّا محمد سعید جو آپ کے خاص مُریدوں میں سے ہیں۔ حاضر ہوں۔ آپ کسی دوسرے کو امامت کیلئے حکم نہیں دیتے۔ اگر کبھی ملّا محمد سعید موجود نہ ہوں تو آپ خود امامت کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ آپ ایک سالک کیلئے شریعت اور طریقت دونو کو ضروری قرار دیتے ہیں آپ اہل دُنیا بالخصوص سلاطین و امرا سے نذر نیاز قبول نہیں کرتے۔ ہاں اپنے مُریدوں سے معمولی نیاز مثلاً ایک دو روپئے قبول فرما لیتے ہیں۔ اور اس رقم کو غربا و مساکین پر صرف کر دیتے ہیں۔ آپ کی خدمت میں ایک یا دو خادم رہتے ہیں۔ آپ پر اکثر تجرید و تفرید کا غلبہ رہتا ہے۔

آپ اکثر دو زانو اور کبھی چہار زانو اور کبھی تکیہ لگا کر بیٹھتے ہیں۔ اور کبھی پاؤں لمبے کر کے اور کبھی چاندنی میں اور کبھی تاریکی میں۔ دُنیاداروں کی صحبت سے اجتناب فرماتے ہیں۔ جب کوئی آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے تو آپ کا معمول یہ ہے کہ اس سے اس کا نام اور محل سکونت دریافت فرماتے ہیں۔

آپ خوش وقت، شگفتہ، خنداں اور متبسم رہتے ہیں۔ کبھی کبھی قہقہہ بھی فرماتے ہیں اور کبھی حضرت رسول مقبول صلعم کی سنّت کے اتباع میں اپنے مخلصوں سے مزاح بھی کرتے ہیں لیکن یہ ہنسی کھیل بھی عین معرفت و توحید

ہوتی ہی آپ کے چہرے پر کسالت و کاہلی کا نشان کبھی نہیں ہوتا۔

آپ کے وضو کرنے کا طریقہ یہ ہی کہ اکثر اپنے ہاتھ سے پانی ڈالتے ہیں۔ اور وضو کرتے ہیں۔ بہت کم ایسا ہوتا ہی کہ خادم آپکے ہاتھوں پر پانی ڈالے۔

آپ خرقہ نہیں پہنتے۔ بلکہ چادر پہنتے ہیں۔ اور ولایتیوں کی طرح گول پگڑی باندھتے ہیں۔ اور ہمیشہ آپ کی پگڑی سفید ہوتی ہی۔ رنگین پگڑی آپ کو پسند نہیں پگڑی کے نیچے طاق ہوتا ہی۔ اور کبھی گرمی زیادہ سخت ہو تو سر پر خالی طاق رکھتے ہیں اور کبھی طاق کے اوپر سر پیچ بھی لپیٹ لیتے ہیں۔

آپکے قیام گاہ پر کچھ پکایا نہیں جاتا۔ جو کچھ مرید لاتے ہیں۔ آپ تناول فرمالیتے ہیں کبھی دن میں ایک وقت اور کبھی دو وقت حسبِ قسم کا کھانا آئے کھا لیتے ہیں۔ اور اگر کچھ نہ ملے تو دو تین دن کھانے کے بغیر ہی گذر جاتے ہیں۔ چونکہ آپ کی طبیعت گرم ہی۔ اس لیئے اکثر ٹھنڈی چیزیں آپ کو مرغوب خاطر ہیں۔

چونکہ کشمیر کے سرسبز و شاداب اطراف و جوانب دل پذیری اور دل کشی میں آپ اپنا جواب ہیں۔ اس لئے مولانا شاہ صنعت ایزدی کے شاہکار دیکھنے کیلئے کبھی کبھی دیہات کی طرف چل نکلتے ہیں۔ آپ کبھی گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں۔ اور کبھی بے تکلفانہ پیدل سیر کرتے ہیں۔ چونکہ کشمیر کی سواری کشتی ہی۔ اس لئے کبھی کشتی میں بھی سوار ہو جاتے ہیں۔

آپکے خوارق و کرامات بے شمار ہیں۔ اگر کوئی ان کو لکھنے بیٹھے تو ایک کتاب بن جائے چونکہ آپ کو ہرگز یہ بات پسند نہیں کہ آپ کی کرامتیں ظاہر ہوں۔ اس لئے ان کے لکھنے سے منع فرماتے ہیں۔ آپ کی سب سے بڑی کرامت یہ ہی کہ جو کچھ طالب کے دل میں ہو اسے فقط ایک ہی نظر میں ظاہر کر دیتے ہیں آپ مردہ دلوں کو زندہ کرتے ہیں۔ اگرچہ خدا نے آپ کو یہ قدرت بھی دی ہی کہ آپ حضرت مسیح علیہ السلام کی طرح ظاہری مُردہ کو بھی زندہ کر دکھائیں لیکن آپ کی توجہ ان کرامتوں کی طرف بہت کم ہی۔ آپ ہمیشہ کوشش کرتے ہیں کہ

آپ کی کرامتیں لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رہیں۔

تیس سال سے آپ کشمیر میں سکونت پذیر ہیں۔ اور یہ رُباعی آپ نے کشمیر کے بارے میں لکھی ہے۔

افتاد بگوشہ عِلم عالمگیرم | زان گوشہ بکشمیر بود تعبیرم
شمعے بدرون کوزۂ روشن شد | ماہی بدرون چاہ شد دلگیرم

مُرید! اگرچہ ایک دُنیا آپ سے فیض یاب ہے اور آپ کے عقیدتمند بے شمار ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ ممتاز مرید ملا محمد سعید ہیں۔ جن کا وطن رستاقِ بدخشاں ہے اور جن کو حضرت سے ظاہری اور باطنی دونوں نسبتیں ہیں ان کا مکان حضرت کے مکان کے متصل ہے۔ حضرت ان کے بچّوں سے اپنے بچّوں کی طرح پیار کرتے ہیں ایک دوسرے مُرید مُلّا مسکین بھی بدخشاں سے تعلق رکھتے ہیں اکثر مُرید جو طریقہ سلوک کی تلقین کیلئے آتے ہیں پہلے ملّا محمد سعید اور ملّا مسکین سے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ملّا مسکین کا اصلی پیشہ سپاہگری تھا۔ آپ نے سپاہگری ترک کرکے دس سال تک حق کی جستجو کی۔ چند مرتبہ مُرید بننے کے خیال سے حضرت میانمیر صاحب کی خدمت میں حاضر بھی ہوئے لیکن حضرت نے اِنکار کر دیا۔ مُلّا شاہ کے پاس بھی پہلے کئی بار آئے۔ لیکن آپ بھی رضامند نہ ہوئے۔ آخری مرتبہ آپنے انھیں اپنا مُرید بنالیا۔ اب مُلّا مسکین کامل و عارف ہیں اور انھوں نے کشمیر کو ہی اپنا وطن بنالیا ہے۔ ایک اور مُرید محمد حلیم نامی ہیں۔ ان کے باپ کا نام گل بیگ ہے۔ اُن پر مُلّا شاہ کی بہت مہربانی اور توجہ ہے۔ ان کے علاوہ مُلّا محمد امین کشمیری۔ مُلّا عبد النبی کشمیری اور ملّا حبیب اللہ ہیں۔ جو سب کے سب ظاہری اور باطنی علوم سے آراستہ ہیں۔ ملّا شاہ نے اس جماعت کی تعریف میں یہ رُباعی لکھی ہے:۔

اے تافتہ بر روئے تو نوری ز اللہ | زان نور بروے ہمہ بکشائی راہ
یارانِ تو اولیائے وقت اند ہمہ | نازم بتو شاہِ اولیاء مُلّا شاہ

ان کے علاوہ ملّا شاہ کے مُریدوں کی تعداد ان گنت ہے لیکن یہ مختصر رسالہ

ان کے ذکر کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اس لئے ان بزرگوں ہی کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

جہاں آرا کے اپنے حالات اگرچہ اپنے پیر و مرشد کے احوال کے ساتھ ساتھ اپنے حالات لکھنا ادب کے منافی ہے۔ لیکن چونکہ اوپر مریدوں کا ذکر آچکا ہے۔ اس لئے میں نے اپنے آپ کو بھی اس زمرے میں شامل کرلیا ہے۔

بیس سال کی عمر سے مجھے خواجگان چشت کے سلسلۂ عالیہ سے عقیدت و ارادت ہے اور خواجہ معین الحق والملّت والدین کا حلقۂ مریدی میرے گوش جان میں ہے۔ چند سال پیشتر میں حضرت کے روضۂ منورہ کی زیارت کرچکی ہوں۔ اور یہ عقیدت روز بروز بڑھ رہی ہے۔

خدائے تعالیٰ نے اپنے لطف و کرم سے میرے دل میں ذوق و طلب پیدا کیا ہے اور میرے بھائی نے جو عارف کامل ہیں۔ اس آتشِ شوق کو اور بھی تیز کردیا ہے۔ ۱۰۴۹ھ[۱] میں میں اپنے والد بزرگوار خلد اللہ ملکہٗ و سلطانہ کے ہمراہ لاہور پہنچی۔ مجھے اپنے کامگار بھائی سلطان محمد دارا شکوہ قادری سے انتہائی محبت اور صوری و معنوی اتحاد تھا اور ہے۔ ہم دونوں ایک روح ہیں جو دو قالبوں میں جلوہ گر ہے۔ اور ایک جان ہیں۔ جو دو جسموں میں جاری و ساری ہے۔ اسی سال والد بزرگوار نے بھائی کو کابل کی طرف روانہ کیا۔ اور تھوڑی مدت کیلئے ہم میں ظاہری جدائی واقع ہوئی۔ چونکہ ہمیں ایک دوسرے سے حد درجہ محبت تھی اس لئے ہم پر یہ عارضی جدائی بہت شاق گذری۔ وداع کے وقت مجھ پر گریہ و بے تابی کا ہجوم تھا اور بھائی پر زبردست رقت کا عالم طاری تھا۔ روانگی کے وقت بھائی نے مجھے نفحات الانس کے مطالعے کیلئے تاکید کی۔ میں اس کتاب کو ہمیشہ پیش نظر رکھتی تھی۔ اور اس سے روحانی فائدہ حاصل کرتی تھی۔ اسی اثناء میں والد بزرگوار نے بھی کابل کی طرف

۱؎ عمل صالح جلد دوم صفحہ ۲۹۶ و ۲۹۷ پر شاہجہاں کا ورود لاہور ۱۰۴۸ھ میں دیا گیا ہے۔

۲؎ ایضاً صفحہ ۳۰۳۔ دارا شکوہ ۱۰۴۸ھ میں روانہ کابل ہوتا ہے۔

کوچ شروع کیا بھائی ہمیشہ خط لکھا کرتے تھے۔ انھوں نے راستے میں دو بزرگ دیکھے تھے۔ اور اُن کے متعلق مجھے لکھ بھیجا تھا۔ ان میں سے ایک شیخ دولہ تھے جو قصبہ گجرات خورد میں سکونت پذیر ہیں۔ اور دوسرے حاجی عبداللہ تھے جنھوں نے تال جلال گکھر کے حوالی میں ایک گوشہ اختیار کر رکھا ہے۔ جب میں گجرات پہنچی تو ایک خواجہ سرا کے ہمراہ میں نے شیخ دولہ کے پاس نیاز بھیجی اور فیض کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن جو کچھ میں ان سے چاہتی تھی وہ مجھے حاصل نہ ہوا۔ جب تال جلال گکھر کے نزدیک ہمارا قیام ہوا۔ تو حاجی صاحب کی خدمت میں نذر نیاز بھیجی اور فیض کی درخواست کی۔ انھوں نے نذر قبول نہ کی۔ اور تسبیح اور رسمی ذکر کے لئے حکم کیا اور ایک جانماز جو انھوں نے اپنے ہاتھ سے سی تھی۔ اور دو روٹیاں میرے لئے بھیجیں۔ وہ کسب حلال کے ذریعے اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ میں نے ان روٹیوں میں سے ایک ٹکڑا کھایا۔ کھانے کے ساتھ ہی میرا دل منور ہو گیا۔ اور میرے باطن میں جمعیت و حضور محسوس ہوا۔ میں نے تین دن تک اس روٹی کو محفوظ رکھا۔ اور اپنی اکثر خادماؤں کو اس میں سے ٹکڑے دیئے۔ حاجی عبداللہ صاحب نے تیس سال سے اپنے گھر سے باہر قدم نہیں رکھا۔ غرض کچھ مدت کے بعد حسن ابدال میں جو ایک نفیس جگہ ہے اپنے بھائی سے میری ملاقات ہوئی اور میں نے ان سے فیض حاصل کیا۔ اور انھوں نے مجھے مشائخ کے حالات پڑھنے کی تاکید کی۔ میرا اکثر وقت ان ہی کتابوں کے مطالعے میں گذرتا ہے۔

انہی ایام میں کہ جوانی کا وقت ہے میں اپنے اعضاء کی قوت کو روز بروز کم ہوتا دیکھتی تھی۔ اور اکثر بیمار رہا کرتی تھی۔ جب میں اس حقیقت سے آگاہ ہوئی کہ اس وجود کے لئے فنا لازم ہے تو میں نے اپنے دل میں ٹھان لیا کہ اب مناسب یہی ہے کہ اس حدیث نبوی مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا پر عمل کر کے دل کو اُس ذات مقدس کی طرف لگاؤں۔ بس قضا شدہ نمازیں

پڑھنی شروع کیں۔ اور چھوٹے ہوئے روزوں کی تلافی کی کوشش کی۔ جب ہم کابل پہنچے تو بھائی بھی تھوڑی مدت بعد تشریف لے آئے۔ اور والد بزرگوار نے تسخیر مملکت کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس پر میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکریہ ادا کیا۔

کچھ عرصہ بعد والد بزرگوار کابل سے عازم لاہور ہوئے۔ اور ۲۴ رجب ۱۰۴۹ھ کو اس شہر میں داخل ہوئے۔ چونکہ لاہور میں بہت سے مشائخ واکابر تھے۔ میں نے مرشد کی تلاش شروع کی۔ میں خاص کر چشتیہ مشرب کے مشائخ کی جستجو میں تھی۔ اور جہاں کہیں کسی گوشہ نشین اور شیخ کا نام سنتی تھی آدمی بھیج کر تحقیق کرواتی تھی۔ لیکن مجھے کسی سے فائدہ حاصل نہ ہوا حضرت میاں میر صاحب کے مریدوں میں سے خواجہ بہاری بہت مشہور تھے۔ لیکن کسی کو مرید نہیں کرتے تھے۔ ایک ایسا شیخ جس سے تشفی حاصل ہو مجھے نہیں ملتا تھا۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ یہ زمانہ اولیاء اللہ سے خالی تھا۔ دُنیا ان کے بغیر کیوں کر قائم رہ سکتی ہی؟ اگرچہ میں اس بات کو زیادہ پسند کرتی تھی کہ میں سلسلۂ چشتیہ میں مُرید ہوں۔ اور اگرچہ اس وقت بڑے بڑے چشتی مشائخ موجود بھی تھے۔ لیکن چونکہ وہ اپنے کو مستور الحال رکھتے تھے۔ ناچار میں نے فیصلہ کیا کہ کسی مرشد کامل کے ہاتھ پر بیعت کر لوں۔ خواہ ان کا تعلق کسی سلسلے سے ہو میری عُمر اب ستائیس برس کی ہو چکی تھی۔ اور میں وقت ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔[۱]

اسی سال والد بزرگوار کشمیر تشریف لے گئے۔ اور میں بھی ان کے ساتھ ہم ذی الحجہ کو کشمیر پہنچی۔ ہمارے قیام کے اوائل میں معلوم ہوا کہ ملّا شاہ کشمیر میں تشریف فرما ہیں۔ اور آپ سلسلۂ قادریہ میں حضرت میاں میر صاحب کے مُرید ہیں میرے بھائی حضرت میاں جیو سے نسبت ارادت رکھتے ہیں۔ انھوں نے حضرت مُلّا شاہ کی تعریف کی اور میں دل وجان سے ان کی معتقد ہو گئی۔ میں نے گستاخی

---

۱ عمل صالح جلد دوم صفحہ ۳۱۹۔

سے کام لیتے ہوئے تھوڑے دنوں میں ہی اخلاص و عقیدت سے پُر دو تین عریضے آپ کی خدمت میں بھیجے۔ اور یہ شعر بھی درج کر دیا ؎

گر میسّر شود آن روئے چو خورشید مرا　　　بادشاہی چہ کہ دعوائے خدائی بکنم

یہ خیال کرتے ہوئے کہ نذر و نیاز بھیجنا بے ادبی میں شامل ہو گا۔ میں نے پہلی مرتبہ عریضے کے ساتھ اپنے ہاتھ سے روٹی اور ساگ پکا کر خواجہ غریب کے ہمراہ بھیجا پہلے تو ایک ماہ تک آپ نے کمال بے نیازی سے جواب نہ دیا۔ لیکن عریضوں کو پڑھتے اور فرماتے کہ ہمیں دنیاداروں اور بادشاہوں سے کیا سروکار ہے۔ میں خط بھیجتی رہی آخر جب انھوں نے کشف باطنی کے ذریعے مجھے طلب و جستجو میں سچّا پایا۔ تو پھر میرے عریضوں کا جواب کچھ کچھ دینے لگے اور میری ڈھارس بندھ گئی کہ اب مجھے پوری ہدایت سے سرفراز کریں گے۔۔ ان کے گھر پہنچ کر میں نے ان کو دوسری جگہ سے دیکھا۔ اور میری حق بین آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ اور میں نے اپنے بھائی کی وساطت سے دست انابت ان کے ہاتھ میں دے کر ان کو اپنا مُرشد حقیقی بنا لیا۔ آپ نے مجھے سلسلۂ قادریہ کے ذکر و شغل کی تلقین کی۔ بیشتر اس کے کہ میں آپ کا جمال ظاہری طور پر دیکھوں۔ میرے بھائی نے آپ کی ایک تصویر مجھے دے رکھی تھی جس کو ان کی سرکار کے مصور نے ایک کاغذ پر کھینچا تھا۔ میں اس مبارک شبیہہ کو ہمیشہ اخلاص و عقیدت کی نگاہوں سے دیکھتی تھی۔ اور مخصوص اوقات میں ان کی صورت کا تصوّر کر کے مراقبے میں مشغول ہوتی تھی۔

پہلے روز ہی جب میرے بھائی نے مجھے سلسلۂ قادریہ میں مشغول کیا اور میرے مُرشد کی شبیہہ اور حضرت رسالت پناہ صلعم اور چار یار اور دوسرے اولیاء اللہ کے تصوّر کا طریق میرے دلنشین کیا۔ میں نے غسل کر کے نئے کپڑے پہنے۔ اور روزہ رکھا۔ اور شام کو اس چیز سے روزہ افطار کیا جو میرے مرشد نے ازراہ کرم میرے لئے بھیجی تھی۔ اور ملّا محمد سعید کے گھر کے کھانے سے جسے اکثر ملّا شاہ بھی تناول فرمایا کرتے تھے۔ میں نے کچھ تھوڑا سا کھایا۔ اپنے گھر والی مسجد میں نصف شب تک بیٹھی۔ اور مسجد میں

نماز تہجد ادا کر کے گھر میں آئی۔ اور ایک گوشے میں قبلہ رُو ہو کر بیٹھ گئی۔ اور ملّا شاہ کی شبیہہ پر توجہ مبذول کر کے اور حضرت رسول کریم صلعم اور صحابہ اور اولیاء اللہ کا تصوّر کر کے مشغول ہو گئی۔ میرے دل میں یہ بات کھٹکتی تھی کہ میں سلسلۂ چشتیہ میں مرید ہوں۔ اور اب کہ میں قادری مشرب میں شریک ہوئی ہوں مجھے کشائش حاصل ہوگی یا نہیں۔ اور حضرت ملّا شاہ کی تلقین و ہدایت سے مجھے کچھ فائدہ پہنچے گا یا نہیں؟ اسی اثنا میں مجھ پر ایک ایسی حالت طاری ہوئی جو نہ بیداری تھی اور نہ خواب۔ میں نے حضرت رسالت پناہ صلعم کی مجلس مقدس دیکھی جس میں صحابۂ کرام اور اولیائے عظام بھی شریک تھے۔ میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلعم تشریف فرما ہیں۔ اور چار یار اور اکابر صحابہ کی ایک جماعت آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ ملّا شاہ بھی اس مجلس میں موجود ہیں اور انھوں نے اپنا سر رسول اللہ صلعم کے مبارک قدموں پر رکھا ہے اور آنحضرت صلعم فرماتے ہیں کہ اے مُلّا شاہ تو نے تیموری چراغ روشن کر دیا۔ جب میں اس حالت سے لوٹی تو میرا دل اس خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ میں نے درگاہ خداوندی میں سجدۂ شکر ادا کیا۔ اور یہ رُباعی میری زبان پر تھی:۔

شاہا توئی آنکہ می رساند زصفا فیض نظر تو طالبان را بخدا

بر ہر کہ نظر کنی بمقصود رسد نور نظر تو شد مگر نور خدا

اپنے مرشد کی برکت سے میں نے آنحضرت صلعم اور یارانِ بزرگوار کی مجلس دیکھی اور آنحضرت صلعم کی مبارک زبان سے کلام سنا کہ "اے ملّا شاہ! چراغ تیموریہ را تو روشن کردی۔" میں سمجھ گئی کہ میرے شُبہ کو دُور کرنے کیلئے ایسا کیا گیا ہے۔

امیر تیمور کی نسل سے صرف ہم دو بہن بھائی اس سعادت سے مشرف ہوئے ہیں، ہمارے اسلاف میں سے کوئی بھی خدا طلبی اور حق جوئی کی راہ پر گامزن نہیں ہوا۔ اِس دولت عظمیٰ کے ملنے پر میں نے ہزار شکر کیا۔ اور میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ مُلّا شاہ سے میری عقیدت بہت بڑھ گئی۔ اور میں نے اُن کو دنیا و عقبیٰ میں اپنا مقتدا و پیشوا بنایا۔ میں اس مرتبہ کشمیر میں دو روز کم چھ ماہ ٹھہری۔ اس دوران

میں اپنے پیر و مرشد کو خط لکھتی۔ اور آپ اکثر از راہ عنایت مجھے جواب سے سرفراز کرتے۔ اگرچہ آپ دُنیا و عقبیٰ کی لذتوں سے بے نیاز تھے۔ پھر بھی حصول سعادت کے خیال سے میں مختلف قسم کی خوشبوئیں اور قسم قسم کے کھانے اپنے ہاتھ سے پکا کر بھیجتی تھی۔ اگرچہ غیر شرعی اُمور سے میں نے ہمیشہ اجتناب کیا ہی لیکن جب سے میں نے مرشد کامل کے جمال سے اپنی آنکھوں کو منور کیا ہے۔ میں بحر حقیقت تر سر چشمۂ معرفت سے سیراب ہوئی ہوں۔ ان کے گرامی ناموں سے مجھے پورا فائدہ پہنچا ہے۔

جب کشمیر سے میرے روانہ ہونے میں دو تین روز رہ گئے تھے۔ تو پنج شنبہ کی رات کو نماز مغرب کے بعد میں حضرت کے شبیہہ مبارک کے تصور میں مراقبے میں بیٹھی۔ میں نے حضرت کو دیکھا۔ اور آپ سے وہ دوپٹہ مانگا جو آپ کے کندھے پر تھا آپ نے مجھے وہ دوپٹہ عنایت فرمایا۔ علی الصباح جب میں اٹھی تو میں نے چاہا کہ ایک عریضے کے ذریعہ وہ دوپٹہ ظاہر طور پر بھی مانگوں۔ اسی اثناء میں میرا خواجہ سرا جو ہمیشہ حضرت کی خدمت میں جاتا تھا۔ آیا اور اس نے کہا کہ کل شام میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ نماز مغرب کے بعد آپنے دوپٹہ دوش مبارک سے اتار کر مجھے دیا۔ اور فرمایا کہ فلاں کیلئے لیجاؤ میں نے خواجہ سرا سے دوپٹہ لے کر آنکھوں سے ملا۔ اور مجھے بہت سرور حاصل ہوا۔ اس قسم کی کرامت آپکی ادنیٰ کرامات میں سے ہی۔ اور آپ ان کے اظہار سے ہمیشہ اجتناب فرماتے ہیں۔ ایک شاعر نے میری فرمائش پر حضرت کی تعریف میں یہ رُباعی کہی ہی:۔

اے ہستی تو ہستی مطلق گشتہ اسرار نہاں بر تو محقق گشتہ
حاجت ز تو خواستن حق خواستن است چوں جملہ صفاتت صفت حق گشتہ

میں دو مرتبہ آپ کے دیدار سے مشرف ہوئی۔ پہلی دفعہ کا ذکر میں اوپر کر آئی ہوں دوسری دفعہ میں نے آپ کی زیارت اُس دن کی جب کہ میں کشمیر سے لاہور آرہی تھی۔ میں نے عریضہ بھیج کر درخواست کی کہ چونکہ میں کشمیر سے روانہ ہو رہی ہوں آپ مجھ پر مہربانی فرمائیں تاکہ میں آپ کا دیدار کرسکوں۔ آپ نے اس درخواست

کو شرفِ قبولیت بخشا۔ اور از راہ کرم اس راستے پر جہاں سے ہیں گذرنے والی تھی۔ ایک توت کے درخت کے نیچے بیٹھ گئے ہیں ہاتھی کی عماری پر تھی۔ جب اس درخت کے برابر پہنچی تو ہاتھی کو نزدیک لیجاکر کھڑی ہوگئی اور آپ کے "جمالِ گیتی آرا" کو دیکھا۔ جو "بدرِ آسمان و خورشید تابان" تھا۔ آپ کی خدمت میں تین آدمی حاضر تھے۔ ایک محمد حلیم جسے آپ نے فرزندی کے خطاب سے سربلند کیا ہے۔ اور دو کشمیری خادم خضر اور حسن جو آپ کے پیچھے تھے۔ ان دو میں سے ایک نے گھوڑا پکڑا ہوا تھا میں نے گلاب کا ایک شیشہ اور کچھ پان اپنے خواجہ سرا کے ہاتھ بھیجے۔ اور اسے کہا کہ شیشۂ گلاب حضرت سے چکھوا کر واپس لائیں حضرت کی خدمت سے "با دیدۂ گریان و دل بریان" روانہ ہوئی۔ اور آپ بھی سوار ہوکر اپنی منزل کی طرف متوجہ ہوئے۔

خدا کا شکر اور احسان ہے کہ پیر دستگیر اور مُرشد کامل کے فیض و توجہ سے مجھے ایمان حقیقی حاصل ہوا۔ جو عبارت ہے، عرفان وفنا سے، جو شخص اس حقیقت سے آگاہ نہیں۔ وہ انسان کہلانے کا مستحق نہیں۔ بلکہ اس کا شمار اُولٰئِکَ کَالْانعام بَلْ ھُمْ اَضَلّ کے زمرے میں ہے۔ جو کوئی اس سعادت عظمٰی سے مشرف ہوا۔ وہ انسان کامل اور افضل موجودات ہے۔ اس کی ہستی ہستی مطلق میں گم ہوجاتی ہے۔ گویا وہ سمندر کا ایک قطرہ۔ آفتاب کا ایک ذرّہ اور کُل کا جُزو ہوتا ہے۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ ذالِکَ فَضلُ اللہِ یُؤتیہِ مَنْ یشآءُ۔ جس کسی کو ذات مطلق سے عشق و محبت ہے۔ وہ انسان کامل ہے۔ اگرچہ وہ عورت ہو۔ شیخ عطار قدس سرہٗ حضرت رابعہؒ کے حق میں فرماتے ہیں:۔

آں نہ یک زن بود بل صد مرد بود — پائے تا سر جملہ غرق درد بود

ان ہی ایام میں یہ چند شعر میں نے شوق و وجد سے بغیر کسی فکر و تامل کے کہے تھے اس رسالے کے آخر میں انھیں درج کرتی ہوں ؎

اینہا ہمہ را ظہور حق مے بینم — ذاتست یکے جملہ صفت (کذا) می بینم

نقش است فنا بقاست بے رنگیٔ یار　　　　بیرنگ بشو و رنگہا را مشمار

یار آمد در بغل بے محنت شبہائے ہجر　　　　عاشق و دیوانہ بودم اشتیاقم داد اجر

شوق تو مرا در برمے گیرد و مے مالد　　　　ہر لحظہ و ہر لمحہ ایں ذوق تو مے مالد

پیر من و خدائے من دین من و پناہ من　　　　نیست کسے بغیر تو شاہِ من والٰہِ من

امروز ندیدیم کسے ثانیٔ تو　　　　مائیم بروز عید قربانیٔ تو

اے شاہ زیک نظر بکردی کارم　　　　شاباش بتو چہ خوش نمودی یارم

خوشا ہجرے کہ باشد آخرش وصل　　　　خوشا فرعے کہ گردد عین آن اصل

تاثیر زبان خاصۂ شاہِ من است　　　　تقریر عیاں خاصۂ ماہِ من است

دریاب رہے کوچہ آن مُلّا شاہ　　　　کو ہست خزینہ دار توحید الٰہ

دیوانِ خواجہ معین الدّین چشتی رح اجمیری

علم و ادب کی دُنیا میں بعض اوقات عجیب عجیب چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں، انہی عجائبات میں سے بعض کتابوں کا غلط انتساب ہے، شیخ فرید الدین عطار کے نام چند ایسی کتابیں منسوب کر دی گئیں جن کا مصنّف کوئی فرضی عطار ہے یا اصلی مصنّف کے بجائے ان کتابوں کو شیخ عطّار کی تصنیفات ٹھہرایا گیا، میرزا قزوینی اور مولانا شبلی ایسے متبحر عالم اس حقیقت نمادروغ کو سچ تسلیم کرتے رہے یہاں تک کہ مرحوم پروفیسر محمود خاں شیرانی نے پوری جامعیت و استقصا کے ساتھ اس فریب کا پردہ چاک کیا، ان کی تحقیقات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ ان کتابوں میں سے کئی ایک کا مصنّف کوئی جعلی عطار ہے اور بعض کا انتساب غلط طور پر عطّار کے نام کر دیا گیا ہے،

شیرانی صاحب کے مضمون شائع ہونے کے کئی سال بعد ایران کے پروفیسر سعید نفیسی شیخ عطار کے احوال و تصانیف کے متعلّق اپنی کتاب میں شیرانی صاحب کے نظریہ کی تائید کرتے ہوئے ان کتابوں کو جعلی عطّار کا صدقہ بتاتے ہیں، جب آقای سعید نفیسی کی کتاب کا ایک نسخہ شیرانی صاحب کی خدمت میں ارسال کیا گیا تو وہ یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ ایک ایرانی محقق بھی اسی نتیجہ پر پہنچا ہے جہاں وہ کئی سال پہلے پہنچ چکے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ان کی دقت نظر نے آقائے سعید نفیسی کی تحقیقات میں یہ خامی محسوس کی کہ وہ ان تمام کتابوں کو جعلی عطّار کی مِلک ٹھہراتے ہیں۔ حالانکہ ان میں سے بعض کے حقیقی مالک موجود ہیں۔

اسی قسم کے غلط انتساب کی ایک بیّن مثال حضرت خواجہ معین الدّین اجمیریؒ کا دیوان ہے جسے مطبع نولکشور کے مہتمم کئی بار شائع کر چکے ہیں، ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں حضرت خواجہ صاحب کی جلیل القدر شخصیت کو جو اہمیت حاصل ہو اس کی بناء پر یہ دیوان خواص و عوام میں بہت مقبول ہوا اور عقیدت مندوں

کے حلقہ میں اس کی بڑی قدر ہوئی لیکن اہل علم کو اس امر کی تحقیق کا خیال نہ آیا کہ یہ دیوان جسے وہ ہر قسم کے احترام کا مستحق سمجھتے ہیں خواجہ صاحب کی تصنیف ہے یا اس کا جائز مالک کوئی اور شاعر ہے، سب سے پہلے رسالۂ اردو کی اشاعت جولائی ۱۹۲۷ء میں شیرانی صاحب نے اصل حقیقت کا سراغ لگانے کی کوشش کی، ان جیسے محقق کے لئے یہ باور کرنا دشوار تھا کہ اگر یہ دیوان واقعی خواجہ صاحب کا تھا تو اتنی صدیوں تک یہ ایک گنج مخفی کی طرح اہل علم کی نظروں سے کس طرح پوشیدہ رہا، کئی ایسی کتابوں کے نام ہمیں معلوم ہیں جو آج تقریباً ناپید ہیں لیکن ان کے نام کم از کم کتابوں میں محفوظ ہیں، ادھر خواجہ صاحب کے دیوان کا یہ حال ہے کہ خواجہ صاحب کی وفات سے صدیوں بعد تک اس کا سراغ نہیں لگایا جاسکتا، یہ سچ ہے کہ بعض تذکرہ نویس مثلاً تقی اوحدی، والہ داغستانی میر حسین دوست سنبھلی لطف علی آذر اور رضا قلی ہدایت خواجہ صاحب کی طرف بعض اشعار منسوب کرتے ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک بھی خواجہ صاحب کے صاحب دیوان ہونے کا ذکر نہیں کرتا، مولوی خدا بخش خاں کی بانکی پور لائبریری میں اس دیوان کا ایک نسخہ موجود ہے لیکن کیٹلاگ مرتب کرنے والے صاحب صراحت کے ساتھ لکھتے ہیں، اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے شیرانی صاحب نے اپنی تحقیقات کا آغاز کیا اور آخر تلاش و جستجو کے بعد انھیں ایک ایسے مصنف کا سراغ مل گیا جسے اس دیوان کا حقیقی مالک تسلیم کیا جاسکے، یہ مصنف ملا معین واعظ فراہی ہیں جنھیں مولانا جامی کے ہم عصر ہونے کا شرف حاصل ہے، ملا معین اپنے زمانے کے ایک مشہور واعظ تھے، وہ محض ایک شیوا بیان مقرر ہی نہ تھے بلکہ تحریر و انشا کے میدان کے بھی مرد تھے، چنانچہ وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں، ان ہی میں سے ایک کتاب کا نام معارج النبوۃ ہے، اس کتاب کے مطالعہ نے شیرانی صاحب کو یقین دلادیا کہ خواجہ صاحب کی طرف منسوب کئے ہوئے دیوان کے مالک ملا معین ہیں، ملا کی یہ عام عادت ہے کہ وہ اپنی کتابوں میں جابجا اپنے اشعار بلکہ بعض اوقات پوری کی پوری غزلیں نقل کرتے جاتے ہیں اور پھر اس بات کی صراحت بھی کردیتے ہیں کہ یہ اشعار ان کے اپنے نتائج افکار ہیں، شیرانی صاحب کو پندرہ سولہ غزلیں ایسی مل گئیں

جنھیں ملا معین نے معارج النبوۃ میں اپنے نام کی صراحت کے ساتھ درج کیا ہے اور وہی خواجہ صاحب کے دیوان میں بھی ملتی ہیں، یہ ایک ایسی صاف اور واضح حقیقت ہے کہ جس کے تسلیم کرنے میں کسی انصاف پسند کو کوئی عذر نہیں ہو سکتا لیکن ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ شمس العلماء پروفیسر محمد عبد الغنی نے اپنی کتاب "مغلوں سے پہلے ہندوستان میں فارسی ادب" میں خواجہ صاحب کی طرف دیوان کے انتساب کو درست تسلیم کرتے ہوئے اس کی بعض چیدہ غزلوں کو مع انگریزی ترجمہ کے درج کیا اس قسم کے اندراج کی غالباً یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ شیرانی صاحب کا مضمون شمس العلماء کے ملاحظہ سے نہیں گذرا تھا تاہم جب شیرانی صاحب نے اپنے تبصرے میں شمس العلماء کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کی تو شمس العلماء کو بادل ناخواستہ یہ بات تسلیم کرنی پڑی لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دینا چاہی کہ ان غزلوں کے علاوہ جن کی نشان دہی شیرانی صاحب نے کی ہے باقی غزلیں خواجہ صاحب کی تصنیف ہو سکتی ہیں، اتفاق سے بمبئی کی کریمی لائبریری میں جو آج کل اُردو و رسیرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ہے ہمیں ملا معین کی ایک دوسری کتاب سورۃ الفاتحہ کی فارسی تفسیر مل گئی ہے، حسب عادت اس میں بھی ملا معین جا بجا اپنے اشعار نقل کرتے ہیں، ہم چند ایسی غزلیں ڈھونڈھنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو معارج النبوۃ میں درج کی ہوئی غزلوں کے علاوہ ہیں، پیشتر اس کے کہ ہم ان غزلوں کو قارئین کی خدمت میں پیش کریں ہم ملا معین سے متعلق وہ اطلاع نقل کرنا چاہتے ہیں جو امیر علی شیر نوائی کی مجالس النفائس کے فارسی ترجمہ میں قزوینی نے بہم پہنچائی ہے، ملا کے متعلق شیرانی صاحب کی معلومات کا سب سے بڑا ماخذ حبیب السیر ہے۔

علماء و شعراء کی سرپرستی میں امیر علی شیر سلطان حسین سے بھی گوے سبقت لے گیا تھا، وہ محض ایک وزیر باتدبیر ہی نہ تھا بلکہ اقلیم سخن میں بھی ایک بلند مرتبہ پر فائز تھا، ترکی زبان میں اس کا خمسہ ترکی دانوں سے خراج تحسین وصول کر چکا ہے، فارسی میں بھی اسے شعر گوئی پر دہی قدرت حاصل تھی جس کا ثبوت اس کے ترکی کلام میں ملتا

ہے، اس نے اپنے ہم عصر شعراء کا ایک تذکرہ ترکی میں ۸۹۶ھ میں مجالس النفائس کے نام سے مرتب کیا، اپنی بیش بہا معلومات کی بناء پر یہ کتاب بڑی مقبولیت کی مستحق ٹھہری، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی افادی حیثیت کے پیش نظر تقریباً ایک ہی وقت اس کے دو فارسی ترجمے تیار کئے جاتے ہیں، ایک ہرات میں ۹۲۸ھ کے قریب اور دوسرا ۹۲۹ھ میں اسلامبول میں، پہلے کا مصنف فخری ہے جو اپنے ترجمہ کو لطائف نامہ کے نام سے موسوم کرتا ہے، یہ وہی فخری ہے جو دو دیوانوں بوستان خیال اور تحفۃ الحبیب کا مالک ہے اور جس نے سندھ کے والی عیسٰی خاں ترخان کے لئے سخن ور عورتوں کا تذکرہ بنام جواہر العجائب مرتب کیا لطائف نامہ کے دیباچہ میں شاہ اسمٰعیل صفوی، اس کے بیٹے سام میرزا اور امیر الامرا درمش خاں کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کے بعد یہ کتاب وزیر خراسان خواجہ حبیب اللہ کی مجلس میں ہدیۃً پیش کی جاتی ہے، خاتمۂ کتاب میں ایک پوری فصل شاہ اسمٰعیل کے وزیر میرزا شاہ حسین کے لئے وقف کی گئی ہے، دوسرا ترجمہ اسلامبول میں محمد بن المبارک القزوینی اسمٰعیل صفوی کے رقیب سلطان سلیم کے نام سے معنون کرتا ہے، چونکہ شاہی دربار میں قزوینی طبیب کے فرائض سرانجام دیتا تھا اس لئے وہ حکیم شاہ کے نام سے مشہور ہے، قزوینی نے سات مجلسوں کا ترجمہ "سات بہشتوں" میں کیا ہے، آخر میں ایک فصل کا اضافہ بنام بہشت ہشتم کیا گیا ہے، آٹھویں بہشت "دو روضوں" میں منقسم ہے، روضۂ اوّل میں ان شعراء کا ذکر ہے جو سلطان سلیم سے پہلے گذر چکے ہیں اور روضۂ دوم میں سلطان سلیم اور اس کے درباری شاعروں کا بیان ہے، اس ترجمہ میں بھی کئی ایسے اضافے ہیں جو بہت مفید اور قیمتی ہیں،

آج سے تقریباً بیس سال پہلے برادر عزیز ڈاکٹر سید محمد عبداللہ (پروفیسر اورینٹل کالج لاہور) فخری کا ترجمہ بالاقساط اورینٹل کالج میگزین میں شائع کر چکے ہیں، حال ہی میں ایران کے نامور فاضل اور سابق وزیر تعلیم آقا علی اصغر حکمت نے فخری اور قزوینی کے دونوں ترجموں کو یکجا کر کے اپنے عالمانہ مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے،

غالباً آقا حکمت کو سید صاحب کے شائع کردہ نسخہ کا علم نہیں ورنہ وہ ضرور ان کی محنت اور تحقیق کا اعتراف کرتے، فخری اور قزوینی کے سلسلہ میں ہماری معلومات کا ماخذ آقا حکمت کا فاضلانہ مقدمہ ہے۔ فخریؔ کا بیان ملا معین کے متعلق بہت مختصر ہے۔

مولانا معین واعظ مولانا حاجی محمد فرہی (فراہی) کا بیٹا مشاہیر میں سے ہے، فی الحال شہر کا مقرر کردہ واعظ ہے، یہ مطلع اس کا ہے،

مگر فصل بہار آمد کہ عالم سبز و خرم شد
مگر وصل نگار آمد کہ دل با وصل ہمدم شد

قزوینی ملا معین سے زیادہ خوش نظر نہیں آتا، وہ امیر علی شیر کے بیان پر اکتفا نہ کرتے ہوئے اپنی طرف سے اضافہ کرتا ہے کہ ملا پر دیوانگی غالب تھی، اس جنون کی تہمت کی ذمہ دار شاید ملا کی خودداری اور آزادہ روی ہو، ذیل میں ہم قزوینی کے بیان کا مطلب اُردو میں پیش کرتے ہیں:۔

"مولانا معین واعظ مولانا محمد فرہی (فراہی) کا بیٹا ہے، یہ بھی اچھا واعظ ہے اور تمام خراسان میں اس کا وعظ خاص و عام میں مقبول ہے لیکن یہ دیوانہ سا ہے اور اس کے مُرید بھی ایسے ہی ہیں، چونکہ لوگ اُسے دیوانہ سمجھتے ہیں اس لئے جو جی میں آتا ہی منبر پر کہہ دیتا ہے اور کوئی اس سے باز پُرس نہیں کرتا اور کرے بھی کیوں جب کہ دیوانہ اور عاشق مواخذہ سے بری ہیں، ایک روز منبر پر اس نے یہ کہہ دیا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کا ایمان تقلیدی ہے اور اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ حضرت امیر کے اس قول "لو کشف الغطاء ما ازددت یقیناً" (اگر پردہ ہٹا دیا جائے تو میرے یقین میں کوئی اضافہ نہ ہوگا) کا مفہوم درست طور پر نہیں سمجھا، دیوانگی کے عذر کی بناء پر لوگوں کے مواخذے سے تو بچا رہا لیکن خدا تعالیٰ نے اسے معذور نہ سمجھا اور ایسے شکنجہ میں گرفتار کیا کہ لوگ دیکھ کر دم بخود رہ گئے اور کہنے لگے کہ اگرچہ انھوں نے کوئی گرفت نہیں کی لیکن خدا تعالیٰ نے اس کو اس گستاخی کی سزا دی، مولانا نظام الدین

---

۵۱ مجالس النفائس مرتبہ آقا علی اصغر حکمت صفحہ ۹۴

کہا کرتے تھے کہ ملا معین ایک قابل جوان ہے لیکن منبر کے تختے نے اس کی قابلیت کو ضائع کردیا ہے، یہ مطلع ملا کا ہے :-

مگر فصل بہار آمد کہ عالم سبز و خرم شد
مگر وصل نگار آمد کہ دل با وصل ہمدم شد

ملا معین کی جس غزل کا مطلع[۵۱] فخری اور قزوینی نے نقل کیا ہے وہ دیوان خواجہ معین الدین اجمیری مطبوعہ نول کشور ۱۸۹۳ء کے صفحہ ۲۲ و ۲۳ پر موجود ہے، اس غزل کے آٹھ شعر مع مطلع معارج النبوۃ میں ملتے ہیں، مطلع بالا مخزن الغرائب[۵۲] میں بھی معین فراہی کے نام سے دیا گیا ہے۔

اس تمہید کے بعد ہم ملا معین کی تفسیر اسرار الفاتحہ کا مطالعہ شروع کرتے ہیں یہ تفسیر ۳۴۲ صفحات پر محیط ہے اور ۱۳۰۷ھ میں مطبع نول کشور میں حلیۂ طبع سے آراستہ ہوئی ہے، سرورق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اخوند ملا خیر محمد پشاوری کی تحریک پر چھاپی گئی ہے اور افغانستان میں مروّج رہی ہے، کتاب کے دیباچہ میں ملا معین اپنی ضخیم کتابوں مثلاً تفسیر بحر الدرر، اربعین فی احادیث سید المرسلین، معارج النبوۃ اور قصص التنزیل کا ذکر کرتے ہیں، بعض دوستوں کی فرمائش پر وہ اپنی تفسیر بحر الدرر میں سے سورۃ الفاتحہ کی تفسیر علاحدہ مرتب کرنے پر رضامند ہو جاتے ہیں، ملا معین بڑے طومار نویس ہیں، ان کی تفسیر فاتحہ ایک مقدمہ اور پندرہ مجلسوں پر مشتمل ہے اور ہر مجلس میں کئی کئی فصلیں اور باب ہیں، ملا کا انداز بیان خطیبانہ اور واعظانہ ہے، وہ اپنی تحریر کو دل کش بنانے کے لئے نادر حکایات اور عمدہ اشعار جا بجا لاتے ہیں، انہیں عربی اور فارسی شعر و ادب کے ساتھ بڑی دلبستگی ہے، فارسی شعرا میں سے رشید وطواط، نظامی، کمال اسمٰعیل، عطار مولانا روم، سعدی، امیر خسرو، عراقی اور حافظ کے اشعار اس تفسیر میں جگہ پاتے ہیں، ملا معین اپنے والد اور استاد ملا محمد فراہی کے اشعار بھی درج کرتے ہیں لیکن بے شمار

---

۵۱ نول کشور ایڈیشن میں "وصل" کی جگہ "عیش" ہے۔

۵۲ مقالات شیرانی صفحہ ۲۲۹۔

عربی اور فارسی اشعار کے علاوہ مُلّا معین نے حسبِ عادت اپنے اشعار سے تفسیر کے صفحات کو مزیّن کیا ہے، معارج النبوۃ کی طرح یہاں بھی بعض اوقات وہ پوری کی پوری غزلیں درج کر دیتے ہیں، ان میں سے کئی غزلیں تو ایسی ہیں جو معارج النبوۃ میں بھی موجود ہیں، ہم ایسی تمام غزلوں سے اعراض کر کے صرف ان اشعار اور غزلوں کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرائیں گے جن کی طرف شیرانی صاحب نے اشارہ نہیں کیا اور اس کے ساتھ ہی جو دیوان خواجہ معین الدّین میں بھی ملتی ہیں،

مُلّا کے یہاں کافی تنوع پایا جاتا ہے، اشعار کے سلسلہ میں وہ اپنا حق تصنیف جتانے کے لئے مختلف پیرائیہ بیان اختیار کرتے ہیں؛ "للفقیر معین المسکین"۔ "قال العبد الضعیف مؤلّف ھذا الکتاب" "کما قلتُ فی شعرٍ لی" عربی اسلوب کی چند مثالیں ہیں لیکن فارسی میں بعض اوقات بڑے پُرتاثیر طریقہ پر اپنی دیوانگی و بیخودی کی کیفیت بیان کرتے ہیں "چنانچہ فقیر تو گوید" "چنانچہ فقیر تو گفتہ است" "چنانچہ فقیر حقیر گوید" "چنانچہ فقیر ترا سرّی درین معنی بخاطر می گذشت" "چنانچہ معین دیوانہ گفتہ است"

ذیل میں ہم ان غزلوں اور اشعار کی نشان دہی کرتے ہیں جن کو مُلّا معین نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں نقل کیا ہے اور جو دیوان خواجہ معین الدّین میں بھی موجود ہیں۔

صفحہ ۵۲۶، لمولفہ ختم لہٗ بالخیر،

خزینہاست مرا پر ز نقد علم و ادب

کجاست آہ سحرگاہ و نالۂ دل شب

اس غزل کے نو اشعار دئے گئے ہیں، مقطع میں مُلّا کا نام معین موجود ہے دیوان کے صفحہ ۷ و ۸ پر یہ غزل درج ہے اور اس کے اشعار کی تعداد گیارہ ہے، صفحہ ۲۷۵، لمولفہ

دلا بحلقۂ رندان بزم عشق در آ

کہ از شراب بقا جرعۂ دہند ترا

اس غزل کے سات اشعار مع مقطع ہیں، صفحہ ۲۸۴ پر بھی اس غزل کے سات اشعار نقل کئے گئے ہیں، یہی غزل دیوان کے صفحہ ۳ و ۴ پر درج ہے اور اس میں کل اشعار تیرہ ہیں،

صفحہ ۱۲۸ - قال العبد الضعیف مولف الکتاب فی ھذا الخطاب

نام او می بردم اول تا چنان شد عاقبت
کو چو شیر اندر رگ و جانم رواں شد عاقبت

مع مقطع اس غزل کے نو اشعار درج ہیں، مطبوعہ دیوان کے صفحہ ۱۴ و ۱۵ پر اس غزل کے اشعار کی تعداد سات ہے،

روزی کہ یار جام صفا پر زمی کند
عاشق دران وفا ز جفا یاد چوں کند

اس غزل کے پانچ اشعار صفحہ ۲۵۲ پر درج ہیں اور مطبوعہ دیوان کے صفحہ ۳۲ و ۳۳ پر اس غزل کے کل اشعار سات ہیں، تفسیر الفاتحہ کے صفحہ ۳۵۴ پر اس غزل کے پانچ شعر دوبارہ نقل کئے گئے ہیں اور اس کے پہلے 'لمولفہ' لکھا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ مُلّا معین اس کے مالک ہیں۔

ای تو سلطان وار ملک وجود ہمہ عالم طفیل تو مقصود

اس غزل کے نو اشعار تفسیر الفاتحہ کے صفحہ ۲۸۷ پر نقل کئے گئے ہیں۔ مقطع سے پہلے شعر میں مُلّا معین اپنا نام یوں لاتے ہیں:۔

می فرستد معین بخدمت تو صد ہزاراں درود نا معدود

اور آخری شعر اس طرح ہے:۔

دارم امید از شفاعت تو شود از من خدای من خوشنود

یہی غزل مطبوعہ دیوان کے صفحات بیس اور اکیس پر موجود ہے اور اس کے اشعار کی تعداد دس ہے، لیکن اس میں مقطع اس طرح دیا گیا ہے:۔

می فرستد معین، درود بتو حق تعالیٰ زمن شود خوشنود

روز قیامت می رسد تا گفتگو یک سو شود

اسرار پنہاں از ازل از پردہ ہا بیرون شود

یہ پوری غزل جس میں بارہ اشعار ہیں تفسیر الفاتحہ کے صفحہ ۳۶۱ پر درج ہے اور اس کے پہلے "لمولفہ" لکھا ہے، اسی غزل کے تین اشعار صفحہ ۳۵۲ پر بھی دیے گئے ہیں، مطبوعہ دیوان کے صفحہ ۳۱ و ۳۲ پر یہ غزل موجود ہے لیکن وہاں اس کا مطلع یوں نقل کیا گیا ہے :-

گر پردہای آب و گل از جان و دل یک سو شود

از کسوت ہر ذرۂ مہر دگر بیرون شود

جہاں تک باقی اشعار کا تعلق ہے کوئی فرق نہیں، مقطع دونوں میں ایک جیسا ہے۔

مسکین معینی تاکنون در شام غم ماندہ زبون

ای ماہ اگر آئی برون استادہ اش میموں شود

سخن بشنو معینی غم مخور از آتش دوزخ

کہ موسٰی را جمال یار اندر نار می تابد

ایک غزل کا یہ مقطع تفسیر سورۃ الفاتحہ کے صفحہ ۳۹۶ پر نقل کیا گیا ہے اور اس کے پہلے یہ الفاظ ہیں :- چنانکہ فقیر تو گفتہ است، صاف ظاہر ہے کہ یہ غزل ملّا معین کی ہے، مطبوعہ دیوان میں غزل صفحہ ۳۵ و ۳۶ پر درج ہے اور اس کا مقطع تفسیر الفاتحہ کے مقطع کے مطابق ہے، اس غزل کا مطلع معارج النبوۃ میں بھی نقل کیا گیا ہے (ملاحظہ ہو پروفیسر شیرانی کا مضمون)

مگر صبا ز سر کوی دوست می آید — کہ از زمین و زمان بوی دوست می آید

تفسیر الفاتحہ کے صفحہ ۴۹۷ پر اس غزل کے پانچ اشعار درج ہیں، یہی غزل مطبوعہ دیوان کے صفحہ ۲۶ پر موجود ہے اور اس کے اشعار کی تعداد سات ہے

گفتمش عکس جمالت چوں مرا موجود کرد — تا بمانم زندہ زاں قوتم بباید داد باز

اس غزل کے تین اشعار تفسیر الفاتحہ کے صفحہ ۵۰۵ پر نقل کئے گئے ہیں اور ان سے پہلے مُلّا معین لکھتے ہیں: چنانکہ فقیر تو گوید، مُلّا کے اس اظہار کے بعد کوئی شُبہ وارد نہیں ہو سکتا، جب ہم مطبوعہ دیوان کی طرف رجوع کرتے ہیں تو اس کے صفحہ ۴۰ و ۴۱ پر یہ غزل درج ہے اور اس کے کل اشعار گیارہ ہیں،

مرا بہر دو جہان دولت وصال تو بس
وصال چیست کہ آمد شد خیال تو بس

تفسیر الفاتحہ کے صفحہ ۳۹۶ پر اس غزل کے چھ اشعار بشمول مقطع درج ہیں اور پھر صفحہ ۲۹۴ پر اسی غزل کے پانچ اشعار پائے جاتے ہیں، مطبوعہ دیوان کے صفحہ ۴۱ و ۴۲ پر یہی غزل درج ہے اور اس کے اشعار کی تعداد سات ہے۔

تا من بیاد پیوستہ ام از غیر او بریدہ ام
من حلّ و عقد عقل را در یکد گر پیچیدہ ام

یہ پوری کی پوری غزل تفسیر الفاتحہ کے صفحہ ۲۸۸ پر درج ہے اور مطبوعہ دیوان کے صفحہ ۵۲ و ۵۳ پر موجود ہے اور اس کے کل اشعار بارہ ہیں۔

لمولفہ جام دیدار خدا کرد چنان مخمورم
کہ خمارش نہ نشیند بہ بہشت و حورم

یہ ۱۴ اشعار کی غزل تفسیر الفاتحہ کے صفحہ ۴۳۶ پر درج ہے اور "لمولفہ" کے پہلے مُلّا معین لکھتے ہیں: چنانکہ فقیر تو می گوید، مطبوعہ دیوان کے صفحہ ۶۱ و ۶۲ پر یہی غزل موجود ہی اور وہاں اس کے اشعار کی تعداد پندرہ ہے۔

ما بہر وصال از دل و جان نیز گذشتیم
در وصل نخواہی تو ازان نیز گذشتیم

تفسیر الفاتحہ کے صفحہ ۴۳۷ پر اس غزل کے نو شعر نقل کئے گئے ہیں جن میں مقطع بھی شامل ہے، ان اشعار کے پہلے "چنانکہ فقیر تو گوید" کے الفاظ موجود ہیں اس غزل کے تین اشعار تفسیر کے صفحہ ۷۰۸ پر بھی درج ہیں، مطبوعہ دیوان کے صفحہ ۵۹

پر یہ غزل موجود ہے اور اس کے کُل اشعار گیارہ ہیں۔

ای نور عشقت تافتہ اندر سویدای دلم
بگرفتہ نور عشق تو پنہان و پیدای دلم

گیارہ اشعار کی یہ غزل تفسیر الفاتحہ کے صفحہ ۸۰ پر درج ہے۔ اور اس کے پہلے ملّا معین لکھتے ہیں: "قال الفقیر الضعیف معین المسکین" مطبوعہ دیوان کے صفحہ ۵۱ و ۵۲ پر یہ غزل موجود ہے اور اس کے اشعار کی تعداد گیارہ ہے،

گر ز دود نفس ظلمت ناک بودم سوختہ
ز امتزاج آتش عشق تو نورانی شدم
من چنان بیرون شدم از ظلمت ہستی خویش
تا ز نور ہستی او آنکہ می دانی شدم

تفسیر الفاتحہ کے صفحہ ۱۵۲ پر اس غزل کے دو شعر نقل کئے گئے ہیں اور ان کے پہلے ملّا معین لکھتے ہیں: "کما قُلتُ فی شعرٍ لی"

مطبوعہ دیوان کے صفحہ ۵۶ پر یہ سات اشعار کی غزل موجود ہے، اس کا مقطع احمدی حضرات میرزا غلام احمد صاحب کے دعوے کی حمایت میں نقل کیا کرتے ہیں:-

دمبدم روح القدس اندر معینی می دمد
من نمی دانم مگر من عیسی ثانی شدم

وہ اس شعر کو حضرت خواجہ صاحب کی طرف منسوب کرتے ہیں،

لمولفہ سوی من آکہ ترا یار وفادار منم
ہر چہ داری بمن آور کہ خریدار منم

دس اشعار کی یہ غزل تفسیر الفاتحہ کے صفحہ ۱۴۷ پر درج ہے، مطبوعہ دیوان کے صفحہ ۴۹ پر یہی غزل موجود ہے لیکن وہاں اشعار کی تعداد گیارہ ہے،

معین کہ دست تہی می رود بدرگہ دوست
مگر کہ ہم کرم او شود وسیلۂ من

غزل کا یہ مقطع تفسیر الفاتحہ کے صفحہ ۲۹۳ پر نقل کیا گیا ہے، مطبوعہ دیوان کے صفحہ ۶۷ پر یہ آٹھ اشعار کی غزل موجود ہے،

ای صدای بلبلان در صحن بستان حمد تو
وی نوای مرغ جان در باغ ایمان حمد تو

تفسیر الفاتحہ کے صفحہ ۲۱۹ پر اس غزل کے چھ اشعار بشمول مقطع درج ہیں تفسیر کے صفحہ ۲۰۰ پر ملّا معین کا شعر نقل کرتے ہوئے " لذا قلت " لکھتے ہیں جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ غزل ان کی ملک ہے ۔

حامدان کو عرش را در مدح فرش رہ کنند
زاوج عزت پایۂ ناید بپایان حمد تو

تفسیر الفاتحہ کے صفحہ ۳۴۷ پر گیارہ اشعار کی پوری غزل درج ہے جس کا مطلع یہ ہے ۔

چو از جمال نقاب بطون بر اندازی
دران ظہور وجود مرا عدم سازی

یہی غزل مطبوعہ دیوان کے صفحہ ۸۶ و ۸۷ پر موجود ہے۔

بخدا غیر خدا در دو جہان نیست کسی
صد دلیل است ولی واقف ازان نیست کسی

یہ پوری غزل مع مقطع تفسیر الفاتحہ کے صفحہ ۱۴۵ پر درج ہے، مطبوعہ دیوان کے صفحہ ۸۹ پر یہی غزل موجود ہے، اس کے کل اشعار نو ہیں،

مندرجہ بالا شواہد سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین کے نام سے شائع کردہ دیوان آپ کی ملکیت نہیں بلکہ ملّا معین فراہی اس کے مالک ہیں، مرحوم شیرانی صاحب کا یہ ارشاد بالکل بجا ہے ۔

"ممدوح (ملا معین) کثیر التعداد تصنیفات کے مالک ہیں، اگر ان کی تالیفات میں پوری کوشش سے باقاعدہ تلاش کی گئی تو مجھے یقین واثق ہے کہ نہ صرف موجودہ دیوان کی ہر ایک غزل کا اس میں پتہ لگ جائے گا بلکہ اس کے علاوہ سینکڑوں نئی غزلیں ہاتھ آئیں گی جو دیوان کے حجم کو المضاعف کر دیں گی۔

شیخ فریدالدّین عطّار کے حالات و تصانیف کے متعلّق

ہند و ایران کے علماء کی تحقیقات

فارسی زبان میں صوفیانہ شاعری کے اقانیم ثلاثہ میں عطّار دوسرے رکن ہیں، سنائی اور رومی کی طرح عطّار بھی تصوّف کی دُنیا میں ایک امتیازی حیثیت کے مالک ہیں، بہت کم ایسی کتابیں ہوں گی، جنھیں فارسی زبان میں پند نامۂ عطّار کی سی مقبولیت حاصل ہو نظم میں ان کی مثنوی منطق الطیر اور نثر میں تذکرۃ الاولیاء زندۂ جاوید یادگار ہیں، حیرت کا مقام ہے کہ ایسے بلند پایہ شاعر اور بزرگ کے سوانح حیات کا مرقع محض نا تمام ہی نہ ہو، بلکہ بہت حد تک مبالغہ آمیز افسانوں پر بھی مشتمل ہو، دوسروں کی طرف تو محض چند اشعار کا انتساب کیا جائے لیکن عطّار کی طرف پوری کی پوری کتابیں منسوب کردی جائیں اور اس پر طرّہ یہ کہ بڑے بڑے محقّقین اس انتساب کی صحت کو پرکھنے کے بجائے اس پر بغیر کسی تذبذب کے اظہار کے ایمان بھی لے آئیں۔

عطّار کا تذکرہ لباب الالباب اور تاریخ گزیدہ میں سوائے مبالغہ آمیز تعریف کے کچھ نہیں، نفحات الانس میں بہت کچھ ہے لیکن اس کے بیانات میں حقیقت اور افسانہ کو کچھ اس طرح مخلوط کردیا گیا ہے کہ اصل اور سچائی کا سُراغ لگانا دشوار ہے، دولت شاہ، امین احمد رازی اور بعد کے تذکرہ نگاروں کے یہاں وہی نفحات الانس کی ہی اطلاع کم و بیش دہرائی گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ دورِ حاضر کے سب سے بڑے ایرانی محقّق علامہ محمد قزوینی نے تذکرۃ الاولیاء پر مقدمہ انتقادی لکھتے وقت اس اطلاع سے قطع نظر کرکے خود عطّار کی تصانیف کی طرف رجوع کیا، کیونکہ ایک مُصنّف کے سوانح حیات کا سب سے زیادہ قابلِ اعتماد ماخذ اس کی خود نوشتہ تحریریں ہیں،

مرزا قزوینی جیسے عالم متبحر سے توقع تھی کہ وہ ہمیں افسانہ کی دنیا سے نکال کر حقائق

و واقعات کی وادی کی سیر کرائیں گے، اور عطّار کے متعلق بے بنیاد افسانوں کے تار و پود کو بکھیر کر ایک صحیح اور سچّا مرقّع پیش کریں گے، لیکن افسوس ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ عطّار کے سوانحِ حیات مرتب کرنے کی غرض سے میرزا قزوینی کی نظر انتخاب مظہر العجائب اور لسان الغیب پر پڑتی ہے، عطار کی اصلی تصنیفات کے مقابلے میں یہ دونوں کتابیں کم پایہ ہیں، اُن کی زبان میں متانت اور پختگی نام کو نہیں، شعروں کی بندش بالکل سُست اور کمزور ہے، خود علّامہ قزوینی کی اپنی شہادت ملاحظہ ہو،

"و اشعار ایں کتاب بالنسبۃ بسایر اشعار تفاوت واضح دارد، در پستی و سُستی و قدری رکاکت و ہر کس منطق الطیر و الٰہی نامہ و خسرو گل و دیوان عطار را مطالعہ کردہ باشد، برای او قدرے مشکل است اعتقاد کند کہ صاحب مظہر العجائب با آنہا یکی بودہ است و ظاہراً علّت این انحطاط جمود طبع است، در سن کہولت"

(صفحہ ط، ی)

آقاے قزوینی کو اس امر میں ذرا شُبہ نہیں کہ مظہر العجائب کو عطّار کی دوسری تصانیف سے کوئی نسبت نہیں اور جس کسی نے منطق الطیر یا دیوان عطّار کا مطالعہ کیا ہے، اس کے لئے یہ باور کرنا ذرا مشکل ہے کہ مظہر العجائب عطّار کی تصنیف ہے، تاہم یہ نامور محقّق اپنے اعتقاد کو ٹھیس نہیں لگنے دیتا، اور یہ کہہ کر مطمئن ہو جاتا ہے کہ کلام کی تمام سُستی اور انحطاط بڑھاپے کی افسردگی اور اضمحلال کی وجہ سے ہے، دوسرے ماخذ لسان الغیب کے متعلق بھی علّامہ قزوینی کی رائے کچھ اچھی نہیں، اُن کے نزدیک مظہر العجائب کی طرح اس کتاب کے اشعار بھی سُست اور کمزور ہیں، اور بسا اوقات وزن کے اعتبار سے بھی ساقط ہیں،

"و اشعار ایں کتاب نیز مانند اشعار مظہر العجائب ضعیف و بسا از اوقات منکسر الوزن است" (صفحہ یا)

اگر یہ کتابیں ادبی حیثیت سے اس درجہ پست اور فرو مایہ ہیں، تو وہ کون سے

اسباب ہیں، جن کی بنا پر ایران جدید کا سب سے بڑا محقق اِن کتابوں کی اصلیت دریافت کرنے کی کوشش نہیں کرتا، اس کی سب سے بڑی وجہ غالباً کتابوں سے حاصل کردہ معلومات کی نوعیت ہے مظہر العجائب میں جیسا کہ اُس کے نام سے ظاہر ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہ کے مناقب بڑی تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں، مُصنّف بغیر کسی ڈر اور جھجک کے اپنے تشیع کا اظہار کرتا ہے، بارہ اماموں کا حلقہ بگوش ہے، اور غیبت مہدی کا بھی قائل ہے اس کتاب کے ظہور کے بعد سمرقند کا کوئی فقیہ مصنّف کے خلاف ایک ہنگامہ بپا کر دیتا ہے، کتاب جلادی جاتی ہے اور مُصنّف کو کشتنی اور گردن زدنی قرار دیا جاتا ہے اترک اُس کے مکان پر چڑھ آتے ہیں، اور اس کو خانماں برباد کر دیتے ہیں، توفیق خداوندی اس کے بچنے کا سامان مہیّا کر دیتی ہے اور یہ بیچارہ مکّہ کی راہ لیتا ہے، جہاں پہنچ کر وہ لسان الغیب لکھتا ہے جو بقول قزوینی غالباً عطّار کی آخری تصنیف ہے، میرزا قزوینی مندرجہ ذیل اشعار نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کتاب میں اپنے تشیع کے اظہار میں شاعر "بصراحت و بدون تقیہ" کہتا ہے:-

شیعۂ پاکست عطّار اے پسر   جنس ایں شیعہ بجانِ خود بخر
مازِ فاروق التجا بر کندہ ایم   پے ز نورینِ شما ببریدہ ایم
بوحنیفہ را ز دست بگذار تو   خود برد اندر پئے کرّار تو

مظہر العجائب میں مُصنّف اپنی سیّاحی اور جہاں نوردی کے سلسلہ میں دعویٰ کرتا ہے کہ وہ مکّہ، دمشق، مصر، ہندوستان، ترکستان اور چین کی سیر کر چکا ہے، اور بچپن کے زمانہ میں مشہد رضوی میں تیرہ برس گذار چکا ہے، میرزا قزوینی اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ عطّار کی طرف بعض کتابیں منسوب کی گئی ہیں، اور ان کا حال عمر خیّام اور مولوی رومی کا سا ہے، بلکہ اُن سے بھی عجیب تر ہے، کیونکہ خیام کی طرف بعض رباعیاں اور رومی کی طرف مثنوی کے بعض اشعار منسوب کیے گئے ہیں، لیکن عطّار کی طرف چند پوری کی پوری کتابیں منسوب کر دی گئی ہیں، جن کے انتساب کو غلط ٹھہرانے کے لئے صرف ایک بار کا مطالعہ کافی ہے، دصفحہ د کا حاشیہ، اسی طرح ایک دوسری جگہ مفتاح الفتوح اور

کنز الاسرار کے سلسلہ میں قزوینی لکھتے ہیں کہ " یہ عطار کی تصنیفات نہیں، مفتاح کا مصنف تو کوئی زنجانی ہے، اور کنز الاسرار کے مصنف کے بارے میں کچھ علم نہیں۔" (صفحہ نو کا حاشیہ)

علامہ قزوینی کے سلسلہ میں یہ امر قابلِ غور ہے کہ علمی تبحر، وسعت معلومات اور ژرف نگاہی کے باوجود وہ اپنے کو مذہبی عواطف اور رجحانات کے بے پناہ تسلط سے آزاد نہیں رکھ سکے، وہ اس قدر راسخ العقیدہ ہیں کہ وہ اپنے معتقدات کے خلاف کسی کی بات برداشت نہیں کر سکتے، آقا علی اصغر حکمت جو ایران میں وزیر تعلیم کے عہدہ پر فائز رہ چکے ہیں، اور ایران کلچرل مشن کے صدر کی حیثیت سے ہندوستان کے مختلف شہروں کا دورہ بھی کر چکے ہیں، مولانا جامی کی بڑی محققانہ سوانح عمری مرتب کرتے ہیں، اس کتاب کے مطبوعہ اجزا وہ علامہ قزوینی کی خدمت میں ارسال کرتے رہے، جب آقا قزوینی پوری کتاب کا مطالعہ کر چکے تو انھوں نے آقا علی اصغر حکمت کی عالمانہ تحقیق کی داد دیتے ہوئے، ایک مفصل خط لکھا، جسے موخر الذکر نے مرزا قزوینی کی اجازت سے بغرض افادہ کتاب کے آخر میں شائع کر دیا ہے، اس طویل خط میں مرزا نے آقا حکمت کی کامیاب کوشش کی کما حقہٗ قدر شناسی کی ہے، اور ساتھ ہی ساتھ اس مسئلہ پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے کہ جامی جنھیں حافظ کے بعد بجا طور پر خاتمۂ شعراے بزرگ زبانِ فارسی ہونے کا فخر حاصل ہے، سرزمینِ ایران میں کیوں اس قدر و منزلت کے مستحق قرار نہیں دئے گئے، جو انھیں ترکی اور ہندوستان وغیرہ میں نصیب ہوئی، میرزا قزوینی کے نزدیک اس عدم مقبولیت کے اسباب جامی کی شخصیت کے بعض پہلوؤں میں تلاش کرنے چاہئیں ان کی رائے میں اس قدر ناشناسی کا سب سے بڑا سبب یہ ہو کہ جامی باوجود تصوف و عرفان کے مسلک کی طرف مائل ہوئے اور ایک مقطع میں یہ دعویٰ کرنے کے

زہفتاد و دو مذہب کرد جامی رو بعشق تو
بلے عاشق نماند مذہبے جز ترک مذہبہا

یہی نہیں کہ تعصب سے خالی نہیں ہیں بلکہ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ سخت متعصب ہیں، اور اس قیاس کیلئے ہمارے پاس کئی قرینے ہیں، ایک تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب نفحات الانس میں ان تمام بزرگوں کا تذکرہ کیا ہے، جن کا تعلق صوفیوں کے گروہ سے ہے، یہاں تک کہ ان لوگوں کا بھی ذکر کیا ہے، جنھیں مجذوب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے لیکن اگر کسی کا مستقل طور سے ذکر نہیں کیا، تو ان مشاہیر صوفیہ کا نہیں کیا، جو شیعہ ہیں مثلاً سید نعمت اللہ کرمانی، شیخ آذری، سید محمد نوربخش اور شیخ صفی الدین اردبیلی، اگرچہ بعض مقامات پر ان بزرگوں کا ذکر ضمنی طور پر آگیا ہے، بہارستان میں آذری پر ایک مختصر نوٹ کے دوران میں لکھتے ہیں،

"در اشعار وے طامات بسیار است"

ان کے مقابلہ میں دولت شاہ اگرچہ خود سُنّی ہے، اور ماوراء النہر کا رہنے والا ہے، جہاں کے باشندے تعصب کے لئے مشہور رہیں تاہم چونکہ وہ ایک پاک دل اور عارف مشرب اور تعصب سے خالی ہے، اس لئے اُس نے اپنے تذکرۃ الشعراء میں سید نعمت اللہ ولی اور شیخ آذری کا مفصل حال بڑے احترام کے ساتھ لکھا ہے اور اگر اُس کے تذکرہ میں شیخ صفی الدین اور سید محمد نوربخش جگہ نہیں پا سکے، تو اُس کی وجہ فقط یہ ہے کہ اُن کا شمار شعراء کے زمرہ میں نہیں ہے، جب ایک عام قاری جس کا دل تعصبات مذہبی سے بالکل خالی ہے، جامی کی کتابوں میں یہ چیزیں مشاہدہ کرتا ہے، اور اس کے بعد یہ بھی دیکھتا ہے کہ اپنی نثر و نظم کی کتابوں میں جہاں کہیں جامی کو موقع ملتا ہے وہ شیعہ کی طعن و قدح کرنے اور ان کو رافضی، روافض اور رفضہ کے نام سے یاد کرنے میں کوتاہی نہیں کرتے، اور ان سب باتوں پر طرفہ یہ کہ ایک طرف تو جامی حضرات امیر اور اہل بیت کی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں، اور امیر علیہ السلام، امام حسینؑ اور امام علی رضا کی شان میں قصیدے لکھتے ہیں، اور دوسری طرف حضرت امیر کے والد ابوطالب کا مقر، ابولہب کی طرح سقر بتاتے ہیں، یہ صورت حال دیکھ کر ایک قاری حیران رہ جاتا ہے اور اس کو حضرت امیر کے متعلق جامی کے دعوی خلوص کی صداقت میں ایک

حد تک شک و شبہ ہونے لگتا ہے۔

میرزا قزوینی کے بیانات میں ایک حیرت انگیز تضاد پایا جاتا ہے، ایک طرف تو اُن کی رائے میں ایران میں جامی کی عدم مقبولیت کا سبب اُن کا مذہبی تعصب ہی اور دوسری طرف وہ اس بات کی اُمّید ظاہر کرتے ہیں کہ "آقا علی اصغر حکمت کی مساعی سے جامی جو "شاعر فحل فاضل دانشمند ہیں، اور حافظ کے بعد جنھیں خاتمۂ شعرائے بزرگ زبانِ فارسی" سمجھنا چاہئے۔ اپنے ہم وطنوں کے دلوں میں اگرچہ وہ اُن کے ہم مشرب نہیں ہیں، وہی قدر و منزلت دوبارہ حاصل کریں گے، جس کے وہ قرار واقعی مستحق ہیں، اور جس سے وہ صفویوں کے عہد میں تعصباتِ مذہبی و تبلیغاتِ تعمدی کی بنا پر محروم کردئے گئے تھے، اور آقائے حکمت کی بدولت اس ادبی بے انصافی اور ظلم کی تلافی کی طرف پہلا قدم اٹھایا گیا ہے، اس سلسلہ میں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ مرزا قزوینی مسلمانو کے تمام فرقوں کے درمیان اتحاد و اتّفاق کے حامی ہیں، اور تعصّب کی مذمّت میں مولانا روم اور شیخ عطّار کے اشعار بھی نقل کرتے ہیں، حالانکہ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ تذکرۃ الاولیاء کے انتقادی مقدمہ میں مظہر العجائب اور لسان الغیب جیسی جعلی کتابوں کی شہادت پر وہ عطّار کو ایک غالی شیعہ ثابت کرچکے ہیں،

آقا حکمت جو خود وسیع المشرب ہیں اور جن کا مسلک اعتدال اور "میانہ روی ہے، بجا طور پر فرماتے ہیں (ص ۱۵) کہ چونکہ جامی، متعصّب روافض پر طعن و انتقاد کرتے تھے، اس لئے صفوی سلاطین کے یہاں وہ مقبول نہ ہوسکے، تاہم شاہ اسمٰعیل اوّل کے زمانے میں جامی کی جلالتِ قدر کا انکار نہیں کیا جاسکا، شاہ اسمٰعیل کا بیٹا سام مرزا اپنے تذکرۂ تحفہ سامی میں جامی کی تعریف اس عقیدتمندانہ انداز میں کرتا ہے "جامی از غایت علو فطرت و نہایت حدت احتیاج بتقریر حال و تبیین مقال ندارد چہ پرتو فضائل او از شرق تا باقصای غرب رسیدہ و خوان نوال افضالش از کران تا کران کشیدہ "۔

یہی سام مرزا اہل بیت کی محبت کے سلسلے میں جامی کے چند اشعار نقل کرتا

ہے، جن میں سے دو ہدیۂ قارئین کیے جاتے ہیں،

این نہ رفضست محض ایمانست — رسم معروف اہل عرفانست
رفض اگر ہست حُبِ آل نبی — رفض فرضست بر ذکی و غبی

اگرچہ مرزا قزوینی کا پایہ بحیثیت محقق کے بہت بلند ہے، اور یورپ کے فضلا مثلاً براؤن، اور نکلسن ان کے خرمن علم کے خوشہ چین رہ چکے ہیں، تاہم یہ امر قابل غور ہے کہ بعض اوقات اپنے مذہبی میلانات کی کارفرمائی کی بدولت وہ اپنے بلند مقام سے نیچے اُتر کر ایک معدوم چیز کو حقیقی لباس میں جلوہ گر دیکھنے کے آرزومند ہیں، حضرت امیر علیہ السّلام کی شان میں حافظ کی طرف ایک غزل "اے دل غلام شاہ جہاں باش و شاہ باش" اور ایک قصیدہ "مقتدری کہ ز آثار صنع کرد اظہار" منسوب کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ مندرجۂ بالا غزل اور قصیدہ الحاقی ہیں، اور دیوان حافظ کے قدیم مخطوطوں میں ان کا سراغ نہیں ملتا، دورِ حاضر میں عبدالرحیم خلخالی اور حسین پژمان کے ایڈیشنوں میں جو قدیم ترین مخطوطوں پر مبنی ہیں، یہ درج نہیں، خود میرزا قزوینی نے ڈاکٹر قاسم غنی کے ساتھ مل کر دیوان حافظ کا ایک صحیح اور خوبصورت ایڈیشن مرتب کیا ہے، اس میں بھی اُن کو خارج کر دیا گیا ہے، تاہم مرزا قزوینی کی یہ دعا اور التجا ملاحظہ ہو کہ خدا کرے کہ یہ غزل اور قصیدہ خواجہ حافظ کا ہو، تاکہ اس کی نجات اُخروی ہو سکے۔

"باوجود اینکہ این قصیدہ و این غزل از بہترین اشعار نیست مع ذالک برائے نجاتِ اُخروی خواجہ باید آرزو کرد کہ ہر دو از خواجہ باشد و الحاقی از بعضے ہواخواہان خواجہ در عصر صفویہ برائے نجات دادن مقبرۂ او از تخریب متعصبین شیعہ نباشد" (بیست مقالہ جلد دوم ص۳۷)

اس ضمنی بحث سے اعراض کر کے ہم پھر شیخ عطار کے موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں، پروفیسر براؤن کی فرمائش پر میرزا قزوینی نے تذکرۃ الاولیاء پر انتقادی مقدمہ لکھا تھا، جس کی پروفیسر نکلسن نے اپنے انگریزی دیباچہ میں بہت تعریف کی ہے میرزا کی محققانہ شہرت کی بنا پر انگلستان میں براؤن نے اور ہندوستان میں مولانا شبلی

مرحوم نے اُن کے اعتقادی مقدمہ سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی اپنی قابلِ قدر تصنیف تاریخ ادبیات ایران، اور شعر العجم میں قزوینی کی تحقیقات کی صحت کو تسلیم کرلیا، یہ امتیاز قزوینی کی علمی فضیلت کے لئے شاہدِ عادل کا درجہ رکھتا ہے۔

یہ شرف ہندوستانی محقق کے لئے مخصوص تھا کہ وہ علامہ قزوینی سے مرعوب ہوئے بغیر شیخ عطار کی طرف منسوب کی ہوئی کتابوں کے جعل کا انکشاف کرے۔ اور اصل اور نقل کے درمیان حدِ فاصل قائم کرنے میں کامیاب ہو، قزوینی کے دو بڑے ماخذ مظہر العجائب اور لسان الغیب تھے، اور وہ ان کتابوں کی علمی وادبی کم مائگی کی تاویل بڑھاپے کی افسردگی، اور اضمحلال میں ڈھونڈتے تھے، جب تنقید شعر العجم کے دوران میں پروفیسر حافظ محمود شیرانی مرحوم نے عطار کے سوانح وحالات بیان کرنے اور اُن کے کلام پر تبصرہ کرنے کے لئے قلم اٹھایا، تو ان کی باریک بیں نگاہوں نے اس طلسم اور سراب کی حقیقت کو پہچان لیا اور ان کی تحقیق پسند طبیعت علامہ قزوینی کے پیش کئے ہوئے عُذر کو قبول کرنے پر راضی نہ ہوسکی، ان کتابوں کی ادبی قدر وقیمت سے اگر قطع نظر بھی کرلی جائے، تو اُن کے مطالب کا مسئلہ بڑا اہم اور وقیع ہے، عطار ایک صوفی کامل اور عارف محقق ہیں، اور اُن کی وسیع المشربی کسی قسم کی تنگ نظری یا تنگ دلی کی متحمل نہیں ہوسکتی، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی تصانیف مثلاً مصیبت نامہ اور منطق الطیر وغیرہ میں تعصب کی سخت مذمت کرتے ہیں، صحابۂ کرام کے لئے اُن کے دل میں بے حد احترام ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اہلِ بیت کی محبت نے اُن کو گرویدہ بنا رکھا ہے، (ص ۱۰) یہ وہ حقیقت ہے کہ جس کا اظہار انھوں نے تذکرۃ الاولیاء کے ابتدائی حصہ میں بھی کیا ہے، سب سے پہلے امام جعفر صادق کا ترجمہ دیا ہے، اور بعد میں امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے حالات دئے ہیں، یہ کتاب علامہ قزوینی کی تحقیق کی رو سے سنہ ۶۱۶ھ سے ذرا قبل لکھی گئی ہے، اور اس کے بعض حصے سنہ ۶۱۷ ہجری یا اس کے بعد لکھے گئے ہیں، عطار کے سنہ وفات کے بارے میں تذکرہ نگاروں میں کافی اختلاف ہے، لیکن اکثریت سنہ ۶۲۷ھ کے حق میں ہے، اب یہ باور کرنا ذرا مشکل ہے کہ عطار جیسا وسیع المشرب بزرگ عمر بھر تعصب کی مذمت

گرنے کے بعد خود اس کے دام میں گرفتار ہو کر اپنے تمام کارناموں کو نسیاً منسیاً کر دیے یہ اسباب تھے، جنھوں نے شیرانی صاحب کے دل میں ان کتابوں کی اصلیت کے متعلق شکوک و شبہات پیدا کر دیئے، اور اُن کو اس میدان میں تحقیق و جستجو کرنے پر آمادہ کیا،

شیرانی صاحب کی تحقیق کے مطابق عطار کی مندرجہ ذیل کتابیں ہر قسم کے شک شبہ سے پاک ہیں،

(۱) اسرار نامہ (۲) الٰہی نامہ (۳) پندنامہ (۴) تذکرۃ الاولیاء (۵) خسرونامہ (۶) دیوان (۷) شرح القلب (۸) منطق الطیر (۹) مصیبت نامہ (۱۰) مختارنامہ۔

جہاں شیرانی صاحب نے شعر العجم کے بعض بیانات کی تصحیح کی ہے، وہاں انھوں نے عطار کی اصلی تصنیفات کی مدد سے عطار کے سوانح و حالات جمع کرنے کی کوشش بھی کی ہے، اور اُن کی شاعری پر مفصل اور سیر حاصل تبصرہ بھی کیا ہے، لیکن اس سلسلہ میں ان کا بڑا تعمیری کام اُن کتابوں کا جائزہ لینا ہے، جو غلط طور پر عطار کی طرف منسوب ہیں، انھوں نے کامل تحقیق کے بعد بتایا کہ اُن میں سے بعض کتابوں کے حقیقی مالک دوسرے ہیں، اور بعض ایسی ہیں جن کا مصنف کوئی جعلی عطار ہے، اول الذکر زمرے میں کنز الحقائق، اسرار الشہود خیاط نامہ، کنز الاسرار اور وصلت نامہ ہیں، کنز الحقائق کے مصنف پہلوان محمود بن پوریائے ولی، اسرار الشہود کے شمس الدین محمد لاہجی اسیری شارح گلشن راز، خیاط نامہ کے خیاط کاشانی، کنز الاسرار کے تربتی اور وصلت نامہ کے شیخ بہلول ہیں، مفتاح الفتوح علامہ قزوینی کی تحقیق کے مطابق کسی زنجانی کی تصنیف ہے لیکن شیرانی صاحب کے نزدیک درحقیقت یہ ایک سرقہ ہے، اور صرف منظوم دیباچہ زنجانی کی محنت کا ثمرہ ہے، اور باقی سب غزلیں عطار کی ہیں، شیرانی صاحب کو تعجب ہے کہ یہ مقدس سرقہ ابھی تک طشت از بام نہیں ہوا، منصور نامہ یا حلاج نامہ وصلت نامہ کی ایک حکایت ہے، اور بیسر نامہ کا اکثر مواد منصور نامہ سے لیا گیا ہے، یہ منصور نامہ کی مسخ شدہ شکل ہے، تنقید شعر العجم لکھتے وقت شیرانی صاحب کو لسان الغیب کا کوئی نسخہ نہ مل سکا، لیکن ان کے ادب نواز دوست پروفیسر سراج الدین آذر

کے توسط سے مظہر العجائب کے ایک چھوڑ تین نسخے دستیاب ہو گئے، یوں تو شیرانی صاحب نے جوہر الذات اور ہیلاج نامہ پر ایک ناقدانہ تبصرہ کیا ہے جس کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے، لیکن جس قابلیت، ژرف نگاہی اور جامعیت کے ساتھ انھوں نے مظہر العجائب کے مُصنّف کے دجل و فریب کا پردہ چاک کیا ہے، وہ ہر قسم کی تحسین و آفرین کے سزاوار ہیں، مظہر العجائب کے اشعار کی تعداد نو یا دس ہزار کے قریب ہو گی، یہ کتاب ذو بحرین ہے، زیادہ تر حصّہ بحر رمل مسدّس میں لکھا گیا ہے ایک ایسا حصّہ بھی ہے، جس میں بحر ہزج میں دادِ سخنوری دی گئی ہے، عطّار کی عادت کے برخلاف مظہر العجائب میں مُصنّف اپنے متعلق بہت سی باتیں بتاتا ہے، شیرانی صاحب نے ایک جامع اور محققانہ تبصرہ میں وہ تمام اسباب بیان کر دئے ہیں جن کی بنا پر وہ مظہر العجائب کو عطّار کی تصنیف ماننے کے لئے تیار نہیں، اس کی زبان عطّار کے حقیقی کلام سے کوئی نسبت نہیں رکھتی، تاریخی لحاظ سے اس میں متعدد خامیاں پائی جاتی ہیں،

سب سے اہم مصنّف کے مذہبی عقائد ہیں، جو عطّار کے عقائد سے بالکل مختلف ہیں، ان اور دوسرے اسباب پر پورے استقصاد کے ساتھ بحث کرنے کے بعد شیرانی صاحب لکھتے ہیں کہ "اگر اب بھی اس جعلی عطّار کے متعلق شبہ ہے تو ذیل کے ابیات پر غور کر لیا جائے،

شعر حافظ خوان و با قاسم نشین — زانکہ ایشانند با ملا قرین
بعد من اسرار ایشان گوش کن — روز جنّت عشق شان می نوش کن

اس پیشین گوئی کا ذکر کرنے کے بعد شیرانی صاحب لکھتے ہیں کہ یہ کتاب نویں صدی ہجری کے نصف اوّل کے خاتمہ کے بعد کسی وقت لکھی گئی ہے، بلکہ میں دسویں قرن کے ربع اوّل میں اس کا زمانہ ماننے کے لئے آمادہ ہوں"، غرض اُن کی رائے میں مظہر العجائب کا مصنّف کوئی بہروپیا ہے جس نے خاص مقاصد کو مدّ نظر رکھ کر شیخ عطّار کا سوانگ بھر لیا ہے، چونکہ اُس کے پاس نہ عطّار کا دماغ ہے، نہ ان کی طبیعت

اور نہ علمیت، اس لئے یہ تمام اضمحلال ہے، اور اس لئے خیالات ہیں اس قدر ابتذال اور عبارت ہیں خامیاں جس کے پڑھنے سے طبیعت متنفر ہو جاتی ہے۔"

جوہر الذات اور ہیلاج نامہ اگرچہ دو علاحدہ مثنویاں ہیں، شیرانی صاحب نے اتحاد مضامین کے بپیشِ نظر ان دونوں پر ایک ساتھ تبصرہ کیا ہے، اُن کے نزدیک "یہ مثنویاں عطار کی دیگر تصنیفات مثلاً الٰہی نامہ، اسرار نامہ، منطق الطیر او مصیبت نامہ کے ساتھ کوئی نسبت نہیں رکھتیں، فارسی ادبیات ہیں شاید اس قدر تھکا دینے والی غیر دلچسپ، کند اور دل اُچاٹ کر دینے والی کوئی کتاب نہ ہوگی، جیسی یہ کتابیں حقیقت یہ ہے کہ باوجود کوشش بلیغ میں ان مثنویوں کو پورا ختم نہ کر سکا،

اس دان مثنویوں کے مُصنّف، کو عربی آتی نہیں، مجھ کو اس کی فارسی دانی ہیں بھی شک ہے، ہمارا ناظم صرف الفاظ کو وزن کا جامہ پہنانا جانتا ہے، قافیہ کا بھی چنداں پابند نہیں، مل گیا تو خیر، نہ ملا تو وزن پر ہی گزارا کر لیا۔"

جو صاحب اس اجمال کی تفصیل دیکھنا چاہیں، انھیں تنقید شعر العجم کا مطالعہ کرنا چاہیئے، تاکہ انھیں جوہر الذات اور ہیلاج نامہ کے مُصنّف کی بے بضاعتی اور شیرانی صاحب کے علمی تبحر کا اندازہ ہو سکے۔

یہ ایک افسوسناک امر ہے کہ اُردو زبان ہیں علمی تحقیقات کا سرمایہ ہندوستان سے باہر ملکوں ہیں محض اس وجہ سے خراج تحسین حاصل نہیں کر سکتا کہ وہاں اُردو زبان سمجھی نہیں جاتی، اور ہمارے علماء کی تحقیقات اجنبی فضلاء کی نظروں سے اوجھل رہتی ہیں، اس سلسلہ ہیں مولانا شبلی خوش قسمت ہیں کہ پروفیسر براؤن نے اپنے قابل ہندوستانی شاگردوں کی اعانت سے شعر العجم سے استفادہ کیا، اور مولانا شبلی کی قابلیت اور محنت کی دل کھول کر داد دی، فردوسی، انوری اور عطار پر جو فاضلانہ مقالے شیرانی صاحب نے لکھے ہیں، اگر ان کا ترجمہ انگریزی یا فارسی زبان ہیں کیا جاتا تو ایران و فرنگ کے علماء اس نامور محقق کے خرمنِ علم و تحقیق سے خوشہ چینی کر سکتے اور ہندوستانی علماء کی بلند پایہ تحقیقات کی داد دے سکتے یہ ایک عجیب حُسن اتفاق

ہے کہ ۱۹۲۷ء میں رسالہ اُردو کے صفحات پر علمی تحقیقات کی روشنی میں جن امور و نتائج کا اعلان شیرانی صاحب نے کیا، اس سے ملتی جلتی تحقیقات کا ماحصل آج سے چند سال پیشتر ایران کے فاضل پروفیسر آقا سعید نفیسی نے طہران سے شائع کیا، میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب آقائے نفیسی کی قابلِ قدر کتاب "جستجو در احوال و آثار فرید الدین عطار نیشاپوری" میرے مطالعہ میں آئی ہیں نے فرطِ مسرت میں اپنے مرحوم استاد کو یہ مژدہ سنایا، اور اُن کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے فوراً کتاب کا ایک نسخہ خدمت عالی میں بھجوا دیا، شیرانی صاحب کی دقّتِ نظر سے کتاب کے بعض کمزور پہلو نہ بچ سکے اور انھوں نے اپنے ایک خط میں ان کی طرف اشارہ کیا، میرا ارادہ ہے کہ اس مضمون کے آخر میں شیرانی صاحب کے اس خط کا متعلّقہ حصّہ شائع کر دوں۔

پیشتر اس کے کہ ہم آقائے نفیسی کی کتاب کا خلاصہ پیش کریں، ایران کے اس نامور فرزند کے علمی کارناموں کا ایک مختصر سا تعارف ضروری معلوم ہوتا ہے، اگرچہ فارسی زبان کے موجودہ شعراء کے حلقہ میں آقائے نفیسی ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں، تاہم اُن کی شہرت کا دار و مدار زیادہ تر اُن کی علمی تحقیقات و تصانیف پر ہے، ایران کے نابینا شاعر رودکی کے احوال و اشعار پر اُن کی دو جلدوں نے انھیں علمی حلقوں سے روشناس کرا دیا، اس کی تیسری جلد جو انھوں نے کئی سال کے بعد شائع کی ہے، بلامبالغہ رودکی کے متعلق معلومات کی انسائیکلوپیڈیا ہے، جس میں ان تمام مقالوں کو فارسی زبان میں ترجمہ کے ذریعہ یکجا کر دیا گیا ہے، جو اس شاعر کے سوانح و کلام پر دُنیا کی مختلف زبانوں میں لکھے گئے ہیں۔ اور متعدّد ذرائع سے خوشہ چینی کر کے رودکی کے کلام کو جمع کر دیا گیا ہے، اس کتاب کے علاوہ آقائے نفیسی کئی تصانیف کے مالک ہیں کئی کتابوں کا ترجمہ کر چکے ہیں، اور کئی کتابیں بڑی محنت اور قابلیت سے ایڈٹ کر چکے ہیں، چند ماہ پیشتر جب وہ ہندوستان کے علمی مرکزوں کا دورہ کر رہے تھے، تو انھوں نے بمبئی کی مختلف انجمنوں کی سرپرستی میں مختلف مضامین پر کئی فاضلانہ تقریریں کیں، ہم اُن کے بڑے ممنون ہیں کہ اپنی

گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود انھوں نے ہماری درخواست کو شرفِ قبولیت بخشا، اور اسماعیل یوسف کالج اندھیری کے مجمع الادب کے ارکان کے سامنے ہند وایران کے علمی وثقافتی روابط پر ایک پُر مغز، اور عالمانہ تقریر کی، اُن کی محنت اور قابلیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اُن کے اپنے بیان کے مطابق ان کی کئی کتابیں زیرِ طبع ہیں، اور کئی تصانیف کے مسودے اُن کے پاس تیار رہیں،

عطّار کا دیوان شائع کرتے وقت اُس کے دیباچہ میں آقائے نفیسی نے عطّار کے احوال وتصانیف پر ایک کتاب لکھنے کا وعدہ کیا تھا، عطّار پر موجودہ کتاب گویا ایک ایفائے عہد ہے، انھیں میدانِ تحقیق کی تنگی کی بجا طور پر شکایت ہے، کیونکہ نویں صدی سے پہلے کے ماخذ دستیاب نہیں، اور اگرچہ فاضل پروفیسر اپنی تحقیقات سے پوری طرح مطمئن نہیں تاہم انھیں اُمّید ہے کہ اس راستہ میں جو قدم اٹھایا گیا ہے وہ دوسروں کے لئے ایک حد تک ممّد ہوگا۔

دیباچہ میں انھوں نے اپنے مخصوص ادبی انداز میں عالم کائنات کی ناپائداری اور تصوّف کی اہمیّت اور ہمہ گیری کا تذکرہ کیا ہے، اُن کے سامنے وہ تمام مقدّمات ہیں جو عطّار کے سوانحِ حیات کے متعلق مستشرقین یا فضلائے ایران کے قلم کا نتیجہ ہیں، اس کے علاوہ اُن کے زیرِ مطالعہ وہ تمام کتابیں یا تذکرے ہیں، جن میں صوفیائے کرام کے حالات درج ہیں، چونکہ اُن میں سے کوئی ایک بھی جامع اور کافی نہیں، اور ان کے تمام مطالب بھی صحیح اور درست نہیں، اس لئے آقائے نفیسی نے کوشش کی ہے کہ وہ حتی المقدور عطّار کے صحیح حالات قارئین کے سامنے پیش کریں،

شیخ عطّار کا نام ونسب اور خاندان، اُن کی تاریخ ولادت اور عُمر کی مدّت، اُن کا زمانہ، اُن کے سوانحِ حیات اُن کی تاریخ وفات کی تعیین، ان کا مزار، کئی دوسرے عطّار، عطّار کا درجہ، اُن کے عقائد اور افکار، اُن کی تصانیف، نویں صدی کا ایک دوسرا عطّار، آقائے نفیسی کی کتاب کے اہم موضوع ہیں، آخر میں ایک تکملہ ہے اور اس کے بعد کئی فہرستیں ہیں، اور غلط نامہ، ان مختلف موضوعوں پر آقائے نفیسی نے تحقیق

کا حق پوری طرح ادا کیا ہے، اور بہت سی غلط اور نادرست باتوں کی تردید کی ہے، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

عطّار کا لقب فریدالدّین غالباً تمام ماخذوں میں درج ہے، ایّام جوانی میں عطّار نے فرید بطور تخلص بھی استعمال کیا ہے، چنانچہ ۸۲ غزلوں میں یہی تخلّص فرید پایا جاتا ہے، کبھی کبھی مثنویوں میں بھی فرید کا استعمال ملتا ہے، مصیبت نامہ کے آخر میں کہتے ہیں،

ایں چہ شوراست از تو در جان اے فرید

نعرہ زن از صد زبان هل من مزید

عطّار کا صحیح نام و نسب فریدالدّین ابوحامد محمّد بن ابوبکر ابراھیم بن اسحاق نیشاپوری ہے، آقای نفیسی نے لقب زین الدّین اور کنّیت ابوطالب کو غلط ٹھہرایا ہے، حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں ایک مقام پر عطّار کے پردادا کا نام شعبان لکھا ہے، اس قسم کے ناموں کے متعلّق آقائے نفیسی نے بڑی مفید اطّلاع بہم پہنچائی ہے، اُن کے نزدیک حاجی خلیفہ کا یہ قول درست نہیں، کیونکہ چھٹی اور ساتویں صدی میں اس قسم کے ناموں کا ایران میں رواج نہ تھا۔ یہ دہقانیوں کی رسم ہے، جو بہت بعد کے زمانہ میں رائج ہوئی، جس مہینہ میں اُن کے یہاں بیٹا پیدا ہوتا ہے اس مہینہ کے نام سے اپنے بچوں کو یاد کرتے ہیں، مثلاً محرّم، صفر، ربیع، رجب، رمضان، اور شعبان، جہاں تک ایرانی فاضل کی معلومات کا تعلق ہے، وہ کہہ سکتے ہیں کہ آٹھویں صدی کے آخر اور نویں صدی کے آغاز میں یہ رواج مغربی ایشیا بالخصوص ایشیاے کوچک سرزمین عثمانی اور مصر میں شروع ہوا، اور ان ممالک سے دوسرے ملکوں میں پہنچا، آج بھی ایران میں اس قسم کے نام دہقانیوں کے یہاں ملتے ہیں، اور شریف خاندانوں اور علماء کے گروہ میں ان ناموں کا رواج نہیں،

عطّار کے والد کا پیشہ بھی عطّاری تھا، اور وہ اپنے والد کی دوکان پر ہی بیٹھتے تھے، عطّار کی اولاد کے بارے میں صحیح اطّلاع مفقود ہے، تاہم آقائے نفیسی بڑے یقین اور اذعان کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ عطّار کا ایک بیٹا ضیاءالدّین یوسف نامی تھا جس کو عطّار بلبل نامہ کے خاتمہ میں نصیحت کرتے ہیں، اور جس کی عمر اس وقت چار سال تھی، یہ عجیب

اتّفاق ہے کہ علّامہ شیرانی بھی بلبل نامہ کے مطالعہ سے شروع میں اسی نتیجہ پر پہنچے تھے، اگرچہ انھوں نے اپنا شک اس طرح ظاہر بھی کر دیا تھا،

"مختلف بلبل ناموں کے خاتموں میں اشعارِ بالا میری نظر سے گذرے ہیں، تاہم مجھ کو یقین نہیں آتا کہ یہ عطّار کے قلم سے نکلے ہیں"۔ (تنقید شعر العجم ص ۳۷۰)

شیرانی صاحب کا قیاس بالکل درست نکلا، کیونکہ جیسا کہ انھوں نے تنقید کے اسی صفحہ کے ذیلی حاشیہ میں لکھا ہے، یہ اشعار مولانا جامی کے ہیں، اور ان کی مثنوی تحفۃ الاحرار (مقالہ بستم در پند دادن فرزند ارجمند) میں موجود ہیں، ضیاء الدّین یوسف جامی کے فرزند کا نام ہے،

دولت شاہ نے عطّار کی تاریخ ولادت ۵۱۳ھ بتائی ہے، اور بعد کے تذکرہ نگاروں نے عام طور پر اسی کو نقل کیا ہے، لیکن آقائے نفیسی کی تحقیق یہ ہے کہ عطّار ۵۳۷ھ کے قریب عالم وجود میں آئے، دولت شاہ عطّار کو دراصل کدکن کا باشندہ بتاتے ہیں (کدکن نیشاپور کے پاس ایک گاؤں ہے) اور عطّار کے مزار پر جو کتبہ ہے اور نویں صدی کے آخر ربع کی یادگار ہے اس کی رو سے عطّار کی جائے ولادت راوند ہے، اور جائے سکونت کدکن ہے، آقائے نفیسی کی رائے میں یہ لفظ زروند نہیں بلکہ زوریلد ہے، جس کے دوسرے نام غالباً طریثیث، ترشیش اور ترشیز ہیں، آقائے نفیسی نے کدکن، نیشاپور اور شادیاخ کے متعلق بہت قیمتی معلومات فراہم کی ہیں، اگر ۵۱۳ھ کو عطّار کی تاریخِ ولادت تسلیم کر لیا جائے، تو ان کی مدّت عمر ۱۱۴ سال ہوتی ہے، اور اتنی لمبی عمر مستثنیات میں سے ہے، اس کے علاوہ عطّار اپنے اشعار میں نوّے سال کا ذکر کرتے ہیں، اس تاریخ کو دُرست قرار نہ دینے کے لئے آقائے نفیسی کے نزدیک ایک بڑا قرینہ یہ ہے کہ عطّار حضرت نجم الدّین کبریٰ کے شاگردوں اور اصحاب میں سے ہیں جن کی تاریخِ ولادت ۵۴۰ھ ہے، یہاں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ عطّار جو عمر میں ستائیس سال حضرت نجم الدّین سے بڑے تھے، کیونکر اُن کے شاگردوں کے حلقہ میں داخل ہوئے یہ امر کہ عطّار نجم الدین کبریٰ کے شاگرد ہیں، محلِّ نظر ہے، اس لئے کہ آقائے نفیسی کے

بیان کی تائید صرف ایک ذریعہ سے ہوتی ہے، اور وہ کتاب ینابیع المودت ہے، جسے شیخ سلیمان بن شیخ ابراہیم معروف بخواجہ کلاں خاندانِ رسالت کے مناقب میں ۱۲۹۱ھ میں تالیف کرتے ہیں، یہ مصنف عطار کی کسی کتاب مظہر الصفات کے حوالہ سے ایک واقعہ نقل کرتا ہے جس میں عطار نجم الدین کبریٰ کو "شیخی و سندی" کے القاب سے یاد کرتے ہیں، یہ مظہر الصفات عطار کی ایک ایسی تصنیف ہے جس کا ذکر کسی دوسرے ماخذ میں نہیں ملتا۔ اب ایک ایسا شخص جو تیرھویں صدی کے آخر میں لکھ رہا ہے، محض اُس کے بیان پر بھروسہ کرکے اس انتساب کی صحت کو کیونکر تسلیم کیا جائے اگرچہ آقائے نفیسی کو پورا یقین ہے کہ یہ کتاب اب بھی ترکی میں کسی نہ کسی جگہ موجود ہونی چاہئے۔

عصرِ زندگی کے عُنوان کے تحت آقائے سعید نفیسی نے حضرت نجم الدین کبریٰ، امام مجد الدین خوارزمی بغدادی خواجہ سعد الدین خراسانی، قطب الدین حیدر اور شیخ رکن الدین اسکائی پر بڑے قیمتی اور پُر از معلومات نوٹ لکھے ہیں،

عطار کی توبہ کے واقعہ کو نفحات الانس تذکرۂ دولت شاہ اور دوسری کتابوں میں بڑے دلفریب طریقے پر بیان کیا گیا ہے لیکن آقائے نفیسی کا یہ خیال بالکل درست معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص فرید الدین عطار کی طرح ذوق و طبیعت رکھتا ہو، وہ خود بخود تصوف و عرفان کی طرف مائل ہوتا ہے اور اسے کسی کرامت یا کرشمے کی ضرورت نہیں پڑتی،

عطار کی تاریخِ وفات کے متعلق ایک عجیب اختلاف ہے، اور ۵۸۶ھ سے ۶۲۷ھ تک بیس مختلف اقوال ہیں لیکن پوری چھان بین کے بعد آقائے نفیسی ۶۲۷ھ کے حق میں اپنی رائے دیتے ہیں، دولت شاہ کا بیان ہے کہ عطار کی قبر شادیاخ کے باہر ہے، اور اس پر قاضی صاعد بن یحییٰ نے ایک عمارت بنوائی تھی، لیکن اس کے بعد امیر علی شیر نوائی نے دوبارہ عمارت تعمیر کرائی، اس عمارت کے کتبہ کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

چونکہ تاریخ اسلامی میں کئی بزرگ عطّار کے لقب سے مشہور رہ چکے ہیں، اس لئے آقائے نفیسی نے ان میں سے بعض کا ذکر کیا ہے، مثلاً علاء الدین محمد بن محمد عطّار بخاری، عطّار طوسی، ابوزکریا یحییٰ بن علی بن سلیمان معروف بہ ابن العطّار، ابوالعباس محمد بن احمد عطّار بغدادی خواجہ حسن عطار، حافظ ابوالعلا، حسن بن احمد بن حسن بن محمد عطار ہمدانی وغیرہ،

عطّار کے عقائد و افکار پر آقائے نفیسی نے بڑی تحقیق اور جامعیت کے ساتھ بحث کی ہے، اس بحث کا ایک مختصر خلاصہ قارئینِ کرام کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے،

مجالس المومنین کے مُصنّف نے جو اپنی شیعہ تراشی کے لئے مشہور ہیں عطّار کو شیعہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، عطّار کی بعض مثنویوں میں سے جو حال ہی میں طہران میں طبع کی گئی ہیں، تین خلفاء کے مناقب کو حذف کر دیا گیا ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر دقتِ نظر سے عطّار کی تصانیف کا مطالعہ کیا جائے، تو معلوم ہوتا ہے کہ مراحلِ طریقت پر ان کا پورا ایمان ہے اور دُنیاوی تعلّقات سے بے نیاز ہیں، یہ اُن کی کامل بے نیازی اور وارستگی ہے، جو اُن سے یہ کہلواتی ہے:-

کفر کافر را و دین دیندار را   ذرّہ دردت دلِ عطّار را

منطق الطیر میں سُنّی اور شیعہ دونوں گروہوں کے تعصّب کی سخت مذمّت کرتے ہیں، اسی طرح اسرار نامہ میں فرماتے ہیں:-

ولے از ابلہی پر زرق و پر مکر   گرفتار علی ماندی و بوبکر

گہے این یک بود نزد تو مقبول   گہی آن یک بود از کار معزول

گر این بہتر و ر آن بہتر ترا چہ   کہ تو چون حلقہ ای بر در ترا چہ

ہمہ عمر اندرین محنت نشستی   ندانم تا خدا را کے پرستی

ایران میں اہل سنّت نے دوازدہ امام کی نسبت کبھی تندی اور سختی نہیں کی، اور ایک بین فرق جو ایران کے تسنّن اور دوسرے اسلامی ممالک کے تسنّن

میں ہے، وہ اسی چیز میں ہے، دوسری طرف صفوی عہد سے قبل شیعیان ایران نے پہلے تین خلفاء اور صحابہ کی نسبت بد زبانی سے کام نہیں لیا،

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فروع کے معاملہ میں عطّار تسنّن کے طریقہ کے پابند تھے خسرو و گل کے مقدمہ میں امام اعظم ابو حنیفہ، امام محمّد قرشی، اور امام اعظم شافعی کی مدح میں اشعار ہیں، تمام مثنویات کے مقدمہ میں چار خلفاء کی مدح و تعریف کی گئی ہے لیکن طہران والے ایڈیشن میں جو ۱۳۰۹ھ میں شائع کیا گیا۔ ان اشعار کو عمداً حذف کر دیا گیا ہے منطق الطیر، الہٰی نامہ، اسرار نامہ، مصیبت نامہ کے چاپ ایران میں سے پہلے تین خلفاء کی مدح کو خارج کر دیا گیا ہے، طریقت میں عطّار حضرت نجم الدّین کبریٰ کے سلسلۂ کبرویہ میں منسلک تھے، بعض انھیں اویسی طریقہ کا پابند بتاتے ہیں، لیکن یہ دُرست نہیں، عطّار کے اشعار اور غزلیات سے یہ بات خاص طور پر ہویدا ہوتی ہے کہ انھیں حسین بن منصور حلاج سے خاص عقیدت تھی، اپنے اشعار میں اس کا نام بار بار لیتے ہیں، اور اس کی زندگی، اور انجام کی شرح اپنی غزلیات میں کرتے ہیں، اُن کی تصانیف پر نظر ڈالنے سے یہ حقیقت بھی آشکارا ہو جاتی ہے کہ وہ بڑے محقّق تھے اور تاریخ سے انھیں پوری آگاہی تھی، اور اپنی مثنویوں میں ایران کے مشاہیر و اکابر مثلاً محمود غزنوی، نظام الملک طوسی، سلطان سنجر، مسعود غزنوی، احمد بن حسن میمندی، عبداللہ بن طاہر، نصر بن احمد سامانی نوح بن منصور، فردوسی، فخر الدّین اسعد گرگانی، رودکی، رابعہ دختر کعب قزداری (ایران کی مشہور شاعرہ)، اور ابو الفضل چغانی کے متعلق کئی حکایتیں لکھی ہیں، اخلاقی اور عرفانی مطالب کے علاوہ عطّار کی تصنیفات بہت سے تاریخی فوائد اور عمدہ مطالب سے پُر ہیں، شیخ عطّار سنائی سے متاثر نظر آتے ہیں، عالی جناب رومی سنائی اور عطّار دونوں کو اپنا پیشرو مانتے ہیں، اور اُن سے استفادہ کرتے ہیں۔

تصنیفات عطّار | عطّار کی تصانیف کے متعلق مُبالغہ آمیز بیان قاضی نور اللہ شوستری کا یہ ہے کہ ان کی تعداد قرآنی سورتوں کی تعداد کے مطابق ہے یعنی ۱۱۴، رضا قلی ہدایت ریاض العارفین میں ۱۱۴ پر اکتفا کرتے ہیں، لیکن مجمع الفصحاء میں یہ تعداد ۹۰ تک پہنچ

جاتی ہے۔ مندرجہ ذیل نو کتابیں جن کا نام وہ خود بیان کرتے ہیں، یقیناً عطار کی ہیں:
خسرو نامہ یا خسرو گل، اختیار نامہ یا مختار نامہ، اسرار نامہ، مصیبت نامہ، دیوان، جواہر نامہ، شرح القلب، الٰہی نامہ، مقامات طیور یا منطق الطیر، عطار کی تمام کتابوں پر آقائے نفیسی نے بحث کی ہے، اُن کے نزدیک اخوان الصفاء کو عطار سے کوئی نسبت نہیں، ارشاد بیان حقیقت میں وہی مفتاح الفتوح ہے، اشتر نامہ کسی اور عطار کی تصنیف ہے، اس کے ارشاد و افکار بہت پھسپھسے ہیں، بلبل نامہ کے اشعار ذرا سُست ہیں، اور عطار کے طرز سے انھیں کوئی علاقہ نہیں اس لئے احتمال ہے کہ یہ مثنوی بھی دوسرے عطار کی ہو، اس کتاب کے آخر میں شاعر اپنے چار سالہ بیٹے ضیاء الدین یوسف کو نصیحت کرتا ہے۔
بیسر نامہ کے اشعار سخت رکیک اور طفلانہ ہیں، اور یہ بھی دوسرے عطار کی تصنیف ہے، ترجمۃ الاحادیث کے اشعار بھی بہت سُست اور سخیف ہیں، غالباً اس کا مصنف وہی ہے، جس نے کنز الاسرار لکھی ہے، جواہر الذات ایک طویل مثنوی تقریباً بیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے، اس میں نہایت ہی مکروہ اور ناپسندیدہ تکرار ہے، ناممکن ہے کہ اس درجہ پست مثنوی عطار کی ہو، کہیں کہیں مصنف اسرار نامۂ عطار کے اشعار نقل کرتا ہے، حلاج نامہ جسے منصور نامہ بھی کہتے ہیں وہی ہیلاج نامہ ہے، جس کا ذکر بعد میں آئے گا، یہ جواہر الذات کے مُصنف کی تصنیف ہے، حیدر نامہ کا ذکر دولت شاہ سے دوسروں نے اخذ کیا ہے، معلوم نہیں کہ دولت شاہ کا کیا مأخذ ہے، کیونکہ ابھی تک اس کتاب کا سُراغ نہیں ملتا، خیاط نامہ کے اشعار بھی بہت سُست ہیں، ہو سکتا ہے کہ یہ کتاب بھی اسی شاعر کی ہوگی جس نے مظہر العجائب، لسان الغیب، اشتر نامہ، جواہر الذات، بیسر نامہ اور ہیلاج نامہ لکھا ہو (کشف الظنون کی سند پر شیرانی صاحب خیاط نامہ کو کسی خیاط کاشانی کی تصنیف بتاتے ہیں) کنز الاسرار کا مُصنف وہی شخص ہے جو ترجمۃ الاحادیث کا مالک ہے، شیرانی صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ اس کا مُصنف کوئی تربتی ہے، کنز الحقائق ایک جعلی

کتاب ہے، جو عطار کی طرف منسوب کی گئی ہے، اس شعر میں ینکو کو منکو پڑھ کر

امیر المومنین ینکو ست غازی کہ عدا با کافران شمشیر........

آقائے نفیسی اسے امیر منکوچ یا امیر منکوچک غازی بنا دیتے ہیں، جو الپ ارسلان کی جانب سے ۴۶۴ھ سے ارزنجان کا حاکم تھا لیکن یہ قیاس بالکل نادرست ہے، شیرانی صاحب کی تحقیق کے مطابق کنز الحقائق کا مصنف پہلوان محمد بن پوریالے ولی ہے، جس نے ۷۲۲ھ میں انتقال کیا، اور خیوق خوارزم میں مدفون ہے، آقائے نفیسی کی رائے میں گل و ہرمز کے متعلق شبہ ہے کہ وہ عطار کی تصنیف ہو، لسان الغیب ایک مثنوی ہے، جس کے اشعار کی تعداد ۸۰۰۰ کے قریب ہے، آقائے نفیسی لکھتے ہیں

"دربارۂ این شاعر مفتری کہ شیعۂ اثنا عشری بودہ وشعر را بسیار سست وسخیف می گفتہ است پس ازین ہم بحث خواہم کرد"۔

مظہر الصفات کا نام کسی فہرست میں نہیں ملتا، اس کا ذکر تنہا ینابیع المودۃ میں پایا جاتا ہے آقائے نفیسی اس کتاب کے انتساب کو درست ماننے کی طرف مائل ہیں لیکن ہمارے نزدیک ینابیع المودۃ کی سند کافی نہیں، مظہر العجائب تقریباً نوہزار ابیات پر مشتمل ہے، اس مثنوی کے اشعار بھی لسان الغیب اور جواہر الذات وغیرہ کی طرح بہت سست ہیں، اس کا مصنف بھی شیعہ ہے، اس کے متعلق بحث بعد میں آتی ہے مفتاح الفتوح ایک مثنوی ہے جس میں تقریباً بارہ سو اشعار ہیں، دو مختلف نسخوں کے خاتمہ میں تاریخ تصنیف جداگانہ دی گئی ہے، ایک میں ۵۸۳ھ اور دوسرے میں ۶۸۸ھ ہے، اس کتاب کے متعلق آقائے نفیسی کے بیانات بڑے دلچسپ اور متناقض ہیں، ان کے خیال میں اگر یہ مثنوی ۵۸۳ھ میں تصنیف ہوئی ہو تو فریدالدین عطار کی ہے، اور اگر ۶۸۸ھ میں تالیف ہوئی ہے، تو یہ عطار کی تصنیف نہیں ہو سکتی اس صورت میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس شخص کی تالیف ہے جو ترجمہ احادیث اور کنز الاسرار کا مصنف ہے لیکن مفتاح الفتوح کے اشعار کی طرح پھسپھسے نہیں، اور عطار کے اشعار سے بہت ملتے جلتے ہیں،

مطبوعہ نسخوں میں آغاز کے ۱۳۳ اشعار کے بعد عطار کی بعض غزلیں دی گئی ہیں، بحث کے خاتمہ پر آقائے نفیسی لکھتے ہیں کہ بظاہر اس کتاب کا مصنّف کوئی زنجانی ہے، وصلت نامہ ایک مثنوی ہے جس کا مصنّف کوئی شاعر بہلول تخلص ہے، ہفت وادی کوئی جداگانہ کتاب نہیں، بلکہ منطق الطیر کا ایک حصّہ ہے، جس میں طریقت کی سات وادیوں کی تشریح کی گئی ہے، ہیلاج نامہ بھی ایک مثنوی ہے، جس میں تقریباً سات ہزار اشعار ہیں، اس مثنوی کے اشعار بہت سُست ہیں، اور ناپسندیدہ تکرار بھی بہت ہے، جواہر الذات کا مصنّف ہی ہیلاج نامہ کا بھی مالک ہے،

اشعار کی سُستی اور فکر و اندیشہ کی خامی و کمزوری دونوں میں مشترک ہے، طرز و اسلوب کے علاوہ جو چیز ہمیں عطار کی طرف اس کتاب کے انتساب کو غلط ٹھہرانے پر مجبور کرتی ہے، وہ مصنّف کی حسین بن منصور حلاج کے بارے میں یاوہ گوئی، ہرزہ سرائی اور مضحکہ انگیز افسانوں کی بھرمار ہے، ظاہر ہے کہ شیخ عطار کا قلم ایسی بیہودہ باتیں نہیں لکھ سکتا، جب کہ عطار کی حلاج سے عقیدت ظاہر ہے، اور وہ تذکرۃ الاولیاء میں بڑے دلنشین پیرایہ میں حلاج کے حالات سپُردِ قلم کر چکے ہیں۔

وہ چھیاسٹھ تصانیف جو عطار کی کہلاتی ہیں، ان میں سے صرف بارہ اُن کی ہیں اور ان بارہ میں سے بھی تین ہم تک نہیں پہنچیں، اور وہ تین جواہر نامہ، شرح القلب اور مظہر الصفات ہیں، باقی نو کتابیں یہ ہیں، تذکرۃ الاولیا، اسرار نامہ، الٰہی نامہ، پند نامہ، خسرو نامہ، دیوان، مختار نامہ، مصیبت نامہ اور منطق الطیر، آقائے نفیسی کا خیال ہے کہ عطار کے اشعار کی تعداد کے متعلق دولت شاہ اور دوسرے تذکرہ نگاروں کے بیانات مبالغہ سے خالی نہیں، عطار کے اشعار میں تصوّف و عرفان و اخلاق و حکمت سے متعلق کثرت سے عمدہ معانی اور خیالات موجود ہیں، لیکن آقائے نفیسی نے قارئین کی توجہ ان لغوی فوائد کی طرف بھی مبذول

کرائی ہے، جو عطار کے اشعار کی بدولت ہمیں میسر آتے ہیں، فاضل پروفیسر نے فرہنگ رشیدی، سروری وجہانگیری میں عطار کے ان اشعار کا سراغ لگایا ہے جنھیں فرہنگ نگاروں نے بطور شواہد نقل کیا ہے، ان شواہد کی تعداد بہتّر کے قریب ہے، اور یہ تمام کے تمام اشعار عطار کی اصلی تصنیفات سے لئے گئے ہیں، اور ان مثنویوں میں سے نہیں جو مورد شک و شبہ ہیں، آقائے نفیسی اس بات کو اپنے دعویٰ کی تائید سمجھتے ہیں کہ جعلی مثنویوں میں سے استشہاد کے لئے اشعار منتخب نہیں کئے گئے۔

نویں صدی کا جعلی عطار گذشتہ صفحات میں پروفیسر نفیسی کی تحقیقات کا جو خلاصہ پیش کیا گیا ہے، اس سے قارئین اُن کی قابلیت اور جستجو کا اندازہ لگا سکتے ہیں، لیکن میری ناقص رائے میں اُن کی کتاب کا معرکہ آرا حصہ وہ ہے، جس میں انھوں نے اس جعلی عطار کو بے نقاب کیا ہے جس کے دامِ فریب میں بڑے بڑے فضلا مثلاً علامہ محمد قزوینی، مولانا شبلی مرحوم اور پروفیسر براؤن گرفتار رہے ہیں، اب ہم نہایت اختصار سے آقائے نفیسی کی مفصل بحث کا ماحصل پیش کریں گے۔

ہر وہ شخص جو شاعری کا تھوڑا بہت ذوق رکھتا ہو، اور جس کو فارسی زبان پر کچھ دسترس ہو جب بڑی بڑی ادبی کتابوں مثلاً منطق الطیر، مصیبت نامہ، الٰہی نامہ، اسرار نامہ، پند نامہ، خسرو نامہ، مختار نامہ میں سے ایک دو شعر پڑھے اور اس کے بعد لسان الغیب، اشتر نامہ، مظہر العجائب اور جواہر الذات کا بھی مطالعہ کرے تو سب سے پہلی چیز جو اس کی چشم و عقل کو خیرہ کرتی ہے، وہ اسلوب سخن، طرزِ فکر و بیان، سلیقہ و ذوق و طبع، معلومات و عقائد اور عواطف و احساسات کا بیّن فرق ہے، جو ان کتابوں کے دونوں سلسلوں کے درمیان نمایاں ہے، اگر کوئی شخص میری طرح دلیر اور بے پروا ہو تو اس صورت میں کہ دوسرے سلسلہ کی کتابوں پر خود فرید الدین عطار نیشاپوری کے دستخط بھی ہوں، وہ کہہ اٹھے گا کہ یہ بالکل محال ہے کہ ایک واحد شخص ان دونوں سلسلوں کا مصنف ہو، ایک نہایت ہی کمزور دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ دوسرا سلسلہ شاعر کے بڑھاپے کے اضمحلال و افسردگی کی یادگار ہے، یہ دلیل

بالکل غلط ہے، اس لئے کہ شاعر کا کلام عُمر کے ساتھ ساتھ زیادہ پختہ، ولولہ انگیز اور دل نشین ہوتا جاتا ہے، اگر عطار اس قاعدہ کی استثنار قائم کہتے ہیں، تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ایسا بھی ممکن ہے کہ بڑھاپے میں شاعر کی زبان بگڑ جائے، وہ فصیح الفاظ بھول جائے، اور اس کا تخیل اتنا پراگندہ اور بے بس ہو جائے کہ وہ لاطائل باتوں کے طول دینے میں پرگوئی اور بے مغزی کی داد دے جیسا کہ لسان الغیب اور مظہر العجائب وغیرہ میں نظر آتا ہے، کیا کسی دور اور کسی ملک میں یہ بات دیکھی گئی ہے کہ بڑھاپے کی وجہ سے فکر و بیان کی یہ درماندگی پیدا ہو جائے یا غلط قافیے، نادرست وزن اور بہت سکر وہ حشو شاعر کے ذہن میں پیدا کرے،

اس جعل ساز، مفتری، فریب کار، اور پُر گو نادان نے کہیں کہیں اپنی اصلیت کو بے حجاب کیا ہے، میری نظر میں یہ حقیقت آفتاب کی طرح روشن ہے کہ تون کے باشندوں میں سے ایک شخص نویں صدی ہجری میں گذرا ہے، جو چاہتا تھا کہ شاعری میں نام پیدا کرے، وہ اپنا تخلّص عطّار اور لقب فریدالدّین اختیار کر کے شیخ عطّار کی بعض کتابوں کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے، آیئے اس شخص کو اُس کی اصلی زبان میں اپنا تعارف کرا دیں،

اصلِ من از تون معمور آمده مولدم شہر نشاپور آمده
ہست نامِ من محمّد اے سعید شد فریدالدین لقب از اہلِ دید

اس کا وطن تون اور اس کی جائے پیدائش نیشاپور ہے، کچھ مدّت وہ مشہد میں بھی رہا ہے، اس کا سلسلۂ نسب حضرت ابوذر غفاریؓ سے جا ملتا ہے، ۵۸۴ھ میں اپنی عُمر ایک سو بتاتا ہے، جس سے اس کی تاریخ پیدائش ۴۸۴ھ ہونی چاہئے، اُس کی ناواقفیت کا یہ حال ہے کہ شاپور اور نیشاپور میں امتیاز نہیں کر سکتا، اپنی دُور دراز سفر کی داستان سُناتا ہے، یقین ہے کہ اگر اُس نے امریکہ اور اوقیانوس کا نام سُنا ہوتا، تو اُن کو بھی اپنے سفر کا جزو بناتا، اس کا دعویٰ ہے کہ عہدِ طفلی میں اُس نے مشہدِ مقدس میں اٹھارہ سال بسر کئے ہیں۔

بوقتِ کودکی من ہیجدہ سال ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ به مشهد بوده ام خوش وقت و خوش حال

اس شعر میں مشہد کا نام لیا گیا ہے اور یہ ایک زبردست دلیل ہے اس کے جعلی ہونے کی، نویں صدی سے پہلے ایران میں اور طوس کے ویران ہونے کے بعد یہ شہر آباد ہونا شروع ہوا،

اس مفتری کی کتابوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اپنا روحانی مقام قائم کرنے کی خاطر ان واقعات کو جو اُس کے پہلے کے زمانہ میں ہو چکے ہیں، پیشین گوئی کے طور پر پیش کرتا ہے، حافظ کی تاریخِ وفات ۷۹۱ھ اور قاسم انوار کی ۸۳۷ھ ہے، اس سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شخص حافظ و قاسم انوار کے بعد عالمِ وجود میں آیا ہے، اپنی ایک کتاب کا نام مظہر العجائب رکھتا ہے، جو امام اوّل کے القاب میں سے ہے، یہ بات خود اس بات کی دلیل ہے کہ مُصنّف نویں صدی میں گذرا ہے، اس لئے کہ اس سے پہلے مظہر العجائب کا لفظ فارسی زبان میں اس معنی میں نہیں ملتا، اس مُصنّف کا زمانہ نویں صدی ہے کیونکہ لسان الغیب کا ایک نسخہ موجود ہے، جو سلطان حسین بایقرا کے وزیر نظام الملک خوانی نے سفرِ حج کے درمیان اپنے ہاتھ سے لکھا تھا، اور آقائے بدیع الزّمان فروزان فر کے پاس مظہر العجائب کا ایک نسخہ ہے، جس کی تاریخِ کتابت ۹۱۲ھ ہجری ہے۔

شیخ عطّار اور اس تونی عطّار کے عقائد کے درمیان بہت بڑا فرق ہے، شیخ عطّار صوفی مشرب تھے، اور فروع میں امام شافعی کے پیرو تھے، دوسری طرف یہ تونی عطّار حسینی مذہب اور حیدری ہے، اس تونی کو اپنی تمام تصانیف میں سب سے زیادہ مظہر العجائب پر ناز ہے، شیخ فرید الدّین طبیب اور دوا فروش تھے، یہ تونی عطّار عزلت پسند اور گوشہ گیر ہے، ایک جگہ ناصر خسرو کی یمگان میں عزلت گزینی کا بھی ذکر آتا ہے، اس کو دعویٰ ہے کہ اُس نے بائیس لاکھ اور ساٹھ اشعار لکھے ہیں، سات سو اور دس کتابیں پڑھی ہیں اُس کے اشعار اس قدر طفلانہ اور پھُسپھُسے ہیں کہ ایک دس سال کا بچہ بھی اس سے زیادہ پختہ اور روان شعر کہہ سکتا ہے، بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ نویں صدی کا ایک جعل ساز تون کا رہنے والا ہے جس نے کچھ وقت مشہد میں بھی گذارا ہے، اپنے آپ

کو فرید الدین محمد عطّار کہتا ہے اور اس نے کئی سست اور بے مغز کتابیں مثلاً اشتر نامہ بلبل نامہ، بیسرنامہ، ترجمۃ الاحادیث، اور جواہر الذات حلّاج نامہ یا منصور نامہ یا ہیلاج نامہ، خیاط نامہ، سی فصل، کنز الاسرار، کنز الحقائق، گل و ہرمز، لسان الغیب، مظہر العجائب، معراج نامہ، مفتاح الفتوح اور وصلت نامہ لکھیں، جن کو شیخ عطّار سے کوئی نسبت نہیں،

کتاب کے آخر میں ایک تکملہ ہے، جس میں رکن الدین کافی پر ایک نوٹ ہے، اور ایک دو مسائل پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

پروفیسر سعید نفیسی کی تحقیقات سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ یہ علم کا شیدائی ہر قسم کے تعصبات سے آزاد ہے، اور حق گوئی کے معاملہ میں بالکل نڈر اور بے باک ہے، وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ اُس کی تحقیقات کے نتائج اُس کے ہم وطنوں کی ایک بہت بڑی اکثریت کے لئے خوش گوار نہ ہوں گے، سچائی اور راستی کا یہی وہ بلند معیار ہے، جو اہلِ علم و تحقیق کو ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھنا چاہئے، آقائے نفیسی کے علمی کارنامے کی حقیقی قدر کرتے ہوئے ہمیں اپنے ملک کے بلند مرتبہ محقق مرحوم علامہ محمود شیرانی کو نہ بھولنا چاہئے، جنھوں نے ایرانی فاضل کی کتاب شائع ہونے سے کئی سال پہلے اسی موضوع پر اُردو داں حضرات کو اپنے نتائج تحقیق سے مستفید ہونے کا موقع دیا تھا، اور اس امتیاز کی بنا پر الفضل للمتقدم کے شرف کے مستحق ٹھہرتے ہیں،

یہاں اس حقیقت کا اظہار بیجا نہ ہوگا کہ بعض ان کتابوں سے متعلق جو عطّار کی طرف منسوب کی گئی ہیں، آقائے نفیسی کا بیان مبہم اور غیر واضح ہے، سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ ان کتابوں کے حقیقی وارثوں کے بارے میں اُن کے خیالات صاف اور واضح نہیں، کبھی تو وہ ان سب کتابوں کو (ص ۱۶۷)، مثلاً اشتر نامہ، بلبل نامہ، بیسر نامہ، ترجمۃ الاحادیث جواہر الذات، حلّاج نامہ یا منصور نامہ یا ہیلاج نامہ، خیاط نامہ، سی فصل، کنز الاسرار کنز الحقائق، گل و ہرمز، لسان الغیب، مظہر العجائب، معراج نامہ، مفتاح الفتوح اور وصلت نامہ کو اس جعلی عطّار کی ملک ٹھہراتے ہیں، جو تون کا رہنے والا تھا اور نویں صدی میں گذرا ہے، حالانکہ دیباچہ کے صفحہ ۹۶ پر وہ تین عطّار کے قائل ہیں،

اوّل: فریدالدّین ابو حامد محمدؔ بن ابو بکر ابراہیم بن ابو یعقوب اسحٰق بن ابراہیم عطّار نیشاپوری متوفی ۶۲۷ھ جو اسرار نامہ، الٰہی نامہ، پند نامہ، خسرو نامہ، دیوان قصائد و غزلیات، مختار نامہ، مصیبت نامہ، منطق الطیر، اور تذکرۃ الاولیاء کے مصنّف ہیں، اور جن کی تین کتابیں اور ہیں، مظہر الصّفات، جواہر نامہ، شرح القلب، معلوم نہیں یہ کتابیں برباد ہو چکی ہیں یا نہیں،

دوم: زین الدّین محمدؔ بن ابراہیم بن مصطفی بن شعبان عطّار ہمدانی جو اہالیِ زنجان میں سے تھا، اور ۷۲۷ھ میں مارا گیا، وہ ترجمۃ الاحادیث، کنز الحقائق، کنز الاسرار اور مفتاح الفتوح کا مصنّف ہے،

سوم: فریدالدّین محمدؔ عطّار تونی مشہدی جو نویں صدی میں شہر مشہد میں رہتا تھا اور جو اشتر نامہ، بلبل نامہ، بیسر نامہ، جواہر الذّات، حلّاج نامہ، یا ہیلاج نامہ یا منصور نامہ، خیاط نامہ، سی فصل، گل و ہرمز، لسان الغیب، مظہر العجائب، معراج نامہ اور وصلت نامہ کا مصنّف ہے، اس سلسلہ میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ خود آقائے سعید نفیسی کا ایک دوسری جگہ یہ بیان ہے کہ وصلت نامہ کا مُصنّف کوئی شاعر بہلول ہے، ترجمۃ الاحادیث اور کنز الاسرار کا مصنّف ایک ہی شخص ہے، گل و ہرمز کے متعلق وہ یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ یہ عطّار کی تصنیف ہے، یا نہیں، اور اُن کا سب سے دلچسپ بیان مفتاح الفتوح کے بارے میں ہے، جس کو وہ کبھی عطّار کی ملک ٹھہراتے ہیں، اور کبھی کسی زنجانی کی، اسی طرح وہ ..بر نامہ کو عطّار کی تصنیف نہیں مانتے، تاہم اسی کی سند پر ان کا یہ بیان ہے کہ عطّار اپنے بیٹے ضیاء الدّین یوسف کو نصیحت کرتے ہیں،

تذکرۂ نگارستانِ سخن میں لکھا ہے کہ سیّد فریدالدّین عطّاری شطّاری گوالیاری، جن کا انتقال ۱۲۳۸ھ میں ہوا، بھوپال کے وظیفہ خوار تھے، اُن کا سلسلۂ نسب شیخ محمدؔ غوث گوالیاری کے واسطہ سے شیخ فریدالدّین عطّار سے جا ملتا ہے، اور شیخ عطّار امام جعفر صادق کی اولاد میں سے ہیں، اس بیان کی بنا پر آقائے سعید نفیسی لکھتے ہیں کہ تیرھویں صدی کے آخر تک عطّار کی اولاد ہندوستان میں موجود تھی، اور شاید اب بھی وہاں موجود ہو، یہ سچ ہے کہ

حضرت محمدؒ غوث گوالیاری کی اولاد آج بھی گوالیار، احمد آباد اور بھوپال میں موجود ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ آیا حضرت گوالیاری کے جدّ امجد خواجہ فریدالدّین محمدؒ عطار اور شیخ عطارؒ نیشاپوری ایک ہی بزرگ ہیں، اس راستہ کی سب سے بڑی رکاوٹ حضرت گوالیری اور خواجہ عطّار کے درمیان چھ واسطوں کا ہونا ہے اور وہ یہ ہیں[۵]؎

حضرت سیّد محمدؒ غوث ابن سیّد خطیر الدّین، ابن سیّد عبداللّطیف۔ ابن سیّد معین الدّین قتال، ابن سیّد خطیرالدّین، ابنِ سیّد بایزید پارسا، ابنِ خواجہ سیّد فریدالدّین محمدؒ عطّار،

دوسری طرف شیخ کا سنہ وفات ۶۲۷ھ ہے، اور حضرت محمدؒ غوث گوالیری کا ۹۷۰ھ، یعنی ان دونوں کے درمیان تین صدی کا زمانہ حائل ہے، اس لئے اس بات کا باور کرنا آسان نہیں کہ حضرت محمدؒ غوث کے جدّ اعلیٰ خواجہ فریدالدّین محمدؒ عطّار اور شیخ عطّار نیشاپوری واحد شخص ہوں،

آخر میں ہم شیرانی صاحب کے خط کا ایک اقتباس قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں، ٹونک سے اپنے مکتوب مورخہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء میں شیرانی صاحب پروفیسر سعید نفیسی کی تحقیقات کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"آپ کے نفیسی صاحب نے صرف ایک شخص کو ان تمام مجہول کتابوں کا ذمّہ دار بنا دیا ہے، یہ صحیح نہیں، یہ کسی جعل سازوں کا کام ہے، کنزالحقائق غلطی کی بنا پر عطار کی طرف منسوب ہوئی ہے نہ کسی جعل کی بنا پر، پہلوان محمود خوارزمی کی تالیف ہے، گل وہرمز اور خسرو نامہ ایک ہی چیز ہے، اور خسرو نامہ تو صریحاً عطار کی یادگار ہے، اسی طرح کنزالاسرار کسی غلطی کی بنا پر عطار کی طرف منسوب کی گئی ہے، اس کے مصنّف ترمتی ہیں۔"

---

[۵] اردو ترجمہ مناقب غوثیہ ص ۵،

ہندوستان میں مُغلوں سے قبل فارسی ادب

شمس العلماء عبدالغنی کا تازہ علمی کارنامہ

علامہ شیرانی مرحوم نے اپنی عالمانہ تحقیقات سے اُردو اور فارسی ادب اور تاریخ میں گراں قدر اضافے کئے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اپنے قیام انگلستان کے دوران میں وہ علمی مشاغل میں منہمک رہے۔ چنانچہ جس قابلیت سے اُنھوں نے ڈاکٹر سٹبز (Stubbs) کی کتاب Rise and progress of Mohamedanism لندن سے 1911ء میں شائع کی اور اُس کے ساتھ ایک محققانہ ضمیمہ شامل کیا اس سے اُن کے شاندار علمی مستقبل کا اندازہ لگایا جاسکتا ہی۔ یہ بھی سچ ہی کہ کبھی کبھی وہ اپنے محترم دوست شیخ عبدالقادر کے رسالۂ مخزن کے لئے نظم اور نثر میں کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔ تاہم امر واقع یہ ہی کہ ہندوستان کے علمی حلقوں میں وہ صرف اُس وقت رُوشناس ہوئے جب رسالہ اُردو میں فردوسی پر اُن کے عالمانہ مقالے شائع ہوئے، ایک زمانہ سے یہ بات مشہور چلی آرہی ہی کہ فردوسی نے سلطان محمود کی وعدہ خلافی سے بددل ہوکر اپنے غیظ وغضب کا اظہار اُن اشعار میں کیا۔ جو محمود کی ہجو کے نام سے مشہور ہیں۔ جس طریقہ سے ان اشعار کی تعداد میں امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا رہا ہی وہ حیرت انگیز ہی۔ نظامی عروضی ان اشعار کی تعداد صرف چھ بتاتا ہی۔ اس کی رائے میں باقی اشعار ضائع کردئے گئے تھے۔ لیکن موجودہ ہجو تقریباً سو ابیات پر مشتمل ہی۔ شیرانی صاحب نے روایت اور درایت کے اصولوں کی کسوٹی پر ان اشعار کو پرکھ کر یہ حقیقت واضح کی کہ ان میں سے بعض اشعار خود شاہنامہ یا دوسری کتابوں سے لئے گئے ہیں اور متعدد اشعار سرے سے موضوع اور جعلی ہیں۔ جس طرح

ہجو کے اشعار فردوسی کی طرف منسوب کئے گئے ہیں۔ اسی طرح مثنوی "یوسف و زلیخا" کا بھی اُسے مالک ٹھہرایا گیا ہے۔ شیرانی صاحب نے داخلی اور خارجی شواہد کی مدد سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ مثنوی فردوسی کی لکھی ہوئی نہیں بلکہ اس کے بعد کے زمانے کی تصنیف ہے۔ بدیع الزمان اپنی تالیف "سخن و سخنوران" (جلد اوّل صـ۴۸) میں فردوسی کی مثنوی "یوسف و زلیخا" کا ذکر کرکے اس کے سُست اور دل ناپذیر ہونے کے شکوہ سنج ہیں۔ اور نہایت حسرت کے ساتھ لکھتے ہیں کہ کاش یہ مثنوی فردوسی کی تصنیف نہ ہو۔ کاش انہیں اس بات کا علم ہوتا کہ ایک ہندوستانی محقق اصل حقیقت کا سُراغ لگا چکا ہے۔ اور بدلائل واضح کرچکا ہے کہ اس مثنوی کو فردوسی کی طرف منسوب کرنا کسی طرح دُرست نہیں۔ ڈاکٹر رضا زادہ شفق بھی اس بارے میں بعض فضلاء کے تشکک کا ذکر کرتے ہوئے "تاریخ ادبیاتِ ایران" (طہران ۱۳۲۱، صفحہ ۹۷) میں رقمطراز ہیں کہ حال ہی میں ایک عالم کو مثنوی یوسف و زلیخا کا ایک ایسا نسخہ ہاتھ لگا ہے جس کے مقدمہ کے اشعار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس مثنوی کا مُصنّف فردوسی نہیں بلکہ کوئی اور شاعر ہے۔ اور یہ مثنوی سُلطان ملک شاہ سلجوقی (۴۶۵ تا ۴۸۵ ہجری) کے زمانے میں اس کے بھائی طغان شاہ بن الپ ارسلان کے نام پر لکھی گئی ہے۔

جب فردوسی پر شیرانی صاحب کے عالمانہ مقالے شائع ہوئے اور لوگوں کو اُن کے محقّق اور ناقد ہونے کا علم ہوا۔ تو قدرتی طور پر بعض علمی حلقوں نے اُن کی خداداد قابلیّت اور علمی تبحّر سے استفادہ کرنے کی کوشش کی۔ اسی قسم کی ایک کوشش وہ تھی جس کا نتیجہ آج ہم تنقید شعر العجم کی صورت میں دیکھتے ہیں۔ جیسا کہ شیرانی صاحب نے اس مجموعہ کے دیباچے میں صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اُن کا اس تنقید لکھنے میں بڑا مقصد تعمیری تھا نہ کہ تخریبی۔ چنانچہ انوری، نظامی اور عطار کے متعلّق اُنھوں نے بڑے قیمتی اور مفید اضافے کئے ہیں۔ برادرِ عزیز ڈاکٹر سید محمد عبداللہ (اورینٹل کالج لاہور) نے شیرانی صاحب سے غزلیاتِ

نظیری سبقاً سبقاً پڑھنے کا ذکر کرتے ہوئے اُستاد مرحوم کی اُس محنت اور جانفشانی کی طرف اشارہ کیا ہے جس کے ساتھ وہ کتابوں کے متن کی تصحیح کیا کرتے تھے مجھے بھی شیرانی صاحب سے قصائدِ انوری کے بعض مشکل اشعار کی شرح سُننے کا فخر حاصل ہے۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں اپنے لاہور والے مکان واقع فلیمنگ روڈ پر مئی اور جون کی سخت تپش کی پروانہ کرتے ہوئے وہ نہایت خندہ پیشانی اور کشادہ دلی کے ساتھ گھنٹوں انوری کے اشعار کی شرح دلکش انداز میں کیا کرتے۔ جب میری چھٹیوں کا زمانہ ختم ہونے کو آیا تو انوری کے چند ایسے اشعار رہ گئے تھے جن پر شیرانی صاحب مزید غور و فکر کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ ان کے حسبِ ارشاد میں نے وہ اشعار ایک الگ کاغذ پر لکھ کر ان کی خدمت میں پیش کردیے اور خود بمبئی چل دیا۔ کچھ مدّت کے بعد شیرانی صاحب نے از راہِ کرم اُن اشعار کی شرح لکھ کر میرے بمبئی کے پتے پر روانہ کی۔ میرا ارادہ ہے کہ یہ شرح استفادۂ عام کی غرض سے شائع کرادوں۔ انوری کے سوانح اور شاعرانہ کمال پر جس تفصیل اور جامعیت کے ساتھ شیرانی صاحب نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ وہ آپ اپنی نظیر ہے۔ اگرچہ نظامی کے سلسلے میں بھی اُنھوں نے ہماری معلومات میں معتدبہ اضافہ کیا ہے۔ لیکن اُن کا ایک بڑا کارنامہ عطار کی مفروضہ اور جعلی تصنیفات پر بصیرت افروز تبصرہ ہے۔ میرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی جو زمانہ حال میں ایران کے سب سے بڑے محقق شمار ہوتے ہیں اُس مقدمہ میں جو اُنھوں نے عطار کی تذکرۃ الاولیاء پر لکھا ہے۔ لسان الغیب کی سند پر جو عطار کی طرف منسوب کی جاتی ہے عطّار کی سُنّی عقیدہ سے بیزاری کا ذکر کرتے ہیں۔ مولانا شبلی بھی میرزا قزوینی کی تقلید میں لسان الغیب کو عطار کی اصلی تصنیف مان کر اُس کے بعض اشعار شعر العجم میں نقل کرتے ہیں لیکن شیرانی صاحب قزوینی سے متاثر ہوئے بغیر عطّار کی ان جعلی تصنیفات کا گہرا مطالعہ کرکے اپنی تحقیقات کا خلاصہ رسالۂ اُردو میں شائع کرتے ہیں جس کے ذریعہ سے یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ جاتی ہے کہ ان تصنیفات میں سے اکثر کا مُصنف کوئی جعلی عطار ہے۔ اور بعض اصلی مصنفوں

کی بجائے شیخ عطار کی طرف منسوب کر دی گئی ہیں۔ ۱۹۴۲ء میں جب پروفیسر سعید نفیسی کی کتاب عطار کے حالات اور تصانیف پر اسمٰعیل کالج اندھیری (بمبئی) کی لائبریری میں مجھے پڑھنے کا موقع ملا تو یہ دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ سعید نفیسی عطار کی طرف غلط طور پر منسوب کی ہوئی کتابوں کے بارے میں اُسی نتیجے پر پہنچے ہیں جہاں شیرانی صاحب برسوں پہلے پہنچ چکے ہیں۔ جب شیرانی صاحب کے ارشاد کے مطابق میں نے اس کتاب کا ایک نسخہ اُن کی خدمت میں بھجوایا۔ تو انھوں نے نفیسی کی تحقیقات کی بعض خامیوں کی طرف میری توجہ مبذول کرائی۔ یہ موضوع اپنی نوعیت کے اعتبار سے اچھا خاصہ دلچسپ ہے۔ اور اس پر ایک مستقل مقالہ درکار ہے۔

تنقید شعر العجم کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ اُردو زبان کی تاریخ شیرانی صاحب کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ چنانچہ انھوں نے "پنجاب میں اُردو" شائع کر کے اس زبان کے ساتھ دلچسپی رکھنے والوں کے لئے تحقیق اور جستجو کی نئی راہ کھول دی۔ شیرانی صاحب کا نظریہ اگرچہ بعض علماء کے نزدیک قابلِ قبول نہ تھا۔ تاہم ان کو شیرانی صاحب کی نکتہ رسی اور بلند نظری کا قائل ہونا پڑا۔ بعد میں جب شیرانی صاحب کا تقرر پنجاب یونی ورسٹی میں بطور لیکچرر عمل میں آیا۔ اور اُنھیں اس مسئلہ پر زیادہ گہری نظر ڈالنے کا موقعہ ملا تو وہ خود بھی اس مسئلہ کے بعض پہلوؤں سے مطمئن نہ تھے اور چاہتے تھے کہ "پنجاب میں اُردو" پر نظرِ ثانی کر کے اس کا دوسرا اڈیشن شائع کریں لیکن اُن کے دوسرے مشاغل کی وجہ سے یہ کام سر انجام نہ پا سکا۔ ۱۹۲۸ء کے بعد ان کی توجہ زیادہ تر اُردو زبان پر مرکوز ہو گئی۔ چنانچہ ان کے متعدد مقالے اورینٹل کالج میگزین لاہور میں شائع ہوئے۔ ضرورت ہے کہ اُردو زبان سے متعلق اُن کے تمام مقالے کتابی صورت میں شائع کئے جائیں۔ امید ہے کہ ڈاکٹر عبدالحق صاحب اس کام کی طرف توجہ مبذول فرمائیں گے۔ انجمن ترقی اُردو اس سے پہلے "اصلی خالق باری" اور "پرتھی راج راسا" شائع کر چکی ہے۔ پہلی مرتبہ "پنجاب میں اُردو" میں شیرانی صاحب نے امیر خسرو کی طرف خالق باری کے انتساب پر چند دزنی

اعتراضات کئے تھے۔ پھر اپنے مضمون "تنقید بر آبحیات" میں دوبارہ اس انتساب کے غلط ہونے پر دلائل پیش کئے۔ یہاں تک کہ وہ ایک ایسا نسخہ دریافت کرنے میں کامیاب ہو گئے جس سے یہ حقیقت کامل طور پر ثابت ہو گئی کہ "خالق باری" امیر خسرو کی نہیں بلکہ کسی دوسرے خسرو کی تصنیف ہے۔ گذشتہ صدی میں پرتھی راج راسا، اپنے مطالب کی دلکشی کی بناء پر ماہرینِ السنہ اور مورخین کے لئے دلچسپی اور کشش کا باعث بنی رہی۔ چنانچہ ٹاڈ نے اپنی "داستانِ راجستھان" کی بلند عمارت اسی بنیاد پر کھڑی کی۔ عین اس وقت جبکہ راسا بعض مغربی علماء کا دل موہ رہی تھی بعض علمی حلقوں میں راسا کی داستانوں کو شبہ کی نظر سے دیکھا گیا۔ اور اس طرح اس کے موافق اور مخالف بہت سا مواد جمع ہو گیا۔ اردو زبان تاریخ کے سلسلے میں مولوی محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں راسا کے بعض اشعار استشہاد کے طور پر نقل کر کے اس کی تاریخی اہمیت کو تسلیم کر لیا۔ شیرانی صاحب پہلے محقق تھے جنھوں نے اردو زبان میں راسا کے مضامین پر علمی اور لسانی اعتبار سے پورے استقصاء کے جامعیت کے ساتھ تبصرہ کیا۔ اور اس کی تاریخی قدر و قیمت کو ایک مبالغہ آمیز افسانہ بتایا۔ اس تبصرہ کے شائع کرنے سے چند سال پہلے شیرانی صاحب حکیم قدرت اللہ قاسم کا تذکرہ مجموعۂ نغز مرتب کر کے محمد حسین آزاد کے خلاف اس الزام کو غلط ثابت کر چکے تھے کہ آزاد نے "آبِ حیات" میں بے بنیاد باتیں درج کی ہیں۔ اور قیاس کی بلند پروازی نے طوطے مینا بنا کر اُڑائے ہیں۔

اگرچہ ۱۹۲۸ء کے بعد جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے شیرانی صاحب کی دلبستگی زیادہ تر اُردو کے ساتھ رہی۔ تاہم کبھی کبھی وہ فارسی کی طرف بھی توجہ منعطف کیا کرتے تھے۔ اورینٹل کالج میگزین لاہور کے شمارہ فروری ۱۹۴۰ء میں اُن کا ایک مقالہ "شاہنامہ سے فردوسی کے حالات" کے عنوان سے شائع ہوا۔ جس میں انھوں نے شاہنامہ سے متعلق بعض امور کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔ اور دلائل کے ساتھ یہ واضح کیا کہ داستان منیژہ و بیژن سب سے پہلی داستان ہے جسے فردوسی نے منظوم کیا۔ اسی

طرح ایک ایرانی شاعر صلائی کے حالات اور کلام پر دلچسپ مضمون لکھا جو مختلف ملکوں میں قسمت آزمائی کرنے کے بعد اکبر کے عہد میں کھنبایت کی بندرگاہ میں سکونت اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن یہاں بھی اس کا طالع اُس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ بہادر ابن مظفر جسے شاعر ابن نون کے نام سے یاد کرتا ہے کھنبایت پر حملہ کر دیتا ہے۔ اور بیچارے شاعر کا تیس سال کا اندوختہ نذر غارت ہو جاتا ہے۔ ہندوستان کے اسلامی دَور کی تاریخ کے ساتھ شیرانی صاحب کی دلچسپی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے جب علی گڑھ یونی ورسٹی کے پروفیسر محمد حبیب نے سلطان محمود غزنوی پر ایک کتاب شائع کی اور اس میں محمود کو ایک ڈاکو اور غارت گر ثابت کرنے کی کوشش کی۔ تو شیرانی صاحب کو بہت رنج پہنچا۔ چنانچہ اس کا اظہار اُنھوں نے پروفیسر حبیب کی کتاب کے اُردو ترجمہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کیا ہے۔ اُنھیں ہندوستانی اکیڈمی والوں سے شکایت ہے کہ وہ ہیرے اور کنکر اور موتی اور پوتھ میں امتیاز نہیں کر سکے۔ اور محمود غزنوی پر ڈاکٹر محمد ناظم کی محققانہ کتاب کی موجودگی میں وہ حبیب صاحب کی کتاب کو ترجمہ کیلئے پسند کرتے ہیں۔ خزائن الفتوح میں امیر خسرو نے علاؤالدین خلجی کی دکنی فتوحات کو نہایت ہی مشکل، پُر تکلف اور رنگین پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی کتاب کا ایڈٹ کرنا کس درجہ مشکل ہے۔ اور اس کا ترجمہ اور بھی مشکل ہے لیکن پروفیسر حبیب جو اس کتاب سے متعلق انگلستان میں بھی کام کر چکے تھے آگے بڑھے اور علی گڑھ یونیورسٹی کی ہسٹاریکل سوسائٹی کی جانب سے اس کا انگریزی ترجمہ شائع کر دیا۔ شیرانی صاحب جو اس میدان کے مرد تھے اچھی طرح جانتے تھے کہ حبیب صاحب سے یہ کمان زہ نہ ہو سکے گی۔ چنانچہ جب انھوں نے انگریزی ترجمہ کا مقابلہ اصل متن سے کیا تو اُن کا اندیشہ درست نِکلا اور انھوں نے ترجمہ میں زبان تاریخ اور جغرافیہ کی فاحش غلطیاں بتائیں۔ ایک سطحی نظر سے دیکھنے والے کو یہ بات کھٹکے گی کہ آخر شیرانی صاحب نے اتنی ساری محنت کیوں گوارا کی لیکن وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ ہمارے یہاں کتابوں کے معیار کو بلند کرنے کیلئے یہ بہت ضروری ہے کہ اس قسم کی غلط کوششوں کا احتساب کیا جائے۔

ورنہ ہر کہ و مہ کتابوں کے مُرتّب بننے کے شوق میں علم کا خون روا رکھے گا۔ اور ہمارا علمی معیار جو پہلے ہی بہت بلند نہیں ہے اور بھی پست ہو جائے گا۔

۱۹۳۷ء میں ڈاکٹر اقبال حسین لیکچرار پٹنہ کالج کی قابلِ قدر کتاب "ہندوستان کے قدیم فارسی شعراء" (از سنہ ۱۲۱ھ تا ۶۹۷ھ) کا شیرانی صاحب پُرجوش خیر مقدم کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "قدیم شعرائے ہند پر قدم اُٹھانا کوہ کندن و کاہ بر آوردن کا مترادف ہے اور ڈاکٹر اقبال حسین اس سنگلاخ اور بنجر زمین میں اپنی تیشہ زنی اور جگر کاوی پر مستحق مُبارکباد ہیں"۔ اس موضوع کے ساتھ جو دلچسپی شیرانی صاحب کو تھی اس کا لازمی تقاضا تھا کہ وہ کتاب کے بعض ان پہلوؤں پر روشنی ڈالیں جو مبہم یا غیر واضح رہ گئے تھے۔ ایک مبسوط تبصرہ کے آخر میں وہ مُصنّف سے درخواست کرتے ہیں کہ کتاب کا دوسرا اڈیشن شائع کرتے وقت وہ شیرانی صاحب کی گذارشات پر بھی غور کرلیں۔ شیرانی صاحب نے اپنے احباب اور شاگردوں سے اس موضوع پر کئی مضمون لکھوائے۔ اورنٹیل کالج میگزین لاہور میں پروفیسر آغا عبدالستار نے سلطان شمس الدین التمش اور سلطان قباچہ کی علمی سرپرستی اور ان کے عہد کے شاعروں پر ایک سلسلۂ مضامین لکھا اور پروفیسر یٰسین خاں نیازی نے اسی میگزین میں امیر خسرو کی مثنوی مفتاح الفتوح شائع کی۔ اور جمالی اور اُس کے بیٹے گدائی پر مضمون لکھے۔ امیر خسرو کے سوانح و تصنیفات پر ڈاکٹر وحید مرزا کے عالمانہ مقالے کے بھی شیرانی صاحب بہت مُعترف تھے۔ اس قسم کی مساعی کو شیرانی صاحب کے بنظرِ استحسان دیکھنے سے قُدرتی طور پر اُن سے یہی توقّع کی جا سکتی تھی کہ وہ شمس العلماء پروفیسر محمد عبدالغنی کی کتاب "مُغلوں سے قبل ہندوستان میں فارسی ادب" کی دیدہ زیب طباعت، اُس کی ضخامت، اس پر بعض اکابر مُلک و قوم کی سند تصدیق اور پھر موضوع کی دلکشی سے متاثر ہو کر ضرور شمس العلماء کی محنت و جانفشانی پر تحسین کے پھول برسائیں گے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس تحسین کے بجائے وہ ایک ناقدانہ تبصرے میں کتاب کی خامیاں اس طرح چُن چُن کر پیش کرتے ہیں کہ شمس العلماء کی تحقیقات پایۂ اعتبار سے گر جاتی ہیں اور اُن کی کتاب فاحش غلطیوں کی ایک کھتونی سے زیادہ

درجہ کی مستحق نہیں رہتی۔ اِس سوال کا جواب کہ آخر شیرانی صاحب نے اتنا سخت محاسبہ کیوں روا رکھا۔ ذیل کی سطور میں دیا جائے گا۔ غالباً جولائی ۱۹۴۳ء میں برادرِ محترم پروفیسر نجیب اشرف ندوی (اسمٰعیل کالج بمبئی) کی عنایت سے مجھے شیرانی صاحب کا تبصرہ پڑھنے کا موقع ملا۔ اس کے پڑھنے کے بعد قدرتی طور پر شمس العلماء عبدالغنی سے اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے میں نے شیرانی صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ ان کی تنقید سے جو کچھ شمس العلماء کے دل پر گذری ہوگی اس کو شمس العلماء ہی جان سکتے ہیں۔ اس کے جواب میں شیرانی صاحب نے لکھا کہ "مجھ پر طعن کرنے سے پہلے کتاب کا مطالعہ کرلو۔ اگر میں کسی لائبریری کے نزدیک ہوتا تو یہ تنقید مضاعف ہوتی"۔

اسی اثناء میں مخدومی ڈاکٹر بدل الرحمٰن (پرنسپل اسمٰعیل کالج بمبئی) شمس العلماء کی کتاب کا ایک نسخہ کالج کی لائبریری کے لئے منگوا چکے تھے۔ بڑے شوق سے میں نے کتاب کا مطالعہ شروع کیا۔ لیکن جوں جوں شمس العلماء کے بیانات پر نظر پڑی بادلِ ناخواستہ شیرانی صاحب کی رائے سے اتفاق کرنا پڑا۔ چنانچہ اُن کے تبصرے کے تتمہ کے طور پر اسی کتاب سے متعلق میرا مضمون رسالہ اُردو کے شمارۂ اکتوبر ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا۔ جس کے آخر میں یہ اُمید ظاہر کی گئی تھی کہ آئندہ اڈیشن میں دیدہ زیب طباعت کے ساتھ ساتھ یہ کتاب گہرے مطالعہ اور تحقیقات کی آئینہ دار بھی ہوگی۔
تبصرہ شائع ہونے کے بعد ہی یہ آواز ہمارے کانوں میں پہنچی تھی کہ شمس العلماء بہت سرگرمی اور مستعدی سے اس کا جواب لکھ رہے ہیں۔ اگرچہ ہمارے بعض فاضل دوست اس خبر پر ایمان لانے کے لئے تیار نہ تھے تاہم شمس العلماء کے لئے گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل کا سوال درپیش تھا۔ اگر وہ خاموشی اختیار کرتے تو اُن کی کتاب ناقص وساقط الاعتبار ٹھہرتی۔ اور اگر جواب دینے کی کوشش کرتے بھی تو ان صریح اور فاحش غلطیوں کی تاویل کیونکر پیش کرتے جو ان کی کتاب کا بدنما داغ ہیں۔ غرض شمس العلماء اسی تذبذب کے عالم میں تھے کہ سید حسن امام سابق مدیر رسالۂ ندیم (گیا) کے اصرار

تمام نے انھیں اس فرض کی انجام دہی پر آمادہ کر لیا۔ اور اُن ہی کی ہمت افزائی سے یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ ادارۂ معارف سے خط و کتابت کے بعد یہ طے پایا کہ شمس العلماء کا جواب کتابی صورت میں معارف کے ضمیمہ کے طور پر شائع کیا جائے۔ اس جواب کے نسخے غالباً اُن تمام حضرات کی خدمت میں بھیجے گئے جنھیں اصل کتاب بطور ہدیہ دی گئی تھی۔ ان حضرات میں ہمارے مخدوم ڈاکٹر محمد بذل الرحمٰن بھی تھے۔ جب دسمبر ۱۹۴۵ء کے آخری ہفتے میں مجھے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا تو اُن کے پاس شمس العلماء کا جواب دیکھ کر میں نے اس کاپی کے لئے درخواست کی جسے ڈاکٹر صاحب نے از راہِ کرم شرفِ قبولیت بخشا۔ احمد آباد واپس پہنچ کر میں نے فوراً شیرانی صاحب سے دریافت کیا کہ کیا شمس العلماء کا جواب اُن کے ملاحظہ سے گذر چکا ہے یا نہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی اُن کی ناسازیٔ طبیعت کے پیشِ نظر اپنی طرف سے شمس العلماء کے جواب کا جائزہ لینے کے لئے آمادگی ظاہر کی۔ شیرانی صاحب ٹونک سے اپنے گرامی نامہ مورخہ ۲۷ جنوری ۱۹۴۶ء میں فرماتے ہیں :۔

"شمس العلماء کا تبصرہ میں نے نہیں دیکھا۔ اگر آپ بھیج دیں گے تو میں دیکھ لوں گا۔ لیکن میری یہ حالت نہیں کہ جواب دے سکوں۔ بیماری نے بالکل گھلا دیا ہے۔ بیحد ضعیف ہو چکا ہوں۔ مجھ میں اور قبر میں بہت کم فاصلہ رہ گیا ہے۔ اگر آپ جواب کی ضرورت سمجھتے ہیں تو جواب دیجئے۔ لیکن چھپوائیے گا کہاں۔ میرے خیال میں اُردو ہی مناسب رہے گا۔ اشاعت سے پیشتر اگر ایک نظر وہ جواب مجھے بھی دکھا دیں تو ممنون ہوں گا۔ ممکن ہے کہ میں کوئی مشورہ بھی دے سکوں۔"

یاد رہے کہ شمس العلماء کے النگتی مہمل کو بامعنی بنانے کے لئے میں نے اس کا استخراج تکنہ سے کیا تھا۔ ڈاکٹر صدیقی نے اُن ہی دنوں میں مجھے لکھا تکت یا الںکت یاقوت کے ہاں سمرقند کے قریب کسی

قصبے کا نام ہو۔ بہرحال آپ یاقوت سے اس کی تصدیق کرلیں اور میری یادداشت پر نہ جائیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ زبان اور لہجہ نرم اور مناسب ہونے چاہئیں۔"

شیرانی صاحب کے حسب الارشاد شمس العلماء کا جواب اُن کی خدمت میں ارسال کردیا گیا۔ اب ہر روز مَیں شیرانی صاحب کی ہدایات کا انتظار کر رہا تھا کہ ناگہاں ۱۶ فروری ۱۹۴۶ء کو ٹونک سے اُن کے اِنتقال پُرملال کی اطلاع ملی۔ یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی کہ شیرانی صاحب بسترِ مرگ پہ لیٹے لیٹے شمس العلماء کے جواب کا مطالعہ کرسکے یا نہیں۔ خدا کرے کہ یہ اُن کے ملاحظہ سے نہ گزرا ہو۔ اس کا لہجہ بعض مقامات پر سخت دلآزار واقع ہوا ہے۔ اگر شمس العلماء کی تحریر اُستادِ مرحوم کی نظر سے گزر چکی ہو۔ تو مَیں اُن کی رُوح سے سخت نادم ہوں کہ اُن کی زندگی کے آخری لمحات میں نادانستہ طور پر مَیں اُن کی ذہنی کوفت کا باعث ہوا۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے شمس العلماء کی توجہ جواب تبصرہ کی طرف سب سے پہلے سیّد حسن امام نے مبذول کرائی۔ اور ان کو باصرار تمام اس فرض کی انجام دہی پر آمادہ کیا۔ جواب تبصرہ کے پہلے تیرہ صفحے ہی دیکھ کر سیّد موصوف شمس العلماء کو لکھتے ہیں ماشاءاللہ قیاس سے بڑھ کر کامیاب جوابات ہیں۔ خدا کرے آئندہ بھی یہی حال ہو۔"

چونکہ یہ جواب سیّد حسن امام کی تحریک سے شروع کیا گیا تھا شمس العلماء کے بھائی حکیم محمد عبدالباقی ندوی جو اس جواب کے ناشر ہیں سیّد صاحب کے شُکر گزار ہیں کہ اُن کے ذریعے سے یہ ضروری ادبی خدمت عمل میں آئی۔ حکیم صاحب کی رائے ہیں "یہ جواب نہایت دِلچسپ اور اُمید سے بڑھ کر کامیاب رہا۔ اور علمی میدان کے مُسافروں کے لئے ایک ہموار شاہراہ بن گئی جو سلامت روی کی ضامن ہو۔ بیچارے سیّد حسن امام اور حکیم عبدالباقی کو اس بات کا علم نہیں کہ شمس العلماء کے جوابات نے اُن کے علم وفضل کی حقیقت کو پوری طرح بے نقاب کردیا ہے۔ خیر ان حضرات کو تو شاید اس بنا پر معذور قرار دیا جائے کہ فارسی زبان اور ادب کی تاریخ سے وہ

کما حقہٗ واقف نہیں ہیں۔ لیکن سیّد ریاست علی ندوی جیسے عالم کے لئے جنھوں نے دارالمصنّفین اعظم گڈھ کی طرف سے خط و کتابت کے فرائض انجام دئے یہ عذر کیونکر تسلیم کیا جاسکتا ہی۔ اُن کی رائے بھی جواب تبصرہ کے بارے میں سُننے کے لائق ہی۔ اپنے خط مورخہ ۷ر ستمبر ۱۹۴۴ء میں لکھتے ہیں:۔ "آپ کا پُر لطف جواب نقد قسط وار پہنچتا رہا۔ آپ نے سطر بہ سطر جواب دینے میں غیر معمولی زحمت اُٹھائی اور خُشک مضمون کو اپنے پیرایۂ بیان سے اس قدر دلچسپ اور دلآویز بنادیا کہ ایسے خُشک اعتراض و جواب پر ایسی دلچسپ تحریر کم نظر سے گزری ہی" یہاں جواب کے محض پُرلطف ہونے کا ذکر ہی۔ اور لیجئے۔ اپنے دوسرے خط مورخہ ۷ر ستمبر ۱۹۴۴ء میں شمس العلماء کی تحریر کی معقولیت پر یہ کہہ کر مُہر تصدیق ثبت کرتے ہیں کہ "آپ کی یہ تحریر نہایت معقول ہی" آیئے دیکھیں اس بیان میں صداقت کس قدر ہی۔

پیشتر اس کے کہ شمس العلماء کے ارشادات کی معقولیت سے بحث کی جائے یہ نہایت ضروری ہی کہ ان کی تحریر کے بعض اقتباسات قارئین کرام کی خدمت میں پیش کئے جائیں۔ تاکہ انہیں بھی شمس العلماء کے لہجے اور زبان کی نرمی کا اندازہ ہو جائے۔ اپنے جواب میں شمس العلماء نے کئی جگہ مرحوم شیرانی صاحب پر چھینٹے اُڑائے ہیں۔ بار بار اُن کے انگریزی عبارت کے ترجمے میں سُقم دکھلانے کی کوشش کی گئی ہی۔ اور کہیں اُنھیں بصیرت سے محروم قرار دیا ہی۔ چند اقتباسات درجِ ذیل ہیں:۔

جواب تبصرہ صفحہ ۴۶:۔

مبصر نے اصل انگریزی کا مفہوم نہیں سمجھا۔ جیسا کہ وہ اس سے پہلے بھی کئی جگہ لغزش کھا چکے ہیں،

ص ۴۹:۔

لیکن مبصر نے انگریزی کے اقوال قلمبند کرنے میں بہت بے احتیاطی سے کام لیا ہی اور مصنّف کی انگریزی عبارت کے مفہوم کو دیانت کے ساتھ

پیش نہیں کیا۔ یا تو مبصر پہلے کی طرح انگریزی کا صحیح ترجمہ نہیں کر سکے یا یہ کہ انھوں نے ترجمے کو اپنے نظریے کے مطابق کر کے ایسے الفاظ میں پیش کیا ہو جس سے مُصنّف کا مفہوم عبارت بدل گیا۔

صفحہ ۶۴:-

لیکن وہ سیاہی جو مبصر کے ذہن میں سمائی ہو اور جس کے اظہار کی وہ مصنّف کو تاکید فرما رہے ہیں وہ حنا سے نہیں بلکہ تارکول سے ہوتی ہو۔

صفحہ ۶۸:- مُصنّف کی عبارت میں لفظ آج (Today) موجود نہیں جو مبصر کا جعلی مستزاد ہو۔

صفحہ ۸۶:-

تخریب کار دو نان و تعمیر کار ہوشمندان است،

صفحہ ۱۱۲:-

حق و باطل کی جنگ میں حق غالب ہو کر رہے گا !!

ان چند اقتباسات سے ناظرین شمس العلماء کے لب و لہجہ کا اندازہ کر سکتے ہیں غالباً شمس العلماء جیسا ہی کوئی حاجی ہو گا جس کی خوش خلقی سے تنگ آکر شیخ شیراز کو کہنا پڑا تھا ؏

کہ رحمت بر اخلاقِ حجّاج باد

جن حضرات نے شیرانی صاحب کا ناقدانہ تبصرہ پڑھا ہے وہ یقیناً شمس العلماء کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے اُن کے اس شدید غیظ و غضب کے لئے انھیں معذور سمجھیں گے۔ اس لئے کہ اس تبصرے کے بعد اہلِ ذوق کے نزدیک اصل کتاب کی قدر و قیمت بہت کم رہ جاتی ہو۔ اس بات کا پتہ لگانا شاید دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ شیرانی صاحب کے تبصرے سے خود مُصنّف کے ذہن پر کیا کیفیت طاری ہوئی۔ شمس العلماء ایک عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ ایک طرف ایسی شدید اور صریح غلطیاں موجود ہیں کہ انھیں تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ دوسری طرف

کتاب کی علمی قدر و قیمت محل نظر ہو۔ ایسے صبر آزما حالات کا مقابلہ کیا جائے تو
کیونکر۔ شمس العلماء بڑی کشمکش کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اپنی غلطیوں کے
اعتراف کے ساتھ ساتھ شیرانی صاحب کے بیانات کی تردید اس زور سے کیجائے
کہ سادہ دل پڑھنے والے اس سے متأثر ہو جائیں شمس العلماء یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں
کہ وہ مبصر کے اعتراضات سے قطعاً مرعوب نہیں ہیں اور چونکہ انھیں شیرانی صاحب
کے تبصرے سے پبلک میں غلط فہمی پھیلنے اور صحیح علمی ذوق کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے
اس لئے وہ جواب تبصرہ لکھنے کے لئے تیار ہو گئے ہیں۔ "تاکہ ارباب حل و عقد (کذا)
مبصر کے اعتراضات اور ان کے بالمقابل مصنف کے جوابات کو پڑھ کر صحیح فیصلہ
کر سکیں"۔ لیکن جواب تبصرہ کے لکھے جانے کا اصلی سبب وہ جسے شمس العلماء
کے بھائی حکیم محمد عبد الباقی نے "عرض ناشر" میں بیان کیا ہے۔ اور وہ یہ کہ "صاحب
تبصرہ نے درحقیقت اپنی تمام امکانی کوشش سے اعتراضات کا کوئی ایسا پہلو
نہیں چھوڑا جو اُن کے نزدیک مصنف کی کتاب کو قاری کی نظر میں ناقص و ناکارہ
ثابت کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی کرتا"۔ "درحقیقت یہ کتاب کے ناقص و ناکارہ
ٹھہرنے کا اندیشہ ہے جس نے شمس العلماء کو جواب لکھنے پر مجبور کر دیا ہے" شمس العلماء کبھی تو
مبصر کی عظیم الشان کاوش اور جد و جہد کو "کوہ کندن و کاہ برآوردن" کے برابر سمجھتے ہیں
اور کبھی اس بات کا اعتراف بھی کر لیتے ہیں کہ ان کی کتاب کے لئے "مبصر کا تبصرہ ایک
حد تک نفع بخش ثابت ہوا"۔ اور "مبصر نے اپنے تتمۂ تبصرہ کے ذیل میں جو کچھ
ضروری مواد اور مزید قابلِ ذکر مصنفین و شعرا کے نام پیش کئے ہیں وہ سب مصنف
کو قبول و منظور ہیں اور ان کے نزدیک مبصر کا یہ قول کہ "جس قدر کام پروفیسر نے
کیا ہے اس سے کہیں زیادہ چھوڑ گئے ہیں"۔ حقیقت پر مبنی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی
انھیں افسوس اس امر کا ہے کہ تبصرے کے ۲۰۰ صفحات میں سے تقریباً ایک سو صفحات
محض خیال آرائیوں اور صحیح کو غلط ٹھہرانے اور ذاتی نقطۂ نظر کی غیر ضروری تبلیغ اور
اس کو معیار جائزہ قرار دے کر اسی کے مطابق مصنف کو اصلاحات کہنے کا مشورہ

دینے سے رنگے ہوئے ہیں۔" حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ خود شمس العلماء کی کتاب کے صفحات ان تمام خیال آرائیوں سے پُر ہیں۔ اور اُنھوں نے بعض فرضی اور بے بنیاد چیزوں کی تبلیغ اپنے لئے فرض قرار دی ہے۔

اگرچہ شمس العلماء کی اصل کتاب میں قارئین کی ضیافتِ طبع کے لئے کافی سامان موجود ہے۔ تاہم ان فروگذاشتوں کے سلسلہ میں نادانستگی کا عذر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اور ایک غیر جانبدار اور انصاف پسند شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ غلطیاں ناواقفیت کی بناء پر ہیں۔ اور ان میں نیّت اور ارادے کو کوئی دخل نہیں۔ لیکن جوابِ تبصرہ محض غلط اور لاطائل چیزوں کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ اس میں لاعلمی اور ناواقفیت سے کہیں زیادہ قابلِ اعتراض لفظی اور معنوی تحریف ہے جس سے جا بجا کام لیا گیا ہے۔ محض جواب کی خاطر بعض چیزیں گڑھ لی گئی ہیں یا بعض حقائق سے انکار کر دیا گیا ہے۔ مثلاً شیرانی صاحب نے عنصری کی مثنوی وامق و عذرا کے چند شعر اس عکس سے جو حضرۃ الاستاذ پرنسپل محمد شفیع صاحب مدظلہ نے اگست ۱۹۳۷ء کے اسمٰعیل کالج میگزین میں شائع کیا ہے اپنے تبصرے میں نقل کئے۔ پہلا شعر یوں درج ہے:۔

جوانی خرد مند مادرش مُردہ بود

پدر نیز دیگر زنی کردہ بود

وزن اور بحر کے لحاظ سے یہاں 'مند' زائد معلوم ہوتا ہے لیکن عکس میں وہ صاف موجود ہے۔ شیرانی صاحب اس کے سامنے علامتِ استفہام ڈالنا بھول گئے۔ اگر شمس العلماء اس بھول کی طرف اشارہ کر دیتے تو بات ہر ایک کی سمجھ میں آ سکتی تھی۔ لیکن اُنھوں نے یہ غضب کیا کہ لکھنؤ کے کسی کتاب خانے سے اس مثنوی کا ایک فرضی نسخہ جس میں پہلا مصرعہ بغیر سکتہ واقع ہوئے وزن صحیح کے ساتھ اس طرح تحریر ہے:۔

"جوانی نژند مادرش مُردہ بوُد"

کیا کوئی شخص جسے عروض سے ذرا بھی مس ہے شمس العلماء کے نقل کردہ مصرع کے وزن کو صحیح کہہ سکتا ہے۔ دوسرے شعر کے پہلے مصرع میں شمس العلماء نے جو اصلاح

کی ہے وہ بھی قابلِ غور ہے۔ فرماتے ہیں کہ لکھنوی نسخہ میں یوں درج ہے:۔

زنی بد گہر معشقولیاش نام

اُن کے نزدیک یہ تبصرے کے نقل شدہ مصرع " زنی بد کنش معشقولیہ نام سے بہتر ہے۔ ہمیں شمس العلماء کی نیک نیتی پر شبہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔" تاہم اپنے اطمینانِ قلب کی خاطر ہم ان سے یہ درخواست کر سکتے ہیں کہ وہ ہمیں اُس خوش قسمت کتابخانے کے نام سے مُطلع کریں جہاں سے انھیں عنصری کی مثنوی وامق و عذرا کا نسخہ ملا ہے۔ اور اس کے چند ابتدائی اشعار نقل کر کے اہلِ علم کو ممنون فرمائیں۔ جس طرح یہاں ایک موہوم چیز کو موجود بنا کر پیش کیا گیا ہے اسی طرح حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے متعلق فرشتہ کے اس قول کے بارے میں کہ " تولد او در بلدۂ سجستان بودہ " ایک موجود چیز سے اس بنا، پر انکار کر دیا گیا ہے کہ " فرشتہ کا جو نسخہ مُصنّف کے پاس ہے اس میں مبصر کی منقول عبارت موجود نہیں "۔ خدا جانے شمس العلماء کے پاس فرشتہ کا کون سا نُسخہ ہے جس میں یہ عبارت غائب ہے۔ اگر شمس العلماء خفا نہ ہوں تو ہم اُن کے مملوکہ نسخے کا سُراغ لگانے کی کوشش کریں۔ اپنے جواب میں تین چار جگہ اُنھوں نے فرشتہ کا حوالہ دیا ہے۔ صفحہ ۱۷ پر جلد اوّل صفحہ ۱۸ کا۔ صفحہ ۵۰ پر جلد اوّل صفحہ ۲۸ کا صفحہ ۶۰ پر جلد اوّل۔ صفحہ ۳۳ کا صفحہ ۱۰۱ پر جلد اوّل صفحہ ۸۲ کا، اور صفحہ ۱۱۱ پر جلد اوّل صفحہ ۵۷ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اگر ہم ان مُندرجات کا مقابلہ فرشتہ کے نولکشوری ایڈیشن سے کریں تو یہ تمام بیانات ان ہی صفحات پر پائے جاتے ہیں جن کا حوالہ شمس العلماء کے جواب میں دیا گیا ہے۔ اس تطابق کی بناء پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ شمس العلماء کے پاس نولکشوری ایڈیشن ہونا چاہیئے اور اگر انھیں اب بھی انکار ہو تو اڈیشن کا سال بتلا دیں تا کہ ہم نیاز مند فرشتہ کے یہ الفاظ اس میں سے بھی ڈھونڈ کر اُن کی خدمت میں پیش کر سکیں۔

شمس العلماء نے اپنی غلطیوں پر پردہ ڈالنے کی عجیب و غریب ترکیبیں وضع کی ہیں۔ عام طور پر وہ سہوِ نظر یا لغزشِ قلم کہہ کر اُن کی اہمیت کو کم کرنا چاہتے ہیں،

ان کے نزدیک "صرف معدودے چند اغلاط مندرج تبصرہ" ہیں جن کی اصلاح غلط نامۂ جدید میں کردی گئی ہی۔ حالانکہ چالیس کے قریب تو ایسی غلطیاں ہیں جن کو اُنھوں نے اپنے جواب میں تسلیم کیا ہی۔ تیس کے قریب ایسی غلطیاں ہیں جن کی طرف اُنھوں نے اشارہ تک نہیں کیا اور پھر کئی ایسی غلطیاں بھی ہیں جن کو انھوں نے مختلف تاویلوں سے درست ثابت کرنے کی کوشش کی ہی۔ تعجب ہی کہ سید ریاست علی ندوی جیسے فاضل کو شمس العلماء کی تحریر معقول نظر آئی۔ حالانکہ یہ تحریر بقول اُن کے کتنی ہی "پُرلطف اور دلچسپ" کیوں نہ ہو کم از کم معقولیت سے مُعرّا ہی۔ اسے تو بر سبیل تنزل مُناظرہ بھی نہیں کہا جاسکتا کیونکہ یہ مکابرہ و مجادلہ کی نہایت بُری مثال ہی۔ کسی چیز سے ناواقف ہونا کوئی عیب کی بات نہیں۔ لیکن اپنی ناواقفیت پر بیجا اصرار ایک عالم کے شایانِ شان کیونکر ہوسکتا ہی۔ شمس العلماء نے اپنے جواب کے دوران میں بارہا اس بے جا ضِد کا مظاہرہ کیا ہی۔ شیرانی صاحب کی طرف غلط بیانات منسوب کئے گئے ہیں۔ اُن کے صاف اور صریح بیانات میں افسوس ناک تحریف کی گئی ہی۔ کہیں اصل سوال کے جواب سے پہلوتہی کی گئی ہی۔ اور کئی بار اپنی غلطی تسلیم کرنے کی بجائے شمس العلماء اپنی حیثیت ایک ناقل کی سی قرار دیتے ہیں جسے نقد و درایت سے کوئی واسطہ نہیں اور جس کا کام بغیر تحقیق و تفتیش کے فقط نقل کرنا ہی۔ شمس العلماء کی کتاب کا ایک تاریک پہلو یہ بھی ہی کہ وہ بعض اوقات اُن ہمعصر محققین کا ذکر نہیں کرتے جن کی تحقیقات سے وہ فائدہ اُٹھاتے ہیں حالانکہ ایک مُصنّف کیلئے اس قسم کا اعتراف بہت ضروری ہی۔

اِس مختصر تمہید کے بعد ہم مختلف عُنوانات کے تحت شمس العلماء کے بیانات کا جائزہ لیں گے۔

غلطی اور اُس پر بیجا اصرار

جواب تبصرہ صفحہ ۱۰: "مُصنّف نے افراسیاب کو ایران کا بادشاہ کب اور کس جگہ کہا ہی؟ ایسا سمجھنا مبصرؔ کے فہم کا قصور ہی۔ مُصنّف نے

افراسیاب کو صفحہ ۸ پر (persian king) یعنی ایرانی یا
عجمی الاصل بادشاہ کہا ہے۔ مبصر کو اگر اعتراض ہی کرنا تھا تو وہ افراسیاب کے سلسلۂ نسب کی کھوج لگا کر یہ کہتے کہ وہ ترکی الاصل ہے جو واقعی صحیح ہوتا۔ مگر چوک گئے۔

"رسیدہ بُود بلائے ولے بخیر گذشت"

جب خود شمس العلماء کو تسلیم ہے کہ افراسیاب ترکی الاصل تھا۔ پھر اُسے ایرانی الاصل کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ تُوران کا بادشاہ تھا نہ کہ ایران کا۔ غلطی سے افراسیاب کو ایرانی بادشاہ کہنا اور اُس پر اصرار کرنا شمس العلماء کی صریح زبردستی ہے۔

صفحہ ۱۰۔ بَرزُویہ کو شمس العلماء نے اپنی کتاب میں بُرزَوَیہ لکھا تھا شیرانی صاحب نے اپنی تائید میں فردوسی کا یہ قول نقل کیا ہے:۔

پزشک سرانیدہ بَرزُوی بود بہ پیری رسیدہ سخن گوی بُود

بجائے اپنی غلطی تسلیم کرنے کے شمس العلماء کہتے ہیں کہ درحقیقت اس کے تلفّظ میں اختلاف ہے۔ اور فردوسی کی شہادت اُن کے نزدیک قابلِ قبول نہیں۔ کاشش شمس العلماء اپنے بیان کی تائید میں کوئی حوالہ پیش کر کے یہ دعوٰی کرتے۔ تو شاید مناسب ہوتا۔ فردوسی کا قول تسلیم کرنے میں شمس العلماء کو اس بناء پر تامّل ہے کہ نظم میں ضرورتِ شعری کے باعث تصرّف کے لئے بہت گنجائش رہتی ہے۔ خیر یوں ہی سہی۔ ہم "مجمل التواریخ والقصص[1]" کا ایک حوالہ درج کرتے ہیں جسے ملک الشعرا بہار نے اپنی سُبک شناسی کی جلد دوم (صفحہ ۱۲۷) میں نقل کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ لفظ برزوی کا صحیح تلفّظ متعیّن کرنے کی بھی کوشش کی ہے:۔

"ازیں پس فرستادن برزوی طبیب بود بہندوستان تا آنجا بماند

---

۱ ملک الشعراء بہار کا بیان ہے کہ یہ کتاب ۵۲۰ھ میں تالیف ہوئی۔ اور اس کا مؤلف جو اسد آباد ہمدان کا رہنے والا ہے امرای سلجوقی کی ملازمت میں کتابت اور ندیمی کے فرائض انجام دیتا تھا۔

بمد تہا و پر گشت و بحیلت کلیلہ و دمنہ با یران آورد پیشِ شاہ و درِ بُرزوی بزرجمہر در آن فزود بفرمان شاہ تا رنج او ضائع نگردد ......"

اس کے علاوہ کلیمان ہوارکی 'عربک[۱] لٹریچر' میں Bazuya اور انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں کلیلہ و دمنہ کے مضمون کے تحت میں Burzoe درج ہی۔

صفحہ ۱۶ - برکست مفرد لفظ ہی یا مرکّب۔ شیخ سرجویہ کے فارسی جُملے "برگست من نہ گفتم آن پسر مناذر گفت" میں جسے شمس العلماء نے کتاب الاغانی سے نقل کیا ہی وہ 'برکست' کو بہ تحریک سین مانتے ہیں اور اس کے معنی "کسی کے متعلق" لیتے ہیں۔ حالانکہ 'برکست' خواہ کاف عربی ہو یا کاف عجمی ایک مفرد لفظ ہی جس کے معنی حاشا و معاذ اللہ ہیں۔ بظاہر یہ اتنی آسان بات ہی کہ ہر شخص کی سمجھ میں آسکتی ہی لیکن شمس العلماء اس کو ماننے سے یکسر انکار کر دیتے ہیں۔ یہی نہیں کہ اُنھیں اپنی غلطی پر اصرار ہی بلکہ اُنھوں نے اپنی حمایت میں ایک زرّین اصول بیان کیا ہی۔ جو ان ہی کے الفاظ میں درج کیا جاتا ہی:-

"جس نسخے سے عبارتِ بالا نقل کی گئی ہی اس میں برکست با کاف عربی ہی۔ لہٰذا خواہ مخواہ اصلاح دے کر اُس کو با کاف عجمی پڑھنا اور پھر اُسی قرأت کے مطابق معانی پیدا کرنا مُصنّف کے نزدیک دیانت سے بعید امر تھا۔ مُصنّف کے نزدیک ایسی تحریف قطعاً ناجائز ہی تا وقتیکہ کتابت کی کوئی ایسی فاحش غلطی یا نقصِ معنی نظر نہ آئے۔ جو عبارت کو مہمل بنا دے۔ یہی طریقہ محقّقین یورپ کا ہی"۔

شمس العلماء کا اپنا بیان کیا کم زوردار تھا کہ وہ محقّقین یورپ کو بھی اس خارزار میں گھسیٹ لائے۔ سب سے پہلی چیز جو ہماری توجّہ کی مستحق ہی وہ ماخذ کا بزبانِ عربی ہونا ہی۔ یہ فارسی جُملہ کتاب الاغانی سے نقل کیا گیا ہی۔ عربی زبان کا ہر مُبتدی بھی اس حقیقت سے واقف ہی کہ عربی میں کاف عجمی نہیں ہوتا۔ لہٰذا شمس العلماء کا

---

[۱] عربک لٹریچر صفحہ ۲۱۲،

یہ کہنا کہ جس نسخے سے عبارت بالا نقل کی گئی ہے اس میں برکست باکاف عربی ہے صرف غیر متعلق ہی نہیں بلکہ نادرست بھی ہے۔ پھر یہاں سوال کاف عجمی یا کاف عربی کا نہیں۔ اسے برکست پڑھئے یا برگست بہرحال یہ ایک مفرد لفظ رہتا ہے جس کے معنی حاشا اور معاذ اللہ ہیں۔ چونکہ الاغانی میں برکست درج ہے شمس العلماء نے اس کے معنی کسی کے متعلق بتائے اور جب انہیں اس بات پر متنبہ کیا گیا تو انھوں نے کاف عربی کا سہارا ڈھونڈا جو کسی طرح بھی اُن کے مفید مطلب نہیں شمس العلماء کو یہ بھی سوچنا چاہئے تھا کہ کہیں اُن کے بتائے ہوئے معنی مضحکہ خیز تو نہ بن جائیں گے۔ کیونکہ یہ مرکب لفظ شمس العلماء کے یہاں ملے تو ملے اور کسی جگہ نہ ملے گا۔

کتاب الاغانی کا یہی جملہ جلال ہمائی نے اپنی تاریخ ادبیاتِ ایران[۱] میں نقل کیا ہے۔ "برکست من نہ گفتم آن پسر منا ذر گفت داء المرء من تحت"۔ اور حاشیہ میں فرہنگ برہان جامع کے حوالے سے اس کے معنی "خدا نکند، و معاذ اللہ" دئے ہیں۔

صفحہ ۱۹۔ ابوالعباس اسفرائنی نصر بن احمد سامانی کے دربار کا میر منشی تھا؟

سلطان محمود غزنوی کے وزیر فضل بن احمد اسفرائنی (متوفی ۴۰۴ھ) کے سلسلے میں شمس العلماء لکھتے ہیں کہ "پہلے وہ نصر بن احمد سامانی کے دربار کا میر منشی تھا اور بعد میں سبکتگین کا وزیر بنا۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں اس لئے کہ اسفرائنی نہ نصر بن احمد سامانی متوفی ۳۳۱ھ کا میر منشی تھا اور نہ ہی کبھی سبکتگین کا وزیر بنا۔

تذکرۂ سلاطین آل غزنین میں بھی جو ایک گمنام کتاب ہے اور جس سے شمس العلماء اکثر استشہاد کرتے ہیں کہیں نصر بن احمد سامانی کا مذکور نہیں ملتا۔ وہ صرف امیر نصر کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن ہمارے شمس العلماء کا ذہن فوراً نصر بن احمد سامانی کی طرف منتقل ہوتا ہے اور وہ اس طویل زمانے کے فاصلے کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں جو امیر نصر بن احمد اور ابوالعباس اسفرائنی کے درمیان حائل ہے۔ جب شیرانی صاحب کے ٹوکنے پر شمس العلماء کو اپنی غلطی کا احساس ہوا بھی تو ذمہ داری سے یہ کہہ کر گریز کرتے ہیں

---

[۱] تاریخ ادبیاتِ ایران جلد دوم صفحہ ۲۸۹،

"العصا لا علی الوادی" لیکن چونکہ اس تاویل سے ان کا اپنا دل بھی مطمئن نہیں۔ اس لئے فرماتے ہیں کہ ممکن ہی کہ امیر نصر سے مُراد امیر ناصر الدین سبکتگین ہو۔ یا اس کا فرزند ہو جو امیر نصر کے مخصوص لقب سے یاد کیا جاتا ہی۔ اب اگر شمس العلماء نے اپنی غلطی تسلیم کرلی ہوتی تو وہ ان دور از کار تاویلات کی زحمت سے بچ جاتے۔ آج پہلی مرتبہ ہم اُن سے یہ سُن رہے ہیں کہ امیر نصر سے مُراد امیر ناصر الدین سبکتگین بھی ہوسکتا ہی۔ نصر سبکتگین کے بیٹے کا نام ہی نہ کہ اس کا مخصوص لقب۔ زین الاخبار کے صفحات ۶۰، ۶۳ اور ۷۹ پر امیر نصر بن ناصر الدین کا ذکر موجود ہی۔ اسی طرح عتبی کی تاریخ میں جو الیمینی کے نام سے مشہور ہی صفحات ۱۶۸ و ۱۶۹ پر صاحب الجیش ابو المظفر نصر بن ناصر الدین سبکتگین درج ہی۔ ابو العبّاس اسفرائنی کے حالات کے لئے شمس العلماء کو عتبی کی تاریخ کی طرف رجُوع کرنا چاہیئے تھا۔ اور اگر یہ ممکن نہ تھا تو کم از کم ڈاکٹر محمد ناظم کی کتاب "سُلطان محمود کے متعلق" ہی دیکھ لیتے۔ اسفرائنی کے بارے میں اُن کو صحیح اطلاع مل جاتی۔

صفحہ ۱۹۔ کیا شاہنامہ کی تکمیل اسدی طُوسی نے کی؟ "شمس العلماء کا یہ قول کہ ابو العبّاس نے شاہ نامے کی تصنیف کے واسطے فردوسی کی سفارش کی، صحیح بُنیاد پر قائم نہیں۔ کیونکہ فردوسی محمود کی تخت نشینی سے بیس سال پہلے سے اس کتاب پر مصروف تھا۔ چنانچہ:۔

سخن را نگہ داشتم سال بیست   بدان تا سزاوار این گنج کیست

ایک اَور موقعہ پر کہا ہی:۔

ہمی گفتم این نامہ را چند گاہ   نہان بود از چشم خورشید و ماہ

البتہ شاہی دربار میں فردوسی کا تعارف ابو العبّاس کے توسّط سے ہوتا ہی۔"

شیرانی صاحب کا یہ بیان بالکل واضح ہی۔ دربارِ شاہی میں آنے سے ایک عرصہ پیشتر سے فردوسی شاہ نامہ کی تصنیف میں مصروف رہ چُکا ہی۔ اس لئے یہ کہنا کہ ابو العبّاس اسفرائنی نے اس کی تصنیف کیلئے سفارش کی کسی طرح صحیح نہیں۔

یہ ایک معمولی سی فروگذاشت تھی جسے شمس العلماء اگر نظر انداز کر دیتے تو بہت بہتر ہوتا۔ لیکن شمس العلماء چھوٹی غلطی سے بچنے کی بجائے بڑی غلطی کا مرتکب ہونا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اور شاہ نامے کی تالیف کے آغاز اور اختتام سے متعلق بحث چھیڑ دیتے ہیں جو اُن کے بس کی بات نہیں۔ اور اس سلسلے میں دولت شاہ کی ضعیف روایت پر بھروسا کر کے اسدی طوسی سے فردوسی کی تکمیل شاہ نامہ کیلئے درخواست کو صحیح مانتے ہیں جسے اسدی منظور کر لیتا ہے۔ اور ایک رات اور ایک دن میں تا تمازِ دیگر چار ہزار اشعار لکھ کر فردوسی کو سُناتا ہے جو اُستاد کے کمال کی تعریف کرتا ہے۔ اس روایت کی سخافت اور کمزوری اس درجہ عیاں ہے کہ شمس العلماء کا دل بھی اُس پر مُہرِ تصدیق لگانے کے لئے تیار نہیں۔ چنانچہ وہ اس روایت اور قصے کو ضعیف اور مجہول ماننے پر رضامند ہوتے ہوئے بھی تذبذب کے عالم میں ہیں۔ اس لئے کہ "خاتمۂ شاہ نامہ جس کو اکابر مؤرخین نے اسدی طوسی کا کلام تسلیم کیا ہے۔ آج بھی موجود ہے۔ جس کی تکذیب نہیں کی جا سکتی"۔

خدا جانے یہ کون سے اکابر مؤرخین ہیں جن کا نام تک شمس العلماء ہمیں نہیں بتاتے۔ ہمارے خیال میں ان کا ماخذ تذکرۂ دولت شاہ ہے۔ یا پھر وہی مجہول اور گم نامہ تذکرۂ سلاطینِ آلِ غزنین جو خوش قسمتی سے ان کے کتاب خانے کی زینت ہے۔ فرشتہ نے اس واقعہ کا ذکر ضرور کیا ہے۔ لیکن اس کا بیان دولت شاہ کے بیان کی تقریباً لفظ بلفظ نقل ہے۔ دولت[۱۵] شاہ کے الفاظ یہ ہیں:-

و آن نظم از اوّل استیلای عرب است بر عجم در آخر شاہ نامہ و آمدن مغیرہ بن شعبہ بہ سالت نزد یزدجرد شہریار و حرب سعد بن وقاص بملوک عجم و ختم شاہ نامہ و فضلا بر آنند کہ آنجا نظم فردوسی آخر شدہ و نظم اسدی رسیدہ و ظاہراً بفراست معلوم می توان کرد۔

اگر شمس العلماء کی فراست اس بے سر و پا قصے کی صحت کی قائل ہے تو ہو۔ ورنہ

---

۱۵ تذکرۂ دولت شاہ۔ طبع لاہور۔ صفحہ ۱۶۔

موجودہ زمانے کے محقق اسے پرِ کاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دیتے۔ پروفیسر سید نفیسی "احوال و اشعار رودکی" کی جلد سوم (صفحہ ۱۲۰۷) میں لکھتے ہیں:-

"پارہ ای از مؤلفان اسدی را استاد فردوسی دانستہ اند و بہمین جہت خاور شناسان اروپائی کوشیدہ اند ثابت کنند کہ دو اسدی بودہ اند یکی پدر کہ گویندۂ مناظرات و اُستاد فردوسی باشد و دیگر پسر او کہ اسدی دوم و مؤلف گرشاسپ نامہ باشد ولی این نکتہ کاملاً باطل است و این کہ اسدی نامی اُستاد فردوسی بودہ باشد بہیچ وجہ اساس ندارد و یک اسدی طوسی بیشتر نبودہ است کہ ہمہ این آثار از وست۔"

ڈاکٹر رضا زادہ شفق[۵۱] اسدی اوّل کا ذکر تک نہیں کرتے اور صرف اسدی دوم کا تذکرہ کرتے ہوئے اسے مناظرات چہار گانہ کا مُصنّف ٹھہراتے ہیں۔

اس ضمن میں یہ بات فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ براؤن[۵۲] جو اسدی کلاں اور اسدی صغیر کے علیحدہ وجود کے قائل ہیں اسدی کلاں کے خاتمۂ شاہ نامہ کے مُصنّف ہونے کے متعلق دولت شاہ کی روایت کو غلط اور بے معنی قرار دیتے ہیں۔

مولانا شبلی جن کے پاکیزہ ذوق کا اعتراف ہر موافق اور مخالف کو ہے شعر العجم کے حصّہ[۵۳] اوّل میں لکھتے ہیں:-

لیکن ہمارے نزدیک یہ روایت محض فرضی اور غلط ہے۔ نہ شاہ نامہ ناتمام رہا تھا نہ اسدی فردوسی کا اُستاد تھا۔ نہ اسدی فردوسی سے ایسی فرمائش کر سکتا تھا۔ نہ ایک رات دِن میں اسدی سے چار ہزار شعر لکھے جا سکتے تھے"۔

بدیع الزمان "سخن و سخنوران" کی جلد دوم کے صفحہ ۹۴ پر لکھتے ہیں:- "و اُستادی اسدی نسبت بفردوسی نغمۂ ناراستی است کہ از ساز دولت شاہ برآمدہ است"۔

---

۵۱ تاریخ ادبیاتِ ایران صفحہ ۱۴۱؛ ۵۲ ایران کی ادبی تاریخ جلد دوم صفحہ ۱۴۸ و ۱۴۹؛
۵۳ شعر العجم (دسمبر ۱۹۴۶ء) صفحہ ۱۸۲؛

اسی طرح مجمع الفصحا میں رضا قلی ہدایت اس افسانے کے بارے میں لکھتے ہیں "بجہات چند خطا ست"۔ وہ کون سے اکابر مورخین ہیں جو خاتمۂ شاہ نامہ کو اسدی طوسی کا کلام تسلیم کرتے ہیں۔

صفحہ ۲۳ ـ قصر شیرین کی شکستہ محراب پر فارسی شعر لکھا ہوا پایا گیا۔

اپنی کتاب کے صفحہ ۸۱ پر شمس العلماء دولت شاہ کے حوالے سے فرماتے ہیں۔

"فارسی شعر کی ایک اور اچھی مثال اس کتبے میں ملتی ہی جو قصر شیریں کی شکستہ محراب پر لکھا ہوا تھا۔ اور جس کا انکشاف عضد الدولہ دیلمی کے زمانے میں ہوا۔ یہ شعر بہرام گور کے زمانے سے بھی اقدم سمجھا جاتا ہی:۔

ہژبرا بگیہان انوشہ بذی
جہاں را بدیدار توشہ بذی"

بیشتر اس کے کہ ہم اس بیان کی صحت اور عدم صحت کے متعلق کچھ عرض کریں یہ بتانا بہت ضروری ہی کہ یہ بیان دولت شاہ کے بیان سے مختلف ہے۔ دولت شاہ تو ابو طاہر خاتونی (مصنف مناقب الشعرا) کے حوالے سے یہ کہہ رہا ہے کہ "عضد الدولہ دیلمی کے عہد میں جبکہ قصر شیرین جو خانقین کی نواحی میں ہی بالکل ویران نہ ہوچکا تھا اس کے کتابہ (کتبہ) میں یہ شعر لکھا ہوا پایا گیا جو فارسی قدیم کے دستور کے موافق ہی:۔

ہژبرا بگیہاں انوشہ بذی
جہاں را بدیدار توشہ بذی

بنا برین تقدیر یہ معلوم ہوتا ہی کہ اسلام سے قبل بھی شعر کہتے تھے"

شمس العلماء کا یہ ارشاد کہ یہ شعر بہرام گور کے زمانے سے بھی اقدم سمجھا جاتا ہی اُن کا اپنا اضافہ ہی جس کے لئے اُن کے پاس کوئی سند نہیں۔ جب شیرانی صاحب نے یہی شعر معمولی لفظی تبدیلی کے ساتھ شاہ نامہ میں لکھا ہوا بتایا:۔

بدو گفت شاپور انوشہ بذی جہاں را بدیدار توشہ بذی

تو شمس العلماء اپنی حیثیت محض ایک ناقل کی سی تسلیم کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"مُصنّف نے اپنی اس اطلاع کا مآخذ نقل کر دیا ہے اور شعر کے متعلق اپنی کسی رائے کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ جو کچھ لکھا ہے وہ صرف دوسروں کا قول ہے جس کے اصل جواب دہ وہی رواۃ ہیں۔"

قارئین خود انصاف فرمائیں کہ شمس العلماء کا یہ بیان کہاں تک دُرست ہے۔ وہ قصرِ شیریں والے شعر کو عربوں کی فتح ایران سے قبل فارسی شعر کے اُن چند نمونوں میں سے بتاتے ہیں جو زمانے کی دست بُرد سے محفوظ رہ گئے ہیں۔ وہ کہیں ایک جگہ بھی تذبذب کا اظہار نہیں کرتے۔ لیکن جب اُن کی توجہ اس غلطی کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے تو نہایت دیدہ دلیری سے یہ کہہ کر اپنی برأت پیش کرتے ہیں کہ وہ اس کے جوابدہ نہیں بلکہ دولت شاہ وغیرہ ہیں۔ لیکن اس کے باوجود تھوڑی دُور آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "فردوسی کا اس شعر کو تبرّکاً نقل کرنا ہی اس کی قدامت کا ثبوت ہے۔ شعر کی ترکیب اور زبان سے بھی اُس کی قدامت صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے۔" یہ عجیب طرزِ استدلال ہے کہ ایک طرف تو اس بیان کی صحت کی ذمہ داری سے گریز کر رہے ہیں لیکن دوسری طرف اسی کی سند پر یہ بے بُنیاد دعویٰ بھی پیش کرتے ہیں کہ فردوسی نے اس شعر کو تبرّکاً اپنے شاہ نامے میں نقل کیا ہے۔

شیرانی صاحب کے تبصرے میں بہرام گور اور خسرو پرویز کا زمانہ بجائے عیسوی سنہ کے ہجری چھپ گیا تھا۔ چنانچہ اس غلطی کی تصحیح جولائی ۱۹۴۳ء کے اُردو میں کر دی گئی تھی۔ لیکن بھلا شمس العلماء اسے کیوں ملاحظہ فرمانے لگے۔ انتہائی فخر و مسرّت کے عالم میں لکھتے ہیں:-

"مُصنّف تو آج تک ساسانی عہد کو نشرِ اسلام سے قبل کا زمانہ سمجھا کرتا تھا۔ مگر وہ اسلامی عہد میں نکلا۔ اور بہرام گور و خسرو پرویز دونوں یکے بعد دیگرے غزنوی اور غوری عہد میں نکلے۔ یک نشد دو شد۔"

اگر شمس العلماء نے ذرا تحقیق کرنے کی زحمت گوارا کی ہوتی تو اُن کا یہ شادیانۂ فتح بجانا

قبل از وقت ٹھہرنا۔ لیکن شمس العلماء سے اس قسم کی تحقیق کی توقع کرنا بے سود ہی۔

صفحہ ۲۴۔ یادگار زریران :۔ شمس العلماء یادگار زریران کو ایک پہلوی رجزیہ نظم بتاتے ہیں جس کے دوسرے نام پہلوی شاہ نامہ اور شاہ نامہ گشتاسپ ہیں۔ اُس کی تصنیف کی عزت حضرت زردشت کی طرف منسوب کی ہی۔ فرماتے ہیں "قیاس میں آتا ہو کہ اس نظم نے پندرہ سو برس بعد شاہ نامہ نظم کرنے میں فردوسی کو محرک اور مثالیہ کا کام دیا"۔

جب شیرانی صاحب نے کہا کہ یادگار زریران نثر کی کتاب ہو نہ کہ نظم کی۔ اور اس کا مصنف زردشت نہیں تو شمس العلماء برافروختہ ہوگئے۔ پہلی شق یعنی یادگار کے رجزیہ نظم ہونے پر شمس العلماء کو اصرار ہی۔ بقول پروفیسر جیکسن یہ پہلوی تصنیف نظم کا قدیم ترین نمونہ ہی۔ " یہ شاہ نامہ نثر میں نہیں تھا۔ مبصر اگر اس کو اب تک نثر کی کتاب سمجھا کرتے تھے تو یہ محض اُن کی ناسمجھی تھی"۔

پروفیسر نولڈکہ کے مشہور مقالے Das Iranische Nationalepos کا انگریزی ترجمہ جو کاما اورینٹل انسٹی ٹیوٹ بمبئی کی طرف سے شائع ہوا ہی ہمیں اپنے ایک فاضل پارسی دوست کی عنایت سے مل گیا ہے۔ یادگار زریران کے متعلق نولڈکہ لکھتا ہی :۔

"پوری کتاب میں رزمیہ اسلوب نباہنے کی کوشش کی گئی ہی اور اس میں آنے والی رزمیہ کتابوں کے تمام حد سے بڑھے ہوئے مبالغے موجود ہیں۔ اگرچہ بظاہر یہ کتاب نظم میں نہیں لکھی گئی"۔

اس پہلوی کتاب کا ترجمہ جرمن زبان میں گیگر (Geiger) نے، گجراتی اور انگریزی میں شمس العلماء جیون جی مودی نے اور فارسی میں ملک الشعراء بہار نے کیا ہے۔ اس کا متن دوسرے رسالوں کے ساتھ ایک پارسی عالم جاماسپ جی دستور منوچہر جی جاماسپ ایسانا نے بمبئی میں ۱۸۹۷ء میں شائع کیا۔ اور ۱۸۹۹ء میں شمس العلماء مودی نے اس کا دوسرے دو پہلوی رسالوں کے ساتھ انگریزی اور گجراتی میں

ترجمہ کیا۔ مودی ان تینوں کتابوں کو رسالے (Treatises) کہتے ہیں اور کہیں بھی ان کے نظم کا قدیم نمونہ ہونے کا ذکر نہیں کرتے۔ دیباچہ میں یادگار زریران کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس رسالے کا ترجمہ پروفیسر گیگر جرمن زبان میں مفید حواشی کے ساتھ کر چکا ہے۔ جلال ہمائی اپنی تاریخ ادبیات[51] ایران میں لکھتے ہیں:-

"ودیگر از آثار نثر منسوب باین دورہ کتاب (کارنامۂ اردشیر) و کتاب (یادگار زریران) است کہ اصل پہلوی آنہا بہمت بعض مستشرقین در قرن نوزدہم میلادی بطبع رسیدہ است"

شمس العلماء نے پروفیسر جیکسن کا یہ قول نقل کیا ہے کہ یاتکار زریران نظم کا قدیم ترین نمونہ ہے لیکن جیکسن کی کسی کتاب یا مقالے کا حوالہ نہیں دیا کہ ہم بھی اس کی تصدیق کر سکتے جیکسن کی ایک کتاب Early persian poetry کے نام سے مشہور ہے وہ انڈیکس (صفحہ ۱۲۵) میں یاتکار زریران کو صاف طور پر pahlavi prose epic (پہلوی نثر کی رزمیہ کتاب) لکھتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ واضح اُن کا وہ بیان ہے جو انھوں نے صفحہ ۸ کے نوٹ نمبر ۴ میں دیا ہے۔ وہ صاف صاف کہتے ہیں کہ پہلوی کی موجودہ کتابوں میں جن میں یاتکار زریران اور کارنامک ارتخشیر پاپکان بھی شامل ہیں نظم تلاش کرنے کی کوششیں ابھی تک ناکام ثابت ہوئی ہیں[52]:-

Attempts to find verse in the extant pahlavi works, including the yatkar-i-zariran and the karnamak-i-Artakhshir-i-papakan have thus far proved unsuccess-full.

جیکسن کے اس صریح اور غیر مبہم بیان کے بعد شبہ کی گنجائش بہت کم رہتی ہے۔

---

[51] جلد اول ص ۲۵۰ ؛ [52] ایران کی قدیم شاعری صفحہ ۸۔

شمس العلماء بڑا کرم کرتے اگر وہ جیکسن کی کتاب کا حوالہ نقل کر دیتے تاکہ اُن کے نیازمند بھی اُن کے ارشاد کی تائید کر سکتے۔

دُوسری شق کے بارے میں شمس العلماء کی روش ناقابلِ فہم ہے۔ ایک طرف تو یادگارِ زریران کو حضرت زردشت کی طرف منسوب کرتے ہیں اور دوسری طرف اسے دوسروں کا قول بتاتے ہیں۔ اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے اُن کا فرض تھا کہ وہ کم ازکم ایک دو محققوں کا نام تو لیتے جو یادگار کو حضرت زردشت کی تصنیف مانتے ہیں۔ اگر وہ اپنے قارئین کے لئے یہ معمولی اطلاع بھی فراہم نہیں کر سکتے ہیں تو صرف یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ شمس العلماء کا اپنا قول ہے جس کی ذمہ داری سے بچنے کیلئے وہ دُوسروں کی پناہ لیتے ہیں لیکن اُن کے نام بتانے سے یکسر قاصر ہیں۔ اب ایک دُوسری حیثیت سے ہم شمس العلماء کے اس قول پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔ حضرت زردشت کی زبان اوستا کی زبان تھی۔ اور اُن کے بہت بعد یادگارِ زریران ساسانیوں کے عہد میں پہلوی زبان میں لکھی جاتی ہے۔ ایسے حالات میں شمس العلماء کے سوا کوئی دوسرا صاحبِ علم کیونکہ یادگارِ زریران کو حضرت زردشت کی طرف منسوب کرنے کی غلطی کر سکتا ہے۔

تیسری شق سب سے زیادہ دلچسپ ہے۔ شمس العلماء کا یہ دعویٰ کہ یادگار زریران شاہ نامہ کی تصنیف کیلئے محرک ہوئی۔ اور پندرہ سو برس کے بعد اسی کے نقش پر فردوسی نے اپنی تصنیف کی بنیاد ڈالی۔ شاہ نامہ کی تاریخ کے سلسلے میں ایک معرکہ آرا انکشاف ہے شمس العلماء فرماتے ہیں :-

"یاتکار زریران ایک ایسی نظم ہے جس میں ایرانی بہادروں کی شجاعت اور اُن کے معبودوں کے محیّر العقول کارنامے درج ہیں (کاش شمس العلماء کی نظر سے یہ کتاب گذری ہوتی) فردوسی کے شاہ نامے کا بھی یہی موضوع ہے۔ اس لئے یہ امر بعید از فہم نہیں ہے کہ اس نے شاہ نامے کی تیاری بالخصوص اُس کے تاریخی مواد کی فراہمی میں جن قدیم کتُب کا مطالعہ کیا ہوگا اس میں یاتکار

زریران کو بھی بڑا دخل ہوگا۔ اس کا ایک محکم داخلی ثبوت یہ ہے کہ خود شاہنامے میں یاتکار زریران کے واقعات بتفصیل منقول ہیں۔ اگر فردوسی نے یاتکارِ زریران کا مطالعہ نہ کیا ہوتا تو ایسا توارد ناممکن تھا۔"

یاتکار زریران میں گشتاسپ کے بھائی زریر اور اُس کے بیٹے بستور کی شجاعت بیان کی گئی ہے۔ زریر لڑائی میں مارا جاتا ہے۔ اور اس کا بیٹا بستور اپنے باپ کا انتقام لیتا ہے۔ یہی داستان شاہ نامے میں بھی درج ہے اور دونوں روایتوں میں بہت حد تک مطابقت پائی جاتی ہے۔ شاہ نامے کا یہ حصہ جیسا کہ شیرانی صاحب نے اپنے تبصرہ میں بتایا ہے دقیقی کا تصنیف کردہ ہے۔ اگر یاتکار زریران کا کچھ اثر تسلیم بھی کیا جائے تو صرف اس حصے پر کیا جا سکتا ہے۔ فردوسی اس سے کیونکر متاثر ہوتا۔ اس کیلئے دقیقی کا شاہ نامہ بطور نمونہ موجود تھا یہی وجہ ہے کہ وہ دقیقی کو اپنا رہبر تسلیم کرتا ہے ؎

ہم او بود گوینده را راه بر

وارنر جس نے کئی جلدوں میں شاہنامہ کا انگریزی ترجمہ شائع کیا ہے پانچویں جلد کے صفحہ ۲۴-۲۶ پر اُن چیزوں کا ذکر کرتا ہے جو دقیقی کے نظم کردہ حصے اور یاتکار زریران کے مندرجات میں مشترک ہیں یا جن کے بارے میں دونوں کے بیان ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس کی رائے میں یاتکارِ زریران دقیقی کا اصلی ماخذ نہیں۔ اُس کے الفاظ یہ ہیں :-

"It should be understood clearly that Yatkar-i-Zariran was not the actual authority followed by him but stands collaterally related to the version of the original affluent which, mingled with the Bastan Nama, passed after further vicissitudes and centuries later into his hands"

ان واضح تصریحات کی موجودگی میں شمس العلماء کا یہ دعویٰ کس قدر مضحکہ خیز ہو کہ یاتکار زریران نے پندرہ سو برس بعد شاہ نامہ نظم کرنے میں فردوسی کو محرک اور مثالیہ کا کام دیا۔

صفحہ ۲۶۔ خدائی نامہ کا فارسی ترجمہ۔ "اسے منصور اوّل کے لئے اس کے دربار کے منشی قاضی ابو منصور بن عبد الرزّاق معمری نے ۳۵۲ھ میں تیار کیا۔"

شمس العلماء کے اس مختصر بیان میں چار غلطیاں پائی جاتی ہیں :۔ (۱) شاہ نامہ ابو منصوری خدائی نامہ کا فارسی ترجمہ نہیں بلکہ مستقل تصنیف ہو جس کے متعدد مآخذ تھے۔ (۲) یہ شاہ نامہ منصور اول کے لئے نہیں بلکہ ابو منصور بن عبد الرزاق حاکمِ طوس کے حکم سے تیار کیا گیا (۳) معمری کا نام ابو منصور المعمری ہو نہ کہ ابو منصور بن عبد الرزاق جیسا کہ شمس العلماء بغیر کسی سند کے لکھ رہے ہیں (۴) اس شاہ نامہ کی تالیف کی تاریخ ۳۴۶ھ ہو نہ کہ ۳۵۲ھ۔ ان اغلاط میں سے نمبر ۳ اور ۴ شمس العلماء کو منظور ہیں۔ نمبر ۲ کے متعلق اُن کا یہ اعتراض ہو کہ یہ شاہ نامہ ابو منصور المعمری کے حکم سے برائے ابو منصور بن عبد الرزّاق عمل میں آیا اور نمبر ۱ کے متعلق اُن کا اصرار ہو کہ یہ خُدائی نامہ کا ترجمہ ہو اور اپنے دعوے کی تائید میں براؤن کا یہ قول نقل کرتے ہیں۔

"یہ عربی ترجمہ بڑی بد قسمتی ہو کہ دُنیا سے ناپید ہو گیا ہو۔ جیسا کہ فارسی نثر والا ترجمہ بھی جو بحکم ابو منصور المعمری برائے ابو منصور بن عبد الرزاق عمل میں آیا تھا۔"

اور اس دعویٰ کو اور زور دار بنانے کے لئے اُسی مجہول تذکرہ سلاطین آلِ غزنین سے یہ عبارت پیش کی جاتی ہو:۔

"و دانای کار ابو منصور المعمری از نیکو خواہی و درست کامی خواست که امیر منصور عبد الرزاق عامل طوس را یاد گارے بماند بیس مقرر کرد و فرمود ..... نامۂ گرد آوردند و شاہ نامہ نام کردند۔"

اس کے مقابلے میں شیرانی صاحب نے خود دیباچہ قدیم کی شہادت پیش کر کے بتایا کہ شاہنامۂ ابو منصوری خدائی نامہ کا فارسی ترجمہ نہیں بلکہ مستقل تصنیف ہو۔ اور یہ

شاہ نامہ ابومنصور بن عبدالرزاق حاکم طوس کے حکم سے تیار کیا گیا۔ شمس العلماء کے نزدیک یہ شہادت اگرچہ وقیع ہی تاہم قولِ فیصل نہیں۔ اس لئے انھوں نے "ایک ایرانی اور ایک انگریز محقق کے اقوال پر زیادہ اعتماد کرکے دیباچہ کی سند کو نظرانداز کیا ہی جس کو مبصر نے صحیح طور پر اپنی حجت قرار دی (دیا) ہی"۔

تناقص اور پریشان خیالی کی اس سے بہتر مثال شاید ہی کہیں مل سکے۔ دیباچۂ قدیم کی سند بقول شمس العلماء بھی وقیع ہی۔ اور راے شیرانی صاحب نے صحیح طور پر اپنی حُجّت بھی قرار دیا ہی۔ تاہم وہ نظرانداز کئے جانے کی مستحق ہی۔ محض اس بناء پر کہ مشہور مستشرق براؤن اس کے خلاف کچھ اور کہتے ہیں۔ شمس العلماء کا یہ انوکھا طرزِ استدلال فقط حیرت انگیز ہی نہیں بلکہ افسوس ناک بھی ہی۔ آخر براؤن کے پاس وہ کون سے مأخذ ہیں جن کی بناء پر اُن کے قول کو دیباچۂ قدیم کی سند پر ترجیح دی جائے۔ واقعہ یہ ہی کہ اس سند کی رُو سے پروفیسر براؤن کا قول غلط ٹھہرتا ہی۔ ہم یہاں دیباچۂ قدیم مرتبہ میرزا قزوینی سے ضروری اقتباس[۵۱] نقل کرتے ہیں تاکہ شمس العلماء کے استدلال کی کمزوری پورے طور پر عیاں ہو جائے:۔

"پس ابومنصور عبدالرزاق مردی بود بافر...... آرزو کرد تا اورا نیز یادگاری بود اندرین جہان پس دستور خویش ابومنصور المعمری را بفرمود تا خداوندانِ کُتُب را از دہقانان و فرزانگان و جہاندیدگان از شہرہا بیاوردند و چاکر او ابومنصور المعمری بفرمان او نامہ کرد و کس فرستاد بشہرہای خراسان و ہشیاران از آنجا بیاورد...... و بنشاند بفراز آوردن این نامہ ہای شاہان و کارنامہاشان و زندگانی ہریکے از داد و بیداد و آشوب و جنگ و آیین از کی نخستین...... تا یزدگرد شہریار کہ آخر ملوک عجم بود اندر محرم و سال بر سیصد و چہل و شش از ہجرت...... و این را نام شاہ نامہ نہادند"۔

دیباچۂ قدیم کا یہ بیان اس درجہ واضح ہی کہ کسی قسم کے شک اور ابہام کیلئے گنجائش

---

۵۱ بیست مقالہ جزو ثانی صفحہ ۲۳، ۲۴، ۲۵؛

نہیں رہتی۔ اس سے یہ دو باتیں ثابت ہوتی ہیں (اوّل) یہ شاہنامہ ابومنصور بن عبدالرزّاق والی طوس کے حکم سے تالیف پایا۔ (دوم) یہ شاہ نامہ خدائی نامہ کا ترجمہ نہیں بلکہ مستقل تصنیف ہے۔ اپنی ادبی تاریخ کی دوسری جلد میں خود براؤن بھی اُسے خدائی نامہ کا ترجمہ نہیں کہتے۔ اُن کے اصلی الفاظ یہ ہیں:۔

"The prase 'Book of King's Compiled in Persian from older sourses by Abu manour al mamari for Abu mansur b. Abdur Razzāq, the Then Governar of Tus in A. D. 957-58 [۵۱]

صفحہ ۲۸۔ لغت فرس کا مصنّف۔ "اسدی مصنّف لغت فرس کو سلطانِ محمود کے دربار کا شاعر مانا ہے۔ حالانکہ یہ اسدی خورد ہے جو گرشاسپ نامہ تالیف ۴۵۸ھ کا ناظم ہے۔ پال ہورن مرتّب لغت فرس کا بیان ہے کہ اسدی نے یہ فرہنگ اپنے آخر حصّۂ عمر میں تصنیف کی ہے"۔

شیرانی صاحب کے اس درست بیان سے شمس العلماء فقط انکار ہی نہیں کرتے بلکہ اپنے غلط کو صحیح ٹھہرانے کیلئے چند در چند اُلجھنوں میں پھنس جانا گوارا کر لیتے ہیں۔ وہ اپنے اس دعوے کا اعادہ کرتے ہیں کہ محمود کے دربار کا مشہور شاعر اسدی ہی لغت فرس کا مصنّف ہے۔ اور اُن کے اس دعوے کے مؤیّد ایرانی مصنّف اور محققینِ یورپ ہیں۔ قارئینِ کرام کو ایرانی مصنّفین کے ذکر سے مرعوب نہ ہونا چاہیئے۔ شمس العلماء مجمع الفصحا کی ایک عبارت نقل کر کے دُنیا پر یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ایرانی مصنّفین اُن کے ہمنوا ہیں۔ لیجئے ڈاکٹر رضا زادہ [۵۲] شفق نہایت واضح طور پر ایک

---

۵۱ لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد دوم صفحہ ۱۴۱؛

۵۲ تاریخ ادبیاتِ ایران صفحہ ۱۴۱؛

ہی اسدی کو گرشاسپ نامہ اور لُغت فرس کا مُصنّف بتاتے ہیں :-

"تاریخ فرہنگ مزبور (یعنی لُغت فرس) بعد از گرشاسپ نامہ یعنی بعد از سال چہار صد و پنجاہ و ہشت است زیرا ذکر گرشاسپ نامہ در آن آمدہ چنانچہ در بیان لغت از فنداق گوید : از فنداق قوس و قزح (کذا) بود. اسدی مُصنّف گوید در گرشاسپ نامہ

کمان آر فنداق شد ژالہ تیر   گل غنچہ ترگ و زرہ آب گیر"

پروفیسر سعید نفیسی نے لُغتِ فرس کا ایک ایڈیشن شائع کیا ہی اُن کی رائے بھی ملاحظہ ہو۔ اسدی کے کارناموں کا ذکر کرتے لکھتے ہیں[۱] :-

"دوم مثنوی گرشاسپ نامہ ...... و در سال ۴۵۸ بپایان رساندہ است، سوم لُغت فرس معروف بفرہنگ اسدیست ..... و ظاہراً آن را پس از نظم گرشاسپ نامہ و پس از سال ۴۵۸ تمام کردہ زیرا کہ در پارہ ای از نسخ آن اشعار گرشاسپ نامہ ہست۔"

دو ایرانی محققوں کے بیان آپ کے سامنے ہیں جن سے یہ حقیقت بالکل آشکارا ہو جاتی ہی کہ لُغت فرس کا مُصنّف ہی گرشاسپ نامہ کا مصنّف بھی ہی اور لُغت فرس گرشاسپ نامہ کے بعد تالیف ہوتی ہی۔ جہاں تک محققینِ یورپ کا معاملہ ہی شمس العلماء ایک ایسی غلطی کے مُرتکب ہوئے ہیں جس میں اگر نیّت کو دخل نہ بھی ہو جب بھی ایک شدید فرو گذاشت ہی۔ شمس العلماء پروفیسر براؤن کی جلد اوّل سے ایک اقتباس نقل کر کے اسدی اوّل کو لُغت فرس کا مُصنّف بتانے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں: "واضح ہو کہ براؤن نے اپنی تاریخ کے اس صفحے پر یہ اطّلاع اسدی شاعر کے ماتحت دی ہی نہ اُس کے بیٹے اسدی خورد کے جو گرشاسپ نامہ کا مُصنّف ہی۔"

جہاں سے شمس العلماء نے یہ اقتباس نقل کیا ہی۔ وہاں اسدی کلاں یا اسدی

۱؎ رودکی جلد دوم صفحہ ۱۳۰۶ا

خرد سے مطلق بحث نہیں کی گئی بلکہ لُغت فرس کا ذکر ایک علمی ماخذ کے طور پر کیا گیا ہے۔ جس کے مطالعے سے ان فارسی شعراء کا پتہ چلتا ہے جو گیارھویں صدی عیسوی کے وسط سے پہلے موجود تھے۔ براؤن نے اسدی خرد کا باقاعدہ تذکرہ جلد دوم کے صفحہ ۲۷۲ پر دیا ہے۔ جہاں اس کی دونوں کتابوں یعنی گرشاسپ نامہ اور لُغت فرس کا صراحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ مزید برآں جلد دوم کے صفحہ ۱۴۸ پر اسدی کلاں کا ذکر براؤن اس طرح شروع کرتے ہیں:۔

"دوسرا شاعر جو ہماری توجہ کا مستحق ہے وہ اسدی کلاں ابونصر بن منصور طوسی ہے جسے اس کے بیٹے علی بن احمد اسدی سے خلط ملط نہ کرنا چاہئے جو کہ گرشاسپ نامہ اور قدیم ترین فارسی کُتُب کا مُصنّف ہے اور جس کے ہاتھ کا لکھا ہوا فارسی کا قدیم ترین مخطوطہ ہے جس کی کتابت ۱۰۵۵-۱۰۵۶ عیسوی میں ہوئی یہ وائنا میں محفوظ ہے اور سلیگمین نے اسے شائع کیا ہے۔"

قارئین خود انصاف فرمائیں کہ شمس العلماء کا اس طرح غلط حوالے دینا کہاں تک ایک عالم کے شایانِ شان ہے۔

صفحہ ۳۰۔ ابوحفص سغدی۔ "مورخین نے ابوحفص کا زمانہ پہلی صدی ہجری میں بتایا ہے جس میں مُصنّف کے قیاس کا دخل نہیں ہے۔ رضا قلی خاں کا بیان ملاحظہ ہو:۔ ابوحفص حکیم سغدی سمرقندی ...... در مائتہ اولی بُودہ۔"

شمس العلماء صاحب کو بیجا طور پر اصرار ہے کہ حکیم ابوحفص پہلی صدی ہجری کا فارسی گو شاعر ہے۔ اس سلسلہ میں محض رضا قلی خاں کا حوالہ مُفید نہیں جبکہ اس سے اقدم مُصنّف ابوحفص کو تیسری صدی ہجری کا بتاتے ہیں۔ آقائے جلال ہمائی رضا قلی خاں کی مُندرجہ بالا عبارت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: "معلوم نیست این عقیدہ از چہ ماخذی گرفتہ و مخصوصاً زمان او را از روی چہ دلیلی معین نمودہ است[۵۱]۔"

"قدیم ترین شعر فارسی[۵۲]" والے مقالے میں میرزا محمد قزوینی اس روایت کا بھی

---

۵۱ تاریخ ادبیاتِ ایران جلد دوم صفحہ ۳۰۷؛ ۵۲ بیست مقالہ جلد اوّل صفحہ ۲۹؛

ذکر کرتے ہیں کہ بعض کے نزدیک فارسی کا قدیم ترین شعر حکیم ابوحفص سغدی سمرقندی کا یہ شعر ہے ؎

آہوی کوہی در دشت چگونہ دودا
یار ندارد بی یار چگونہ رودا

حالانکہ شمس الدین محمد بن قیس رازی اپنی کتاب "المعجم فی معاییر اشعار العجم (صفحہ ۱۷۱) میں فارابی کے حوالے سے لکھتا ہے کہ وہ ۳۰۰ھ کے قریب زندہ تھا۔ مشہور ہندوستانی عالم ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ[51] بھی المعجم اور مفاتیح العلوم خوارزمی کی سند کی بنا پر حکیم ابو حفص سغدی کو تیسری صدی ہجری کا شاعر مانتے ہیں۔ پروفیسر سعید نفیسی[52] نے اس شاعر کے متعلق ذرا تفصیل سے لکھا ہے وہ اس کا ذکر اس طریقے سے شروع کرتے ہیں :۔ "ابو حفص سغدی ہمان کسیست کہ بخطا وی را نخستین شاعر زبان فارسی در قرن اول ہجری دانستہ واین شعر او را نخستین شعر فارسی شمردہ اند: آہوی کوہی......"
اس کے بعد کئی حوالے درج کئے ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں :۔

ادیب فضل اللہ قزوینی کی تاریخ معجم میں لکھا ہے :۔ "واو در ثلث مائہ ہجریہ نبویہ بودہ است۔"

خوارزمی اپنی کتاب مفاتیح العلوم میں لکھتا ہے :۔

الشعرود اللہ محل ثہ ابدعھا حکیم بن احوص سغدی ببغداد فی سنتہ ثلث مائتہ للھجرۃ۔"

شمس قیس رازی کی کتاب المعجم فی معاییر اشعار العجم کا یہ اقتباس بھی مستحق توجہ ہے۔

"......ابونصر فارابی در کتاب خویش ذکر او آوردہ است وصورت آلتی موسیقاری نام آن شہرود کہ بعد از ابوحفص ہیچ کس آن را در عمل نتوانست آورد برکشیدہ و می گوید او در سنہ ثلث مائہ ہجری بودہ است۔"

---

[51] فارسی شاعری پر عربی شاعری کا اثر صفحہ ۶ حاشیہ؛

[52] رودکی جلد سوم صفحہ ۱۱۵۰ - ۱۱۵۲؛

ان شواہد کی موجودگی میں شمس العلماء کا یہ اصرار کہ حکیم ابو حفص سغدی پہلی صدی ہجری کا فارسی گو شاعر ہی کہاں تک مناسب ہی۔

اپنی کتاب کے صفحہ ۱۰۳ پر شمس العلماء نے یہ دعویٰ کیا ہی:-

"..... The Persian poet, Hakim Abu Hafs, who lived and composed the historic persian verses in the 1st Century A. H. ....."

یہ بیان پڑھ کر شیرانی صاحب کو قدرتی طور پر اچنبھا ہوا۔ اور اُنھوں نے لکھا کہ "معلوم نہیں یہ تاریخ قائم کرنے والے کون سے اشعار ہیں"۔ اس سادہ سوال کا جواب دینے کے بجائے شمس العلماء، راہِ گریز اختیار کرتے ہوئے شیرانی صاحب کے ترجمے پر اعتراض کرتے ہیں (حالانکہ انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ شیرانی صاحب اُن کی کتاب کا ترجمہ کرنے نہیں بیٹھے۔ بلکہ وہ اس کے مطالب کا مفہوم بیان کر رہے ہیں) ان کے نزدیک Historic verses کا مطلب "تاریخ قائم کرنے والے اشعار" نہیں۔ بلکہ "تاریخی ابیات ہیں۔ یعنی وہ ابیات جو تاریخ میں یادگار رہیں"۔ (قارئینِ کرام غور فرمائیں کہ "تاریخ قائم کرنے والے" اور وہ جو تاریخ میں یادگار رہیں" کے درمیان کیا فرق ہے)، پوری کتاب میں ایک شعر سے زیادہ پیش نہیں کر سکے۔ اور کرتے بھی کیسے جبکہ ابو حفص کے اشعار کہیں نہیں ملتے۔ سعید نفیسی آہوی کوہی والے شعر کے علاوہ صرف ایک اور شعر کا سُراغ لگا سکے ہیں۔

شمس العلماء، قبلہ آپ کا ترجمہ ہی درست سہی۔ آیئے اب وہ تاریخی ابیات پیش کیجئے جو آپ کے ارشاد کے مطابق حکیم ابو حفص نے کہے ہیں۔ ایک عالم کیلئے یہ زیبا نہیں کہ اپنی غلطی چھپانے کیلئے یوں پہلو تہی کرے اور پھر ایک مناظر کی طرح یہ غلغلہ بلند کرے۔ "اس مفہوم کے تحت مبصر کا یہ استفسار کہ وہ کون سے تاریخ قائم

کرنے والے اشعار ہیں پا بریدہ ہو کر خود ہی قائم نہیں رہتا۔"

صفحہ ۱۳۱۔ دوبیت اور دوبیتی میں فرق۔ شمس العلماء نے اپنی کتاب کے صفحہ ۱۰ پر حنظلہ بادغیسی کے مندرجہ ذیل چار شعر دو رباعیوں کے طور پر نقل کئے ہیں۔

مہتری گر بکام شیر در است | تو خطر کن ز کام شیر بجوی
یا بزرگی و عز و نعمت و جاہ | یا چو مردانت مرگ رویاروی

یارم سپند گرچہ بر آتش ہمی فگند | از بہر چشم تا نرسد مر ورا گزند
او را سپند و آتش نایدہمی بکار | باروی ہمچو آتش و باخال چون سپند

شیرانی صاحب نے ان قطعوں کے رباعی لکھے جانے پر اعتراض کرتے ہوئے بتایا کہ یہ دونوں قطعے رباعی کے وزن سے خارج ہیں۔ اس لئے ان کو رباعی کہنا لفظ کا غلط استعمال کرنا ہے۔ پہلا قطعہ چہار مقالہ سے نقل کیا گیا ہے۔ جہاں نظامی عروضی اس کو رباعی کہہ کر نہیں پکارتا۔ اور دوسرا قطعہ عوفی کے لباب الالباب سے لیا گیا ہے لیکن عوفی اسے دوبیت لکھتا ہے نہ کہ دوبیتی۔

چاہئے تو یہ تھا کہ شمس العلماء اعتراض کی صحت کو تسلیم کرتے اور آیندہ اڈیشن میں اس غلطی کی تصحیح کر لیتے۔ لیکن اپنے دعوے کی بیجا حمایت میں وہ رباعی کے متعلق اپنی نادر اور نکتہ سنجانہ تحقیقات سے دوسروں کو یوں مستفید کرتے ہیں:۔

"واضح ہو کہ رباعی یعنی چار مصرع کا اصل نام جو ایران میں بعہد یعقوب بن لیث صفار رکھا گیا تھا۔ دوبیتی تھا۔ کچھ مدت گزرنے کے بعد لوگ اسے چہار مصرع بھی کہنے لگے تھے۔ آخر میں اس کا عربی نام رباعی ہوا۔ چونکہ یہ اس عہد کی اصطلاح ہے اس لئے دوبیتوں کو رباعی کہنا غلط نہیں ہے۔"

شمس العلماء کا یہ نا تمام بیان دولت شاہ سے ماخوذ ہے۔ لیکن وہ اس حصے کو نظر انداز کر جاتے ہیں جس میں وزن کا ذکر ہے۔ "این مصرع را نوعی از ہزج یافتند"۔ جب اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ رباعی بحر ہزج کے مخصوص

اوزان میں لکھی جاتی تھی۔ پھر ان اشعار کو کیونکر رُباعی کہا جاسکتا ہی جو اس کے اوزان سے خارج ہیں۔ دوم دولت شاہ کے نزدیک رُباعی کا نام 'چہار مصرع' ہرگز نہیں شمس العلماء اس کا مفہوم نہیں سمجھے۔ وہ تو یہ کہہ رہا ہے۔

"چند گاہی دو (بیتی) می گفتند تا آنکہ لفظ دو بیتی نیکو ندیدند گفتند

کہ این چہار مصراعی است رُباعی می شاید گفتن[۵۱]"۔

یعنی شروع شروع میں اسے دو بیتی کہتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ اصطلاح انہیں پسند نہ آئی۔ کہنے لگے کہ اس میں چار مصراع ہوتے ہیں اس لئے اسے رُباعی کہنا چاہئے۔ ہر ایک شخص جو قواعدِ عروض سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتا ہی اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہی کہ رُباعی ایک خاص صنفِ نظم کا نام ہے۔ اور اس کے مخصوص اوزان ہیں لیکن شمس العلماء تمام قاعدوں کو بالائے طاق رکھ کر یہ دعوی کرتے ہیں کہ ہر دوبیت کو رُباعی کہنا غلط نہیں۔ گویا دوبیت اور دو بیتی میں امتیاز کرنا اُن کے نزدیک کوئی ضروری امر نہیں۔ عروض کی کسی ابتدائی کتاب کے مطالعے سے بھی یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہی۔ پھر تعجب ہی شمس العلماء ایسا عالم ضد کی حالت میں سر رشتۂ انصاف کو اس طرح ہاتھ سے چھوڑ دے گویا عروض کے قواعد ان کے نزدیک کوئی حقیقت نہیں رکھتے اور جہاں کہیں دو شعر ایک ساتھ لکھے ہوئے مل جائیں بے دھڑک اُنہیں رُباعی کا نمونہ سمجھ کر نقل کر دیں۔ چنانچہ اُن کی کتاب میں کئی جگہ لفظ رُباعی کے غلط استعمال کی مثالیں ملتی ہیں۔

شیرانی صاحب نے رُباعی کے آغاز تاریخ اور اوزان سے اپنے اُن دو مقالوں میں سیر حاصل بحث کی ہی جو اورنٹیل کالج میگزین لاہور کے شمارہ فروری اور مئی ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئے۔ ان میں سے پہلا مقالہ تنقید شعر العجم میں ضمیمہ کے طور پر چھاپ دیا گیا ہے۔

۵۱۔ تذکرۂ دولت شاہ (طبع لاہور) صفحہ ۱۱۔

صفحہ ۳۲۔ رودکی اور کلیلہ و دمنہ۔ کہتے ہیں کہ امیر نصر نے شاعر کو ایک خلعت اور چالیس ہزار درم کلیلہ و دمنہ کے صلے میں مرحمت فرمائے۔ ثبوت میں عنصری کا شعر ذیل نقل کیا ہے:۔

چہل ہزار درم رودکی ز مہتر خویش
عطا گرفت بہ نظم کلیلہ در کشور

شمس العلماء نے اگرچہ اس شعر کے لئے اپنے ماخذ کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ شعر العجم سے ماخوذ ہے۔ ...... عنصری کے دیوان میں کلیلہ کا مطلق ذکر نہیں۔ شاعر نے دوسرا مصرع یوں لکھا تھا:۔

بیافتہ است اتو زیغ ازیں درد آں در

یہ انعام کلیلہ کے صلے میں نہیں ملا بلکہ مختلف موقعوں پر.....“ (شیرانی صاحب)

اگرچہ شمس العلماء نے شعر العجم سے کئی جگہ فائدہ اُٹھایا ہے لیکن وہ اس کا اعتراف کرنے کیلئے تیار نہیں۔ چنانچہ یہاں بھی وہ دیوان عنصری کے ایک قدیم نسخے کا ذکر کرتے ہیں۔ جس میں یہ شعر ان کی نقل کردہ صورت میں ملتا ہے۔ پھر تذکرہ نویسوں میں سے دولت شاہ اور تذکرۂ سلاطین آل غزنین کا حوالہ دیتے ہیں۔ لیکن وہ اس حقیقت کو فراموش کر جاتے ہیں کہ دولت شاہ ہرگز اُن کی تائید نہیں کرتا اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

”و کتاب کلیلہ و دمنہ را بقید نظم آوردہ و امیر نصر را در حق او صلات گراں مایہ بود چنانچہ استاد عنصری شرح انعام در قصائد خود می گوید“

(تذکرہ دولت شاہ ص۳۱)

اس عبارت سے یہ کہیں مترشح نہیں ہوتا کہ کلیلہ کے صلے میں اُسے بہت بڑا انعام ملا۔ بلکہ دولت شاہ یہاں صرف اس قدر کہتا ہے کہ امیر نصر نے رودکی کو بہت بڑے انعام دیئے۔ جن کی شرح استاد عنصری اپنے قصائد میں کرتا ہے۔ البتہ ایک اور جگہ دولت شاہ لکھتا ہے کہ رودکی کو کلیلہ و دمنہ نظم کرنے پر ۸۰ ہزار درم

بطور انعام ملے تھے۔

شیرانی صاحب کی قرأت کی تائید میں پروفیسر سعید نفیسی کا حوالہ کافی سمجھا جانا چاہیئے جنھوں نے رودکی کے احوال و اشعار پر تین مبسوط جلدیں شائع کی ہیں۔ تیسری جلد کے صفحہ ۹۷۴ پر وہ عنصری کے مندرجہ ذیل شعر نقل کرتے ہیں:۔

چہل ہزار درم رودکی زمہتر خویش | بیافتست بتوضیح (بتوزیع) از ین در و آن در
شگفتش آمد و شادی فزود و کبر گرفت | زروی فخر بگفت ایں بشعر خویش اندر

اور پھر صفحہ ۹۹۷ پر ازرقی کا یہ شعر نقل کیا ہے:۔

حدیث میر خراسان و قصہ توضیح (؟ توزیع)
بگفت رودکی از روی فخر در اشعار

اور سب سے بڑھ کر رودکی کی اپنی شہادت ہو[۵]

بداد میر خراسانش چل ہزار درم
در و فزونی یک پنج میر ماکان بود

میر خراسان کی اسی داد و دہش کی طرف عنصری اور ازرقی شاید اشارہ کر رہے ہیں لیکن یہاں کلیلہ و دمنہ کا کوئی ذکر نہیں۔

صفحہ ۳۳۔ رودکی کے اشعار کی تعداد۔ شمس العلماء کا بیان ہو کہ رشیدی سمرقندی نے رودکی کے اشعار کو تیرہ مرتبہ گنا، ایک لاکھ سے اوپر نکلے، رشیدی کا شعر جس سے یہ معنی اخذ کیے گئے ہیں ذیل میں درج ہو:۔

شعر اورا بر شمردم سیزدہ رہ صد ہزار | ہم فزون تر آید ار چونانکہ باید لشمری

شیرانی صاحب کی رائے میں رشیدی کا یہ مطلب ہو کہ میں نے اس کے اشعار کا شمار کیا تیرہ لاکھ نکلے لیکن اگر احتیاط سے انھیں گنا جائے تو اور بھی زیادہ نکلیں گے۔

شمس العلماء یہاں پھر مولانا شبلی کی تقلید کر رہے ہیں خواہ وہ اس کا لاکھ

---

[۵] تذکرہ دولت شاہ مرتبہ براؤن ص۳؛

انکار کریں، اپنے جواب تبصرہ میں وہ خواہ مخواہ اس غیر متعلق بحث میں پھنس گئے ہیں کہ کوئی شاعر اتنے اشعار نہیں لکھ سکتا جب تک کہ اسے عمر نوح نصیب نہو، حالانکہ یہاں مابہ النزاع رشیدی کے شعر کا مفہوم ہی نہ کہ رودکی کے اشعار کی غیر معمولی تعداد، رشیدی کے بیان کی صحت سے کوئی بحث نہیں یہاں تو اس کے شعر کا مطلب معرض بحث میں ہی۔ پیشتر اس کے کہ ہم ان علما کا ذکر کریں جو اس شعر کا وہی مطلب سمجھتے ہیں جو شیرانی صاحب نے سمجھا ہی۔ یہ مناسب معلوم ہوتا ہی کہ شمس العلماء کی اس قلبی کیفیت سے قارئین کو آگاہ کیا جائے جو شیرانی صاحب کی اس مزعومہ غلطی دریافت کرنے سے شمس العلماء پر طاری ہوئی، مخدوم فرماتے ہیں:۔

"اس پر مغز اعتراض اور بے نظیر اصلاح کی جس قدر داد دی جائے کم ہی، مُصنّف نے تو بیشک اپنی کم عقلی سے ایک لاکھ سے زیادہ اشعار کا مطلب نکالا لیکن فاضل مبصرؔ نے محیّر العقول اصلاح دے کر تیرہ لاکھ سے زائد اشعار رودکی کی طرف منسوب کر دئے جس کی نظیر ایران میں تو کیا بلکہ تمام بّرِ اعظم ایشیا، اور ساری دُنیا میں ملنا محال ہی۔ رودکی درحقیقت بڑا خوش قسمت ہی کہ اس کو بعد وفات مبصرؔ جیسا پُر جوش عقیدت مند مل گیا جس نے تیرہ لاکھ سے زائد اشعار منسوب کر کے نہ صِرف اس کو محسود اقران اور دُنیا کی شاعری میں فرد و بے مثال بنا دیا بلکہ ایک ناممکن بات کو ممکن کر دکھایا، کاش وہ زندہ ہو جائے تو مبصرؔ کی اس معجز نما شرح و اصلاح پر انگشت بدنداں ہو کر محوِ حیرت ہو جائے"۔

مُندرجۂ بالا عبارت میں شمس العلماء حسب معمول تحریف اور غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں، شیرانی صاحب نے کہیں رودکی کی طرف تیرہ لاکھ اشعار منسوب نہیں کئے، وہ تو صرف رشیدی کے شعر کا مفہوم بتا رہے ہیں جس میں رودکی کی طرف تیرہ لاکھ اشعار منسوب کئے گئے ہیں، اگر یہ مبالغہ آمیز بیان ہی تو اس کا ذمہ دار رشیدی ہی نہ کہ کوئی اور،

اب ہم شعر کے مطالب کی طرف آتے ہیں اور اُن مستشرقین کا حوالہ دیتے ہیں جن کے نزدیک رشیدی کے شعر سے تیرہ لاکھ اشعار کا مفہوم نکلتا ہے نہ کہ ایک لاکھ اشعار کا، پروفیسر سعید نفیسی نے اپنی کتاب کی تیسری جلد میں مستشرقین کے مضامین دربارہ رودکی کا ترجمہ درج کیا ہے، ہم یہ حوالے ان ہی کی کتاب سے نقل کر رہے ہیں :-

صفحہ ۸۷۹- مشہور مستشرق جیمس ڈارمستتر لکھتا ہے :- "اشعار رودکی بغایت فراوان بود، می گویند کہ یک ملیون وسی صد ہزار شعر گفتہ است"

صفحہ ۸۳۶- ڈاکٹر ہرمان ایتھے کا قول :- "گویند کہ سخنان وی در صد مجلد بودہ است و بیش از ۱۳۰۰۰۰۰ شعر داشتہ"

صفحہ ۹۱۰- ولیم جیکسن کا قول :- "آثار شعری رودکی فوق العادہ فراوان بودہ و می گویند کہ یک ملیون وسی صد ہزار شعر گفتہ"

پروفیسر براؤن اپنی لٹریری ہسٹری کی جلد اوّل کے صفحہ ۴۵۷ پر حاشیہ ذیل میں رشیدی کے شعر سے تیرہ لاکھ اشعار کا مطلب نکالتے ہیں۔

عتبی کی کتاب الیمینی کی شرح منینی میں رشیدی کے شعر کی بنا، پر رودکی کے اشعار کی تعداد الف الف و ثلث مائۃ (دس لاکھ اور تین سو ابیات) بتائی گئی ہے[۵۱]۔ قیاس چاہتا ہے کہ یہاں ثلث مائۃ کے بعد "الف" کا لفظ کتابت میں رہ گیا ہے، اس صورت میں اشعار کی تعداد تیرہ لاکھ نکلتی ہے، اگر ہمارا قیاس درست نہ ہو جب بھی رودکی کے اشعار کی تعداد دس لاکھ اور تین سو ابیات شمس العلما، کو حیرت زدہ کرنے کے لئے کافی ہے، بہارستان میں مولانا جامی نے بھی شرح یمینی کی سند پر دس لاکھ اور تین سو ابیات کی تعداد بتائی ہے اگرچہ پروفیسر براؤن اسے تیرہ لاکھ مانتے ہیں[۵۲]،

---

۵۱ رودکی جلد دوم صفحہ ۵۷۵۔

۵۲ ایران کی ادبی تاریخ جلد اول صفحہ ۴۵۷

شمس العلماء، کہہ اٹھیں گے کہ یہ تو مستشرقین کی رائے ہی خود اہلِ زبان اس بارے میں کیا کہتے ہیں، ہمیں یہاں پھر نہایت رنج اور افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہی کہ شمس العلماء، واقعات پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں، ہو سکتا ہو کہ رودکی کی تیسری جلد ان کے ملاحظہ سے نہ گذری ہو لیکن پہلی دو جلدیں ان کے زیر مطالعہ رہ چکی ہیں[۵۱]۔ دوسری جلد میں یہی نہیں کہ سعید نفیسی سیزدہ رہ صد ہزار، کا مطلب تیرہ لاکھ اشعار سمجھتے ہیں بلکہ وہ اتنی غیر معمولی تعداد کے ممکن ہونے کو ثابت کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں[۵۲]۔ ظاہر ہو کہ شمس العلماء سعید نفیسی کے اس بیان سے واقف ہوں گے، پھر وہ خود ہی فرمائیں کہ شیرانی صاحب پر ان کی یہ تعریض کہاں تک مناسب اور درست ہی، واقعہ یہ ہو کہ شمس العلماء کا حقیقی مقصود علمی تحقیق نہیں بلکہ ادنیٰ درجے کی مناظرہ بازی ہی۔

سعید نفیسی کے اصل الفاظ یہ ہیں:۔

سیزدہ رہ صد ہزار می شود ہزار ہزار (یک ملیون) وسی صد ہزار بیت"، (صفحہ ۴۷۵)

صفحہ ۴۴۔ رودکی اور قطران تبریزی۔ فارسی شاعری کے باوا آدم رودکی کی طرف قطران تبریزی کے بعض اشعار منسوب کئے گئے ہیں۔ چنانچہ شعر العجم کی پہلی جلد میں مولانا شبلی نے بھی قطران کے اشعار رودکی کے حوالے کر دئے ہیں، ہمارے شمس العلماء اس غلط فہمی سے بچنے کیلئے دیوان رودکی کے طہران والے ایڈیشن کو ناقابل اعتماد ٹھہراتے ہوئے رودکی کے صرف وہی اشعار نقل کرتے ہیں جن کے متعلق انھیں پورا اطمینان ہو کہ وہ قطران کے دیوان میں موجود نہیں اور پھر خوش قسمتی سے ان کو دیوان قطران کا وہ مخطوطہ بھی مقابلے

---

۵۱ شمس العلماء کی کتاب صفحہ ۱۲۶ حاشیہ

۵۲ رودکی جلد دوم صفحہ ۴۶۹۔ ۴۷۰۔ ۴۷۵،

کے لئے میسّر آجاتا ہی جو ڈاکٹر ہادی حسن صاحب کی ملکیت ہو لیکن اس تمام احتیاط کے باوجود وہ قطران کے مندرجہ ذیل چار شعر رودکی کے نام سے درج کرتے ہیں:-

بود ہر جا بہر نزہت گاہ یار و نقل و مل — گلستان در گلستان و میوہ اندر میوہ زار

....

آن مکافاتِ فانمازاست این مکافات بدیع — آں عطای کردگار است این عطای شہریار

شیرانی صاحب نے اس پر اظہار رائے کرتے ہوئے لکھا کہ یہ اشعار رودکی کے نہیں ہیں بلکہ قطران کی ملک ہیں اور گنجلک دُور کرنے کیلئے اُنھوں نے اس قصیدے کا وہ شعر بھی نقل کر دیا۔ جس میں ممدوح کا نام درج ہی:-

افتخار دہر ابو منصور وہسودان کہ ہست
بندگانش را بہ میران صد ہزاران افتخار

شمس العلماء بھلا ایسی صاف اور سیدھی بات کو کب ماننے والے تھے، نہایت ہی غیر عالمانہ روش اختیار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:- "مبصرّ کے بیان کے بالعکس مصنّف کہتا ہی کہ یہ اشعار حکیم قطران کے نہیں بلکہ خالص رودکی کی ملک ہیں، اس کی مطابقت لکھنؤ کے ایک مخطوطہ سے بھی کی جا چکی ہی جس کا حوالہ حاشیہ میں درج ہی۔ علاوہ بریں حکیم قطران کے ممدوح کا نام ابو منصور وہسودان ہو لیکن مُصنّف کے ماخذ میں ابو منصور سامانی درج ہی جو رودکی کا ممدوح تھا۔"

شمس العلماء نے یہ بیان بڑی جسارت اور دلیری سے دیا ہی، کاش اس بیان سے پہلے وہ دیوان قطران کے اس مخطوطہ سے مقابلہ کر لیتے جو ڈاکٹر ہادی حسن کی ملک ہی اور جس تک خوش قسمتی سے اُنھیں رسائی حاصل ہی، محض مناظرانہ انداز میں وہ کہنے کو تو یہ کہہ گئے کہ یہ قصیدہ رودکی کا ہی اور اُس کے ممدوح ابو منصور سامانی کی مدح میں ہی لیکن اگر حضرت سے

کوئی یہ پوچھ بیٹھے کہ رودکی کے سرپرستوں میں ابومنصور سامانی کا نام بھی کہیں ملتا ہے تو وہ اس سوال کا کیا جواب دیں گے؟ اُس کا ممدوح نصر بن احمدؒ سامانی ہے جو ۳۰۱ سے ۳۳۱ ہجری تک حکومت کرتا ہے اور رودکی کا سالِ وفات بقول سمعانی ۳۲۹ سنہ ہجری ہے۔

اس کے علاوہ سب سے زبردست شہادت پروفیسر سعید نفیسی کی ہے جس کی رودکی پر ضخیم مجلدات مشہور رہیں۔ خود شمس العلماء اس بات کی سفارش کرتے ہیں کہ رودکی اور قطران کے کلام کے مخلوط ہونے کے متعلق مزید اطلاع سعید نفیسی کی کتاب سے حاصل کرنی چاہیئے۔ سعید نفیسی نے تیسری جلد میں متفرق ذرائع سے رودکی کے پراگندہ کلام کو یکجا کر دیا ہے۔ اس میں بھی یہ قصیدہ جسے شمس العلماء رودکی کی ملک کہہ رہے ہیں درج نہیں کیا گیا جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نفیسی اسے رودکی کی طرف منسوب نہیں کرتے۔ شمس العلماء قبلہ کیلئے مناسب یہی ہے کہ دعوے کرنے سے پہلے مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر اچھی طرح غور کرلیا کریں۔ ہمارے مخدوم دوسروں کو تو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ رودکی اور قطران کے کلام میں امتیاز کرنے کیلئے سعید نفیسی کی کتاب کی طرف رجوع کریں لیکن خود اُس سے بے اعتنائی برتتے ہیں۔ اگر وہ اس کتاب کی دوسری جلد[1] کی ورق گردانی کریں تو انہیں وہ اشعار قطران کے نام پر ملیں گے جن کو وہ زبردستی رودکی کے بتا رہے ہیں۔ اسی طرح یہ اشعار بھی جنھیں وہ رودکی کی طرف منسوب کر رہے ہیں دوسری جلد کے صفحہ ۶۶۵ پر قطران کی ملک بتائے گئے ہیں:۔

چو بکشاید نگار من دو بادام و دو مرجان را
بدین نازان کند دِل را بدان رنجان کند جان را

. . . .

---

[1] رودکی جلد دوم صفحہ ۴۸۳

انسان گاہی کہ پنہان کرد از من روی پیدا را
سرشک (و) روی زردم کرد پیدا راز پنہان را

اس قصیدے کے آخر میں قطران کا نام تک ملتا ہی :-

خداوندا تو قطران را ز ہر کس دوستر داری
ولیکن کمترک بخشی زہر کس چیز قطران را

ایسی صریح زیادتی کی وجہیں صرف دو ہو سکتی ہیں یا تو اُسے شمس العلماء کی قوت حافظہ کی کمزوری سمجھیں یا پھر یہ کہ شمس العلماء دیدہ و دانستہ اس قسم کی زیادتیوں کو روا رکھتے ہیں۔

صفحہ ۳۵۔ دوبیت اور دوبیتی میں فرق :- رودکی نے جو مرثیہ مرادی کی وفات پر لکھا ہی۔ اُس میں سے شمس العلماء دو شعر نقل کر کے انہیں رُباعی کے نام سے یاد کرتے ہیں اور جب شیرانی صاحب نے ان کی توجہ اشعار کے وزن کی طرف مبذول کراتے ہوئے کہا کہ یہ اشعار رُباعی کے وزن سے خارج ہیں تو شمس العلماء جواب میں فرماتے ہیں :-

"دوبیتی کو رُباعی کہنا بالکل صحیح ہی"

بڑی مُصیبت یہ ہی کہ شمس العلماء غور و فکر کرنے کے عادی نہیں ورنہ وہ دوبیت اور دوبیتی میں ضرور امتیاز کرتے۔ یہ عجیب تماشا ہی کہ جہاں دو شعر اُن کی نظر سے گذرے فوراً انہیں دوبیتی یا رُباعی سمجھ لیا۔ پروفیسر سعید نفیسی[۱] اس مرثیہ کو قطعہ کے نام سے یاد کرتے ہیں نہ کہ رُباعی کے نام سے ایک اور جگہ نفیسی لکھتے ہیں :- رودکی را قطعہ ایست در مرثیت مرادی، (صفحہ ۵۱۲)

صفحہ ۳۶۔ "در شمار خرد" یا "از شمار خرد"۔ رودکی نے جو دو شعر اپنے دوست شہید بلخی کی وفات پر کہے تھے اور جنہیں شمس العلماء غلطی سے

---

[۱] رودکی جلد سوم صفحہ ۹۸۴۔

رُباعی کہہ کر پکارتے ہیں شمس العلماء کی کتاب میں یوں نقل کیے گئے ہیں :-

کاروانِ شہید رفت از پیش — وآنِ ما رفتہ گیر و می اندیش
از شمارِ دو چشم یک تن کم — در شمارِ خرد ہزاران بیش

شیرانی صاحب نے فرمایا کہ چوتھے مصرع میں "در شمارِ خرد" کے بجائے "وز شمارِ خرد" بہتر اور موزوں قرأت ہے۔ اس پر شمس العلماء کی برافروختگی ملاحظہ ہو :-

"مبصرؔ کی مجوزہ قرأت اور اصلاح دخل در معقول و نامقبول ہے۔ کیونکہ جس نسخے کے حوالے سے رودکی کا وہ شعر نقل کیا گیا ہے اس میں "وز" نہیں بلکہ "در" ہے اور یہی قرأت صحیح اور قرین دیانت ہے۔ اگر بالفرض اس قسم کی اصلاحیں مبصرؔ کے نظریے کے مطابق روا رکھی جائیں تو رودکی کا پورا کلام مسخ ہو کر مبصرؔ کا کلام باقی رہ جائے گا۔ جس کا غیر مُستند ہونا ظاہر ہے۔"

اگر شمس العلماء شعر کے مفہوم پر ذرا غور فرماتے تو ہر صاحب فہم وذوق کی طرح شیرانی صاحب سے اتفاق کرتے لیکن اُن کا دماغ ایک عجیب اُلجھن میں گرفتار ہے۔ ان کے نزدیک نقل کے سامنے عقل کو ہتھیار ڈال دینے چاہئیں اور جیسا کچھ لکھا ہوا مل جائے۔ اسے وحی خداوندی کے طور پر قبول کر لینا چاہیئے۔ اگر دوسرے علماء بھی شمس العلماء کی طرح عقل کو اپنی محفل سے نکال باہر پھینکیں تو تمام علمی تحقیق اور تلاش کا خاتمہ ہو جائے اور ایک مُصنّف کی حیثیت محض ایک حاطب اللیل کی سی رہ جائے جو ہر قسم کا رطب و یابس بغیر کسی تنقیح و تنقید کے قبول کر لیتا ہے۔ یہی "در شمارِ خرد" اور "وز شمارِ خرد" والا معاملہ لیجیئے۔ جو شخص ذرا بھی غور سے کام لے گا۔ "در شمارِ خرد" پر "وز شمارِ خرد" کو ترجیح دے گا۔ لیکن شمس العلماء محض اس بناء پر قبول کہنے سے انکار کرتے ہیں کہ اتفاق سے اُن کے نسخے میں "در شمارِ خرد"

لکھا ہوا ہے۔ شمس العلماء کی غلط فہمی کے ازالہ کیلئے ہم پھر سعید نفیسی کی قابل قدر کتاب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

تیسری جلد کے صفحہ ۱۲۰۴ پر یہ شعر یوں ملتا ہے:۔

از شمار دو چشم یک تن کم وز شمار خرد ہزاران بیش

اسی صفحے کے حاشیہ میں نفیسی دوسری قرأت "در شمار خرد" بھی درج کرتے ہیں لیکن متن میں شیرانی صاحب کی طرح ترجیح "وز شمار خرد" کو ہی دیتے ہیں۔ اب قارئین انصاف فرمائیں کہ اگر شیرانی صاحب نے اُسے بہتر اور موزوں قرأت قرار دیا تو اس پر شمس العلماء کو چیں بجبیں ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک اور ایرانی فاضل ڈاکٹر رضا زادہ شفق کی کتاب[1] میں بھی یہ شعر اسی صورت میں نقل ہوا ہے:۔

از شمار دو چشم یک تن کم وز شمار خرد ہزاران بیش

شعر العجم کے حصۂ اول[2] میں مولانا شبلی نے بھی "وز شمار خرد ہزاران بیش" نقل کیا ہے۔

صفحہ ۱۳۷۔ ابو المؤید بلخی کی مثنوی یوسف و زلیخا۔ ابو المؤید کی مثنوی کا ذکر کرتے ہوئے شمس العلماء نے یہ دعویٰ کر دیا کہ خسرو اور جامی نے اس کی طرز کی تقلید کی (اصل کتاب صفحہ ۱۳۷)

بلخی کی مثنوی یوسف و زلیخا کا ذکر جیسا کہ شیرانی صاحب فرماتے ہیں۔ یوسف و زلیخا منسوب بفردوسی کے دیباچے میں آتا ہے:۔

یکی بوالمؤید کہ از بلخ بود بدانش ہمی خویشتن را ستود

"یہ تنہا ماخذ ہے ہمارے اس علم کا کہ بوالمؤید نے کوئی یوسف و زلیخا نظم کی تھی۔ اس سے زیادہ کسی کو کوئی اطلاع نہیں ہے" اب قارئین انصاف فرمائیں کہ جب ابو المؤید کی مثنوی گُمنام رہی ہے تو پھر امیر خسرو اور جامی اس کی طرز کی تقلید

---

[1] تاریخ ادبیات ایران صفحہ ۴۲۔ [2] شعر العجم حصہ اول صفحہ ۲۶

کیونکر کرتے۔

حسبِ معمول اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے کیلئے شمس العلماء ایک غیر متعلق بحث بطورِ تمہید شروع کر دیتے ہیں اور چونکہ اصلی زور اسی پر ختم ہوجاتا ہے اس لئے ابوالموید کی مثنوی کے متعلق وہی شیرانی صاحب کی فراہم کردہ اطلاع دہراتے ہیں لیکن ایک گراں قدر اضافہ کے ساتھ۔

"یہی حال کم وبیش ابوالموید کی مثنوی کا بھی ہے جو ایک نئی اور لطیف چیز تھی۔ نظامی وغیرہ کے علاوہ خود فردوسی بھی اس کا معترف تھا۔ چنانچہ دیباچہ میں کہتا ہے:-

یکی بوالموید کہ از بلخ بود بدانش ہمی خویشتن را ستود

"چونکہ شمس العلماء، ابوالموید کی مثنوی کی مقبولیت کے قائل ہیں۔ انھیں چاہیئے تھا کہ شیرانی صاحب کے بتائے ہوئے ماخذ کے علاوہ کم ازکم ایک اور ماخذ کا تو ذکر کرتے تاکہ اُن کے دعوے کو تقویت پہنچتی۔ لیکن اس کے برعکس وہ یہ حیرت انگیز دعوے کرتے ہیں کہ نظامی بھی ابوالموید کی مثنوی کا معترف تھا۔ ہم شمس العلماء کو دعوت دیتے ہیں کہ نظامی کی کتابوں میں اس مثنوی کی طرف ادنیٰ سے ادنیٰ اشارہ بھی ڈھونڈھ نکالیں۔ آخر اس قسم کے دعوے کرنے میں شمس العلماء اس درجہ غیر محتاط کیوں واقع ہوئے ہیں۔ انہیں اپنی علمی حیثیت کو ٹھیس لگنے کا احساس کیوں نہیں ہوتا۔ اس سے بھی زیادہ دلچسپ ان کا یہ قول ہے کہ امیر خسرو اور جامی ابوالموید کی طرز کے مقلّد تھے۔ امیر خسرو اور جامی متعدّد تصانیف کے مالک ہیں۔ کیا اُن کی کسی تصنیف میں ابوالموید بلخی کی مثنوی یوسف و زلیخا کا ذکر ملتا ہے۔ اور اگر نہیں ملتا تو پھر ایسی بے بنیاد اور مضحکہ انگیز بات کہنے سے کیا حاصل؟

صفحہ ۳۴۔ منوچہری محمود غزنوی کے درباری شعرا کے زمرے میں شمس العلماء، منوچہری کا نام محمود غزنوی کے درباری شعرا میں شامل کرتے ہیں حالانکہ وہ صریحاً

اس کے فرزند شہید مسعود کے عہد کا شاعر ہے اور خاص اُسی کے دربار سے تعلّق رکھتا ہے۔" (شیرانی صاحب)

مجمع الفصحا اور شعر العجم میں غلطی سے منوچہری کو محمود کے درباری شاعروں میں شامل کیا گیا ہے اور ہمارے شمس العلماء بھی ان ہی کے مقلّد ہیں۔ سیدھی اور آسان صورت یہی تھی کہ شمس العلماء اسے سہوِ قلم یا سہوِ نظر کہہ کر نظر انداز کر دیتے لیکن اس کے برخلاف وہ اقرار و انکار کا ایک دلچسپ اور دلکش مرقع پیش کرتے ہیں اور جواب میں ایسی باتیں کہتے ہیں جو ایک دوسرے کی ضد اور نقیض ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

"منوچہری اگرچہ سلطان محمود کے دربار سے براہِ راست منسلک نہ تھا۔ لیکن اس سے بالواسطہ تعلّق رکھتا تھا اور اسی کے عہد کا شاعر ہے"

"دیگر این کہ منوچہری محمود کے دربار کے ملک الشعراء عنصری کا شاگردِ رشید ہے اور اس حیثیت سے بھی اس کا اپنے اُستاد کے ساتھ سلطانی دربار میں باریاب ہونا نہ صرف قرینِ قیاس بلکہ اغلب ہے اور مبصرؔ کا اس پر حیرت کرنا ہی موجبِ حیرت ہے۔ ؎

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است"

اگر منوچہری کا محمود کے دربار میں باریاب ہونا قرینِ قیاس ہے تو محمود کی مدح میں ایک چھوڑ کئی قصیدے اُس کے دیوان میں ملتے ہیں خاص طور پر جب بقول شمس العلماء منوچہری محمود کے دربار میں حاضر تھا (ملاحظہ ہو اصل کتاب صفحہ ۱۷۸)، حالانکہ دولت شاہ نے اس قول کو کہ منوچہری محمود کے شاعروں میں شمار ہوتا تھا دوسروں کی طرف منسوب کیا ہے۔ "واورا از شعرای سلطان محمود شمردہ اند"

مولانا شبلیؒ بھی لکھتے ہیں کہ ..... "منوچہری کے دیوان میں سلطان محمود

لے شعر العجم حصّہ اول صفحہ ۱۸۷

کی شان میں کوئی قصیدہ نہیں اس سے قیاس ہوتا ہی کہ وہ سلطان محمود کے مرنے کے بعد غزنی میں آیا ہی۔"

اسی سلسلے میں شمس العلماء نے محمود کے درباری شعراء پر ہندوستان کی سازگار آب و ہوا کے اثر کا ذکر کرتے ہوئے ان کی نزاکت خیال، رنگینی انشا اور شگفتگی بیان کو ہندوستانی فضا کا فیض بتایا ہی۔ جب ایسے جذباتی اور خیالی بیان پر شیرانی صاحب نے اظہار حیرت کیا تو شمس العلماء اصل موضوع سے اعراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

ہندوستان کا خوش گوار ماحول بالخصوص امرا کی بے نظیر فیاضیاں اور قدر دانیاں نو وارد شعرا کے حق میں مفید اور ان کے ہندوستان میں قیام کا باعث ہوئیں جن کے زیر اثر انھوں نے یہاں فارغ البال و مرفہ الحال رہ کر اپنی تمام تر توجہ قصیدہ، غزل اور مثنوی پر صرف کی جن سے ان اصنافِ سخن کو حیرت انگیز ترقی نصیب ہوئی۔"

جس کسی نے ہندوستان میں فارسی ادب کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہی وہ شمس العلماء کی اس رائے سے بہت حد تک اتفاق کرے گا۔ لیکن اس قول کا اطلاق محمود کے درباری شعراء پر کیسے ہوسکتا ہے۔ محمود کے عہد میں ہندوستان میں وہ کون سے امراء تھے جن کی بے نظیر فیاضیاں اور قدر دانیاں نو وارد شعراء کے حق میں ابرِ رحمت ثابت ہوئیں۔ فرخی کا محمود کے ہمراہ ہندوستان آنا اس کے قصائد سے ثابت ہی لیکن وہ ہندوستانی فضا کا دلدادہ کب تھا۔ کس جگہ اس نے ہندوستان میں قیام کرنے کی خواہش کی کہ وہ یہاں کے خوش گوار ماحول سے متاثر ہوتا۔ آخر اس قسم کی فرضی اور خیالی باتوں سے کیا فائدہ ہی۔

اس بحث کے ضمن میں شمس العلماء کی تعلّی قابل ملاحظہ ہی:۔

"مبصر حسب معمول ایسی پوچ دلیل کتاب کی تنقیص کی دھن میں لے

آئے جس کے عنکبوتی تار و پود کے لئے صرف ایک پھونک کافی ہو۔"

خدا کی شان ہو کہ شیشں محل میں بیٹھ کر شمس العلماء دوسروں پر پتھر پھینکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

صفحہ ۴۴۔ ذکر سفر سومنات و قدح آن۔ محمود غزنوی کے سفر سومنات کے متعلق فرخی کا مشہور قصیدہ ہو جس کی سرخی شمس العلماء نے "در ذکر سفر سومنات و قدح آن" دی ہو۔ شیرانی صاحب نے بتایا کہ یہ قدح تو مدح کی ضد ہو۔ اس کی جگہ پر اگر فتح پڑھا جائے تو عبارت کی تمام گنجلک دور ہو جاتی ہو۔ ہر شخص یہی خیال کرے گا کہ ایسی صاف اور واضح بات کو شمس العلماء قبول فرمائیں گے لیکن چونکہ ان کے قلمی نسخے میں قدح ہو وہ فتح کو کیونکر پسند کرنے لگے چنانچہ ان کے نزدیک قدح زیادہ صحیح اور فتح سے بہتر قرأت ہو۔ "قدح کے معنی شکست کے ہیں فرخی اسی قدح یعنی شکست سومنات کا ذکر کرتا ہو۔ اس بت کو محمود نے اپنے ہاتھ سے شکست کیا تھا۔ جو تاریخی واقعہ ہو اس لئے عنوان نظم میں قدح کا لفظ ہی بمعنی شکست موزوں اور مناسب ہو۔"

عربی میں اس قسم کے توڑنے کے لئے قدح استعمال نہیں کیا جاتا۔ شاید شمس العلماء واحد و منفرد عربی دان ہوں گے جو قدح کا لفظ توڑنے کے لئے استعمال کریں گے۔ اس کے علاوہ اگر شمس العلماء دیوان[۱] فرخی مرتبہ عبدالرسولی ملاحظہ فرمانے کی تکلیف گوارا کریں تو وہاں بھی انہیں "در ذکر سفر سومنات و فتح آن" ملے گا۔ ایسی حالت میں جب کہ شمس العلماء کوئی معقول دلیل اپنے دعوے کی حمایت میں نہیں لا سکتے شیرانی صاحب کی مجوزہ قرأت ماننے کے سوا اُن کیلئے کوئی چارہ نہیں رہ جاتا۔ عربی لغت سے قطع نظر اگر اُس سرخی پر نظر ڈالیں جو شمس العلماء نے اس قصیدے کیلئے تجویز کی ہو تو لفظ قدح کے استعمال کی غیر معقولیت عیاں ہو جاتی ہو۔ "در ذکر سفر سومنات و قدح آن و شکستن

---

[۱] دیوان فرخی صفحہ ۶۷۔

مناۃ در جہت سلطان گوید۔"

غلطی سے بعض مسلمان مصنف اور شاعر مثلاً گردیزی اور فرخی اس بُت کا نام مناۃ بتاتے ہیں۔ گردیزی[1] کی مندرجۂ ذیل عبارت اس قیاس کی موید ہے:

"و پیش او حکایت کردند کہ بر ساحل دریای محیط شہریست بزرگ و آں را سومنات گویند و آن شہر مر ہندوان را چنانست کہ مر مسلمانان را مکہ و اندرو بت بسیار است از زر و سیم و منات را کہ بروزگار سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم از کعبہ براہ عدن گریزانیدند بدانجاست" چنانچہ گردیزی وغیرہ کے نزدیک سومنات اس شہر کا نام ہے اور وہاں کے بڑے بُت کا نام مناۃ ہے۔

اب شمس العلما، کی اپنی تجویز کردہ سُرخی بھی ان کے دعوے کی تردید کر رہی ہے اور پکار پکار کر کہتی ہے کہ یہاں 'قدح' نہیں بلکہ 'فتح' صحیح اور موزوں قرأت ہے ورنہ سومنات کا توڑنا اور مناۃ کا توڑنا نہایت ہی نامناسب تکرار ہوگی۔

صفحہ ۸۵۔ "گرد حوض اندر" کے معنے

فراخ پہنا حوضی بہ صد ہزار عمل
ہزار بت کدۂ خرد گرد حوض اندر

'فراخ پہنا' کی جگہ شیرانی صاحب نے "دراز و پہنا" قرأت تجویز کی جسے شمس العلماء نے "دراز پہنا" بنا کر بدل دیا اور پھر یوں تعریض کرنے لگے:

"پہلی اصلاح جو فرخی کے کلام میں ہے اس کی داد تو اہلِ زبان اساتذہ ہی دے سکتے ہیں۔"

ہمیں اسی بات کا افسوس ہے کہ شمس العلما، اہلِ زبان اساتذہ سے کما حقہٗ استفادہ نہیں کرتے ورنہ انہیں اس قسم کی شکایت کرنے کا موقع نہ ملے۔ علی عبد الرسولی نے بڑی محنت اور سلیقہ سے دیوان فرخی شائع کیا ہے۔ شمس العلماء دیکھ سکتے ہیں کہ اس ایرانی فاضل نے بھی دراز و[2] پہنا کو

---

[1] زین الاخبار صفحہ ۸۶ [2] دیوان فرخی صفحہ ۷۰

بہتر قرأت سمجھتے ہوئے اُسے ترجیح دی ہے:

ہزار بُت کدہ خُرد گرد حوض اندر، میں 'گرد حوض اندر' کا ترجمہ شمس العلماء حوض کے اندر کرتے ہیں۔ شیرانی صاحب کے نزدیک گردا گرد یا حوض کے گرد صحیح ہے:

شمس العلماء کو شیرانی صاحب کی اصلاح اس بناء پر پسند نہیں کہ اُس میں شاعر کے مخصوص لفظ 'اندر' کا مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ اُن کی رائے میں شاعر کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ حوض کے اندر کی جانب چاروں طرف چھوٹے چھوٹے بُت تھے۔

شمس العلماء تو ماشاءاللہ بڑے پروفیسر ہیں معمولی استعداد رکھنے والے بھی جانتے ہیں کہ پُرانے اساتذہ کے یہاں اندر کا لفظ اکثر زائد ہوتا ہے۔ قدما کو تو جانے دیجیئے قاآنی جیسا شاعر جو قدما کی طرز کو زندہ کرنے والا ہے۔ اندر کو بطور زائد لفظ استعمال کرتا ہے مثلاً ایک جگہ کہتا ہے۔

باللہ اگر نگاہ برون آید از دو چشم
چوں سنگ بفسرد بمیان رہ اندرا

خود فرخی کے کلام سے اس کی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔

بوقت شاہ جہاں گر پیمبری بودی
دو بیت آیت بودی بشان شاہ اندر

بسبزہ درون لالۂ نو شگفتہ
عقیق است گوئی پیروزہ اندر

'گرد حوض اندر' میں بھی اندر کا لفظ زائد ہے اور شیرانی صاحب کے مجوزہ معنے صحیح اور قرین قیاس ہیں۔ اس کے علاوہ فرخی بُتوں کا نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے بُت کدوں کا ذکر کرتا ہے۔ اُس کا مطلب یہ ہے کہ حوض کے گرد چاروں

طرف چھوٹے چھوٹے ہزار بُت خانے تھے۔

شمس العلماء شاید یہ حجت پیش کریں کہ گرد کے بعد اندر کی مثال تو پیش نہیں کی گئی۔ ہم ان کی تشفی کے لئے چند مثالیں درج کرتے ہیں:۔

بزیرش اندر شاخ بنفشہ گشت زکال
بگردش اندر برگ شگوفہ گشت شرار
(مسعود سعد سلمان)

دو شب گوئی بیک جای اندگرد یک بہار اندر
ویا زلفین مشکین است گرد روی یار اندر (معزی)

مسعود اور معزی سے بھی پیشتر فردوسی نے شاہ نامہ میں جابجا لفظ اندر اور اندرون کو زائد کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ہم یہاں صرف ایک مثال پر قناعت کرتے ہیں جس میں گرد کے بعد اندر استعمال ہوا ہے۔

خرامان بگرد گل اندر تذرو خروشیدن بلبل از شاخ سرو

نظم تو ایک طرف رہی بعض اوقات نثر میں بھی اندر بطور زائد استعمال ہوا ہے مثلاً زین الاخبار مرتبہ ڈاکٹر ناظم کے صفحہ ۱۹۸ پر یہ عبارت ملتی ہے:۔

"چند گاہ وزارت کردہ بخوارزم اندر"

صفحہ ۷۴۔ مختار غزنوی:۔ غزنی کے مشہور شاعر مختاری کے متعلق شمس العلماء نے مندرجہ ذیل دعوے کئے ہیں۔

(۱) مختاری سلطان ابراہیم کے عہد میں ہندوستان آیا اور پنجاب میں آباد ہو گیا۔

(۲) ملتان کے نخاس سے اُس نے ایک ہندی غلام خریدا۔

(۳) دولت شاہ کی سند پر شمس العلماء کا بیان ہے کہ مختاری کے ایک مشہور قصیدے کی تقلید میں جس کا مطلع درج ذیل ہے۔ اکابر شعرا نے قصیدے لکھے لیکن مختاری کی سی خوبی پیدا نہ کر سکے۔

مسلمانان دلی دارم کہ ضائع می شود جانش
در افتادم بدان دردی کہ پیدا نیست درمانش

شیرانی صاحب کو مندرجۂ ذیل وجوہ کی بناء پر شمس العلماء کے یہ دعوے قابل قبول نہیں۔

(۱) اگر سلطان ابراہیم کے عہد میں مختاری ہندوستان آیا ہوتا تو ضرور اس کی مدح میں کوئی نہ کوئی قصیدہ لکھتا۔ مختاری کا پنجاب میں آکر آباد ہونا اور لاہور و ملتان میں رہ کر قصائد لکھنا ایک ظنّی معاملہ ہے۔ جو ثبوت کا محتاج ہے۔ اگر وہ ہندوستان آیا ہے تو چلتا پھرتا آیا ہے۔"

یہاں شمس العلماء کے دو دعووں کے متعلّق شک کا اظہار کیا گیا ہے۔ ایک تو یہ کہ مختاری سلطان ابراہیم کے زمانے میں ہندوستان آیا اور دوسرے یہ کہ وہ پنجاب میں آکر آباد ہوگیا۔

شمس العلماء اس شک کا ازالہ کسی معقول توجیہہ سے نہیں کر سکے۔ پہلے تو شیرانی صاحب کی اس دلیل کے متعلّق کہ چونکہ مختاری کا کوئی قصیدہ اُس کے دیوان میں سلطان ابراہیم کی شان میں موجود نہیں ہے۔ اس لئے مختاری ابراہیم کے عہد میں نہیں آسکتا شمس العلماء ایک غیر متعلق بحث چھیڑ دیتے ہیں کہ یہ ضروری نہیں کہ جو شاعر بھی ہندوستان آئے وہ بادشاہ کی شان میں ضرور قصیدہ کہے لیکن یہ دلیل مختاری کے بارے میں کیونکر تسلیم کی جا سکتی ہے۔ جب خود شمس العلماء دولت شاہ اور رضا قلی ہدایت کی تقلید میں یہ دعوےٰ کرتے ہیں کہ مختاری نے برسوں تک سلطان ابراہیم کی مدح میں قصائد کہے ہیں۔ کیا شمس العلماء کے یہ دونوں قول ایک دوسرے کی تردید نہیں کرتے۔ اگر مختاری سلطان ابراہیم کا مدّاح تھا تو وہ تمام قصیدے کہاں گئے جو اُس نے سلطان کی مدح میں کہے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ مختاری کی شاعری کا زمانہ جیسا کہ شیرانی صاحب نے لکھا ہے سلطان ابراہیم کے بیٹے سلطان مسعود کا عہد ہے۔ سلطان ابراہیم کا عہد ۴۵۱ھ سے ۴۹۲ھ تک ہے۔ اور اس کا بیٹا مسعود ۴۹۲ھ

سے ۵۰۹ھ تک سریر حکومت پر متمکن رہتا ہے اُدھر مختاری ۵۴۵ھ میں غزنی میں انتقال کرتا ہے (بعض کے نزدیک اُس کی تاریخ وفات ۵۴۹ھ ہے) اگر یہ سنہ وفات دُرست ہو تو مختاری کے سلسلہ میں یہ فرض کرنا بہت ضروری ہوگا کہ وہ کم از کم ۴۷۰ھ میں پیدا ہو چکا ہو تا کہ بیس برس کی عمر میں اُس نے سلطان ابراہیم کی مدح میں قصیدے لکھے ہوں لیکن چونکہ اُس کے دیوان میں کوئی قصیدہ سلطان ابراہیم کی مدح میں نہیں ہے اس لئے یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ وہ سلطان ابراہیم کی وفات کے وقت کم عمری کی بناء پر کسی شاعرانہ شہرت کا مالک نہ ہو۔ اس کے برعکس سلطان مسعود (از ۴۹۲ھ تا ۵۰۹ھ) کی مدح میں اُس کے کئی قصیدے ملتے ہیں۔ نیز اُس نے شہریار نامہ میں بھی مسعود کا نام لیا ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ اسی سلطان کے نام پر یہ مثنوی لکھی گئی ہو۔

گل باغ و بستان محمود شاہ جہانجوی بخشندہ مسعود شاہ

پنجاب میں آکر مختاری کے آباد ہونے کو شیرانی صاحب نے ایک ظنی معاملہ بتایا تھا جس پر شمس العلماء نکتہ چینی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔ "وہ ایک تاریخی واقعہ ہے جس کی تائید مجمع الفصحا کے مذکورہ بالا بیان سے بھی ہوتی ہے۔" شمس العلماء کے اس غلط بیان میں سچائی کا شائبہ تک نہیں۔ ہم یہاں مجمع الفصحا کے الفاظ نقل کئے دیتے ہیں:۔ "وسالہا در خدمت ملک ارسلان سلجوقی و سلطان ابراہیم غزنوی نیز مداحی نمودہ۔"

اب شمس العلماء خود ہی فرمائیں کہ کس جگہ صاحب مجمع الفصحا مختاری کا پنجاب میں آباد ہونا بیان کرتا ہے۔ شاید شمس العلماء اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ چونکہ سلطان ابراہیم غزنوی کا مستقل قیام لاہور میں تھا اس لئے مختاری نے لاہور میں رہ کر سلطان ابراہیم کی مدح میں قصیدے کہے ہوں گے۔ اگر وہ تاریخی مآخذ کی طرف رجوع کریں تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ سلطان ابراہیم

---

[1] تاریخ ادبیات ایران از رضا زادہ شفق صفحہ ۲۰۱

کا پایہ تخت غزنین تھا اور پنجاب میں اس کے مقرر کردہ نائب حکومت کرتے تھے فرشتہ[1] سلطان ابراہیم کی آمد ہند ۴۷۲ھ میں لکھتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہئے کہ سلطان ابراہیم کی مدح میں مختاری کا کوئی قصیدہ نہیں ملتا۔

شیرانی صاحب کا یہ آسان فقرہ کہ اگر مختاری ہندوستان آیا ہے تو چلتا پھرتا آیا ہے شمس العلماء کے لئے ایک ناقابلِ فہم معمہّ بن گیا ہے۔ اس اردو جملے کے بارے میں اُن کا رویّہ حد درجہ افسوس ناک اور مضحکہ خیز ہے چنانچہ فرماتے ہیں "مُصنّف نے اپنے بیان میں کسی جگہ یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ مختاری بغیر چلے پھرے یا بیٹھے بیٹھے ہندوستان وارد ہوگیا ہے اس لئے مبصرّ کے اعتراض کا یہ ٹکڑا بے محل ہے۔"

ملاحظہ کی آپ نے شمس العلماء کی سنجیدہ نگاری اور متانت کہ ایک سیدھی بات کو کس طرح توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں گویا وہ "چلتے پھرتے" کے مفہوم سے ابھی تک ناآشنا ہیں!

(۲) اسی طرح شمس العلماء یہ ثابت کرنے سے بھی قاصر رہے ہیں کہ مختاری نے ملتان کے بازار سے ایک ہندی غلام خریدا تھا لیکن جو دلیل انھوں نے اپنے دعوے کے اثبات میں پیش کی ہے وہ ضرور دلچسپ ہے۔ فرماتے ہیں: "نیز مختاری کا ملتان کے بازار سے ایک غلام خریدنا اور اس کی خریداری میں اپنے ایک مربیّ امیر عثمان بن عبداللہ بن اسماعیل کی امداد سے کامیاب ہونا مختاری ہی کے اشعار ذیل سے ظاہر ہوتا ہے چنانچہ وہ اپنے قصیدے میں غلام کی زبان سے کہتا ہے:-

گفت رو تدبیر زر کن جان مدہ زیراکہ ہست
چون ترا از جان خداوند و مرا شد در گزیر (کذا)
گر ترا باید آستین از بہر من پر زر کنی
دامنِ عثمان عبداللہ اسمٰعیل گیر"

---

[1] تاریخ فرشتہ جلد اوّل صفحہ ۴۸۔

مندرجۂ بالا اشعار میں تو غلام شاعر کو اُبھار رہا ہے کہ تو مجھے عثمان عبداللہ اسمٰعیل کی امداد سے خرید سکتا ہے۔ یہاں ملتان کے بازار کا ذکر کہیں موجود نہیں۔ یہ انتہا بہتر ہے کہ آدمی اپنی غلطی تسلیم کرلے نہ یہ کہ اُس کی حمایت میں مزید غلطی اُس سے سرزد ہو۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے ہم شمس العلماء کی اضطراری کیفیت کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں۔ جس قصیدے کے متعلق ان کا یہ دعوٰی تھا کہ مختاری نے اس میں ملتان کے بازار سے ہندی غلام کا خریدنا بیان کیا ہے اس کا مطلع خود انھوں نے یہ نقل کیا ہے (اصل کتاب صفحہ ۱۸۵):-

یکی غلامک ہندی خریدم از بازار　　بدان بہا کہ زگفتار آنم آید عار

لیکن اپنی صفائی پیش کرتے وقت بحر اور قافیہ سب کو خیرباد کہتے ہوئے ایک دوسرے قصیدے کا حوالہ دیتے ہیں جس کا مطلع یہ ہے :-

دی غلامی دیدم اندر راہ چوں مہر منیر
کز برون گل بود و مشک و از درون می بود شیر

اس پر طرہ یہ ہے کہ اس دوسرے قصیدے میں بھی ملتان کے بازار کا ذکر سرے سے غائب ہے!

کون صاحبِ ذوق ایسی عالمانہ نکتہ سنجی کی داد نہ دے گا؟

(۳) شمس العلماء نے دولت شاہ کی سند پر ایک قصیدے کا یہ مطلع مختاری کی طرف منسوب کیا ہے :-

مسلمانان دلی دارم کہ ضائع می شود جانش
در افتادم بدان دردی کہ پیدا نیست درمانش

اور یہ دعوٰی کیا ہے کہ اکابر شعرا مثلاً خاقانی، انوری، سلمان، امیر خسرو اور عرفی نے اس قصیدے کی تقلید میں قصائد لکھے لیکن بہترین قصیدہ مختاری کا ہے۔ شمس العلماء کے اس بیان پر شیرانی صاحب نے تین اعتراض کئے (اول

یہ مطلع مختاری کے قصیدے کا نہیں ہے بلکہ دولت شاہ نے دو مختلف مصرعوں کو ملاکر ایک مطلع تیار کر دیا ہے۔ دوسرا مصرع ادیب صابر کے مطلع ہے۔ ادیب صابر کا مطلع یہ ہے:-

دلم عاشق شدن فرمود و من بر حکم فرمانش
در افتادم در آن دردے کہ پیدا نیست درمانش

(دوم) شمس العلماء کا دعویٰ کہ اس قصیدے کا جواب خاقانی، انوری وغیرہ نے دیا ہے اصولاً صحیح نہیں اس لئے جیسا کہ ادیب صابر کی اس تلمیح سے معلوم ہوتا ہے اس زمین میں سب سے پہلا قصیدہ مسعود سعد سلمان کا ہونا چاہیئے۔

گر ایں طرز سخن در شاعری مسعود را بودی
بجان صد آفرین کردی روان سعد سلمانش

شیرانی صاحب کا قیاس درست ہے۔ دیوانِ مسعود سعد سلمان مرتبہ رشید یاسمی کے صفحہ ۶۰۶ پر ہم ایک ناتمام قصیدہ پاتے ہیں جس کا پہلا شعر یہ ہے:-

سخا زریست کز ہمت زند رائی تو بر سنگش
سخن نظمیست کز معنی دہد رائی تو سامانش

(سوم) اس زمین میں بہترین اور مشہور ترین قصیدہ خاقانی کا ہے نہ کہ مختاری کا۔

پہلے اعتراض کے جواب میں شمس العلماء فرماتے ہیں کہ مطلع بلاشبہ مختاری کا ہے اور اس کے دیوان میں موجود ہے اور اگر مطلع مذکور کا دوسرا مصرع ادیب صابر کے دیوان میں نکل آیا تو یہ امر اُن کے نظریے کے ثبوت میں ایک اور زبردست دلیل ہے۔

شیرانی صاحب نے اپنے تبصرے میں نہ صرف مختاری کا مطلع نقل کیا ہے بلکہ دو شعر اور بھی درج کر دئے ہیں:

مطلع یہ ہے:-

مسلمان کشتن آئین کرد چشم نا مسلمانش
بنوک ناوک مژگان کہ پر زہراست پیکانش

نیز یہ قصیدہ سلطان ابراہیم کی مدح میں نہیں جیسا کہ شمس العلماء ہمیں یقین دلانے کی کوشش کر رہے ہیں بلکہ محمود روباہی کی تعریف میں ہے، مادح اور ممدوح کے نام شعر ذیل میں آئے ہیں:۔

کہ گر عثمان مختاری بدرد از درد در ماند
بجز محمود روباہی کہ داند کرد درمانش

اس قصیدے کا یہ مطلع مجمع الفصحا میں بھی اسی صورت میں دیا گیا ہے، شمس العلماء کو چاہیئے کہ اپنے خاص مخطوطے میں سے اس قصیدے کے وہ اشعار نقل کر دیں جن میں سلطان ابراہیم کی تعریف کی گئی ہے تاکہ بقول اُن کے حق اور باطل میں امتیاز ہو جائے۔

دوسرے اعتراض کے متعلق شمس العلماء بالکل خاموش ہیں اور انھوں نے دیوان مسعود سعد سلمان کی ورق گردانی کو غیر ضروری سمجھا ہے حالانکہ ادیب صابر کی تلمیح سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ مسعود سعد کا جواب لکھ رہا ہے نہ کہ مختاری کا؟

جہاں تک اس زمین میں بہترین قصیدے کا تعلق ہے شاید شمس العلماء بھی اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ بہترین قصیدہ خاقانی کا ہے۔ البتہ وہ مختاری کو شرف اوّلیت کا مالک بتاتے ہیں جو ادیب صابر کی تصریح کے پیشِ نظر بہت حد تک ظنّی رہ جاتا ہے؟

دولت شاہ کے نامور ہم عصر مولانا جامی نے بھی اس زمین میں ۱۳۰ شعر کا قصیدہ لکھا ہے جس کا نام انھوں نے جلاء الروح رکھا ہے۔ اس میں وہ خاقانی اور امیر خسرو کے قصیدوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں:۔

بخاقانی ازان بحرار رسد رشحی بر انگیزد
چو سوسن تر زبان تحسین کنان از خاک شروانش

دگر خسرو سقاک اللہ نمی یابد ازاں رشحہ
شود سیراب فیض عین عرفان جان عطشانش

اس زمین میں عرفی کا قصیدہ بھی مشہور ہے۔ وہ بھی خاقانی کی طرف اشارہ کرتا ہے :-

دم عیسٰی تمنّا داشت خاقانی کہ برخیزد
بامداد صبا اینک فرستادم بشر دانش

شمس العلماء ملاحظہ فرما سکتے ہیں کہ جامی اور عرفی کہیں مختاری کا نام تک نہیں لیتے۔

صفحہ ۴۹۔ غزنین کے مقابلے میں لاہور کا دارالسلطنت بنایا جانا۔
سبکتگین کے عہد میں اہلِ ہند کا فارسی جذبات و خیالات سے آشنا ہونا
شمس العلماء کا کہنا ہے کہ محمودی دور میں پنجاب کے الحاق کے بعد لاہور میں پہلا دربار منعقد ہوتا ہے۔ اہلِ ہند سبکتگین کے زمانے ہی سے فارسی جذبات و خیالات سے آشنا ہو چکے تھے۔ جب محمود کا فاتحانہ داخلہ ہندوستان میں ہوا فارسی علوم کو ماضی کے مقابلے میں بے مثال فروغ ملا۔ اس بناء پر وہ فارسی زبان اور فارسی طریقِ زندگی سے کامل طور پر واقف ہو گئے اور محمود کی وفات سے فوراً بعد لاہور فی الواقعہ غزنی کے مقابلہ میں ترجیحاً دارالسلطنت بنا دیا گیا۔ (اصل کتاب صفحہ ۱۹۰)

شمس العلماء کے اس ارشاد میں امور ذیل تنقیح طلب ہیں۔

(۱) اگر کوئی دربار محمودی عہد میں پنجاب کے الحاق کے بعد لاہور میں منعقد ہوا تو اُس کے علمی اور ادبی اثرات کتنے دور رس ہو سکتے ہیں۔

(۲) کیا اہلِ ہند سبکتگین کے زمانے ہی سے فارسی جذبات سے آشنا ہو چکے تھے۔

(۳) کیا محمود کی وفات سے فوراً بعد لاہور فی الواقع غزنی کے مقابلے

میں ترجیحاً دارالسلطنت بنا دیا گیا؟۔

شیرانی صاحب کو ان تینوں امور کی صحت میں اس بناء پر شک ہے کہ محمود کے لاہور میں دربار منعقد کرنے اور اس کو بحیثیت دارالحکومت غزنی پر ترجیح دینے کے سلسلے میں تفصیلی اطلاع کسی مستند تاریخ میں نہیں ملتی اور اس کے علاوہ محمودی سیاست کی رُو سے بھی یہ ناقابل عمل ہے اس لئے کہ ہندوستان سے زیادہ محمود کو ایران و توران کے ساتھ دلچسپی تھی۔ شیرانی صاحب شمس العلماء کے اس نظریے کو سبکتگین کے عہد سے اہلِ ہند فارسی جذبات و خیالات سے آشنا ہو چکے تھے فرضی اور بے بنیاد قرار دیتے ہیں؛

چونکہ شمس العلماء کے اکثر دعوے شرمندۂ دلیل و برہان نہیں ہوتے انھیں ناچار غیر متعلق چیزوں میں پناہ لینی پڑتی ہے۔ کہنے کو تو کہہ گئے کہ محمود کے عہد میں لاہور میں دربار منعقد ہوتا ہے لیکن اس بیان کے لئے ماخذ کہاں سے لائیں۔ اپنے کو مجبور پاکر یوں عُہدہ برآ ہونا چاہتے ہیں:۔

"مصنّف کے یہ بیانات کسی ایک تاریخ کے صفحات میں مسطور نہیں ملیں گے اور نہ ان کا کسی ایک جگہ مجتمع ہونا متصوّر ہے کہ مبصر چند سطریں پڑھ کر بطور سند اپنے پاس رکھیں"۔

یہ تو تھی شمس العلماء کی مجبوری اور بے بسی۔ اب ان کی مدافعت کا دوسرا حربہ شیرانی صاحب پر انگریزی نہ سمجھنے اور بد دیانتی کا وہی پُرانا الزام ہے جس کی حقیقت ابھی منکشف کی جائے گی۔

غزنین کے مقابلے میں لاہور کے دارالسلطنت بننے کے حق میں اُنھوں نے "ثقات مورخین" میں سے دو حوالے دئے ہیں۔ ایک تو فرشتہ کی شہادت ہے:۔

"گویند غزنین را در آن سال از بلادِ ہند می شمردند"۔

اور دوسری شہادت ایک گمنام تذکرۂ سلاطین آلِ غزنین کی ہے:۔

"مستقرّ سلطان گاہ غزنین بودہ وگاہ لاہور وہر دو را از یک خطہ می دانند و سلطان بیشتر اوقات بہ لاہور پرداخت"۔

فرشتہ کی عبارت سیاق و سباق سے علیحدہ کرکے شمس العلماء نے قاری کے دل میں غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ فرشتہ کا مفہوم بالکل جُدا ہے، تھانیسر کے خلاف محمود کی کامیاب مہم کا ذِکر کرتے ہوئے فرشتہ لکھتا ہے کہ اس مہم میں اتنے ہندوستانی غلام محمود کے لشکریوں کے ہاتھ آئے کہ ہر ایک لشکری کے پاس کئی غلام تھے۔ غزنی میں یہ ہندوستانی غلام اتنی بڑی تعداد میں موجود تھے کہ لوگ غزنی کو ہندوستان کا ایک ٹکڑا سمجھتے تھے، فرشتہ کے اصلی الفاظ یہ ہیں:۔

"قریب دویست ہزار بندہ و بردہ از آن ولایت بغزنی برد، گویند غزنی را در آن سال از بلاد ہندوستان می شمردند چہ کہ ہر یک از آحاد الناس لشکر سلطان مالک چندیں کنیز و غلام شدہ بودند"۔

شمس العلماء کی یہ قطع و برید کہاں تک علمی دیانت کے اصول کے موافق ہے۔ اس کا فیصلہ قارئین کرام خود کرسکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ شمس العلماء کی عالمانہ تحقیق مستحق تحسین و ستائش ہے۔ یہاں ذِکر ہے لاہور کے دار السلطنت بنائے جانے کا جو بقول شمس العلماء ۴۱۲ھ میں فتح ہوتا ہے۔ حالانکہ فرشتہ تھانیسر پر محمود کی فوج کشی کا ذکر کرتا ہے جو گردیزی[۱] اور فرشتہ[۲] کے قول کے مطابق ۴۰۲ھ میں فتح ہوتا ہے (ڈاکٹر ناظم فتح تھانیسر کی تاریخ ۴۰۵ھ دیتے ہیں)، تاریخ فرشتہ کا جو اقتباس شمس العلماء نے دیا ہے) وہ فتح تھانیسر کے متعلق ہے جب کہ ابھی لاہور فتح بھی نہ ہوا تھا، غالباً شمس العلماء نے مسئلہ کے اس پہلو پر غور فرمانے کی کوشش نہیں کی، ورنہ وہ یہ دعوٰی نہ کرتے کہ۔

"ثقات مورخین کی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ سلطان محمود کے عہد میں غزنی کوئی مستقل علیحدہ دار الحکومت نہیں رہا بلکہ اس کو ہندوستان کا ایک

---

[۱] زین الاخبار صفحہ ۷۰،۷۱ [۲] تاریخ فرشتہ جلد اول ص۲۷

شہر قرار دے کر غزنی تک پورے خطے کو ایک قلمرو اور ہندوستان کا ایک قطعہ شمار کیا جاتا تھا"

یہ تو تھی فرشتہ کی شہادت کی اہمیت، باقی رہی شمس العلماء کے گمنام تذکرے کی شہادت۔ اوّل تو اس میں عبارت سباق و سیاق سے الگ کر کے پیش کی گئی ہے۔ دوم سلطان کا نام تک موجود نہیں۔ آیا یہ سلطان محمود ہے یا اُس کا کوئی جانشین۔ سوم اگر یہاں سلطان سے مُراد محمود ہی ہو جب بھی قدیم اور مُستند تاریخوں کے بیانات کی موجودگی میں اس گمنام اور متاخر تذکرے کی شہادت ناقابلِ قبول رہتی ہے۔ فتح پنجاب کے بعد لاہور البتہ صوبائی حکومت کا پایۂ تخت یا صدر مقام مقرر کیا جاتا ہے۔ غزنی سے ہمیشہ نائب مقرر ہو کر یہاں آتے رہے۔ یہاں تک کہ ۵۵۰ھ کے بعد غزّ غزنی پر قبضہ کر لیتے ہیں اور غزنوی سُلطان خسرو شاہ خود مجبور ہو کر لاہور میں پناہ لیتا ہے، اور وہیں ۵۵۵ھ میں اس دُنیا سے کوچ کر جاتا ہے۔

شمس العلماء کا ارشاد ہے کہ محمود کی وفات سے فوراً بعد لاہور غزنی کے مقابلے میں ترجیحاً دار السلطنت بنایا جاتا ہے، لیکن ہمیں افسوس ہے کہ واقعات اِن کے بیان کی تائید نہیں کرتے۔ اس قسم کا دعویٰ وہی شخص کر سکتا ہے، جس نے سلاطین غزنہ کی تاریخ کا بہت ہی سرسری مطالعہ کیا ہو۔ محمود کی وفات کے وقت ہندوستان کا سالار حاجب اریاق تھا۔ جس کے دماغ میں بقول بیہقی بادِ نخوت بھری ہوئی تھی، اور جس کو خواجہ احمد حسن میمندی بڑی ہوشیاری اور چالاکی کے ساتھ راضی کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔ چونکہ اُس کی سرکشی اور نخوت خطرے سے خالی نہ تھی اُسے بلخ میں ۱۹ ربیع الاوّل ۴۲۲ھ[1] میں گرفتار کر کے گوشۂ گمنامی میں پھینک دیا گیا اور اس کی جگہ احمد نیالتگین (یا نیالتگین)، کو ہندوستان کا سالار مقرر کیا گیا جب نئے سالار نے سرکشی کی ٹھانی تو اس کی سرکوبی کے لئے تلک کو بھیجا گیا۔

---

[1] تاریخ بیہقی مرتبہ سعید نفیسی ص ۲۶۹

لیکن دار السلطنت غزنی ہی رہتا ہے۔ جب امیر مسعود نے سپاہان (اصفہان) میں سلطان محمود کی وفات اور اپنے بھائی امیر محمد کی تخت نشینی کی خبر سنی تو اس نے بہت رنج و ملال کا اظہار کیا۔ اسی اثناء میں اس کی عمۃ حرۃ ختلی کا ایک خط ملتا ہے۔ جس میں وہ تمام واقعات بیان کرتے ہوئے مسعود کو غزنی پہنچنے کے لئے تاکید کرتی ہے۔ چونکہ اس کے نزدیک "اصل غزنین است و آنگاہ خراسان و دیگر ہمہ فرعست"۔ ۴۲۲ھ میں جمادی الاخری کی آٹھویں تاریخ کو مسعود غزنی میں داخل ہوتا ہے۔ جسے بیہقی، حضرت دار الملک، کہہ کر پکارتا ہے۔ اس مختصر سے بیان میں غزنی کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔[۵۱]

۴۲۷ھ میں امیر مسعود اپنے بیٹے مجدود کو ہندوستان کا والی مقرر کرتا ہے۔ چنانچہ اس سال کے تحت بیہقی لکھتا ہے۔ "روز شنبہ سوم ذی قعدہ امیر مجدود خلعت پوشید بہ امیری ہندوستان تا سوی الھور رود۔"

اسی طرح گردیزی ۴۲۷ھ کے تحت سلطان مسعود کی ہندوستان پر فوج کشی اور ہانسی، سونی پت اور دیرہ رام میں اس کی کارگزاری بیان کر کے لکھتا ہے۔[۵۲]

"امیر شہید (مسعود) عذر او (رام) قبول کرد و نثار پذیرفت و از آنجا بازگشت و روی بغزنین نہاد پس امیر مجدود بن مسعود را رحمہما اللہ ولایت لاہور داد و طبل و علم داد و او را با حشم و حاشیت سوی لاہور بفرستاد و خود سوی غزنین آمد۔"

کیا بیہقی اور گردیزی کے صریح اور واضح بیانات کے بعد بھی شمس العلماء یہ دعویٰ کر سکتے ہیں، کہ محمود کی وفات کے بعد غزنی کے مقابلہ میں لاہور کو دار السلطنت بنا دیا گیا۔

سلطان ابراہیم غزنوی کا بیٹا سیف الدولہ محمود جو مسعود سعد سلمان اور ابو الفرج رونی کا ممدوح ہے۔ ۴۶۹ھ میں ہندوستان کا نائب السلطنت

---

۵۱ تاریخ بیہقی مرتبہ سعید نفیسی ص ۳۰۰ ۵۲ زین الاخبار ص ۱۰۲

مقرر ہوتا ہے، چنانچہ مسعود اس کی طرف اپنے ایک قصیدے میں یوں اشارہ کرتا ہے:۔

چو روی چرخ شد از صبح چون صحیفۂ سیم — ز قصر شاہ مرا مژدہ داد بادِ نسیم
کہ عزِّ ملت محمود سیف دولت را — ابوالمظفر سلطان عادل ابراہیم
فزود حشمت و رتبت بدولت عالی — چو کرد مملکت ہند را بدو تسلیم
بنام فرخ او خطبہ کرد در ہمہ ہند — نہاد بر سرِ اقبالش از شرف دیہیم

سیف الدولہ محمود بڑا اولوالعزم شہزادہ تھا، اور اس کی فتوحات نے سُلطان محمود کی یاد تازہ کر دی تھی اس کے فتح نامے اس کے باپ سُلطان ابراہیم کے پاس غزنی بھیجے جاتے تھے جیسا کہ مسعود سعد ایک قصیدے میں کہتا ہے:۔

ہزار شہر گشائی ز شہرہائی بزرگ — ہزار نامۂ فتحت رود سوی غزنین

ایک مرتبہ جب یہی شہزادہ اپنے باپ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے روانہ ہوتا ہے تو مسعود کہتا ہے:۔

بنام ایزد بیچون بقصد حضرت سلطان — ز ہندستان برون آمد امیر و شاہ ہندستان
ملک محمود ابراہیم امیر عالم عادل — کہ سیف دولت و دین است و عزِّ ملت و ایمان

سلطان ابراہیم کے جانشین سُلطان مسعود کے لئے طبقات ناصری[۱] میں لکھا ہے:۔

"امیر عضد الدولہ (شیرزاد) را امارت ہندوستان مسلّم داشت"

اسی مسعود بن ابراہیم کے ذکر کے ضمن میں فرشتہ[۲] لکھتا ہے:۔

"در عہد او حاجب طغاتگین مقطع لاہور بسپہ سالاری ہندوستان فائز گردید"

یہ حوالے اس بات کا کافی ثبوت ہیں کہ غزنی ہی غزنوی سلاطین کا دارالسلطنت تھا۔ اور ہندوستان میں اُن کے نائب السلطنت مقرر کئے جاتے تھے جن کا صدر مقام لاہور ہوتا تھا۔ جب ۵۵۵ھ کے بعد خسرو شاہ غزنی چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے تو وہ البتہ لاہور کو اپنا دارالسلطنت بناتا ہے۔

---

[۱] طبقات ناصری صفحہ ۲۲   [۲] فرشتہ جلد اول صفحہ ۴۹

سبکتگین کے عہد میں اہلِ ہند کے فارسی جذبات و خیالات سے آشنا ہونے کے متعلق شمس العلماء کو شکایت ہے کہ شیرانی صاحب اپنے ترجمہ میں دو فاحش غلطیوں کے مرتکب ہوئے ہیں۔ شمس العلماء کی اصل انگریزی عبارت یہ ہے:۔

"The Indian people had beco e familiar with stray expressions and sentiments in Subuktagin's time"

شمس العلماء شکایت کرتے ہیں کہ شیرانی صاحب نے (stray) کا ترجمہ چھوڑ دیا ہے، اور (exrressioms) کا ترجمہ جذبات کیا ہے، جو غلط ہے۔ حضرت شمس العلماء کی خدمت میں مؤدبانہ گذارش ہے کہ شیرانی صاحب نے جیسا کہ وہ تبصرہ میں لکھتے ہیں، ترجمہ نُما خلاصہ، دیا ہے نہ کہ شمس العلماء کی عبارت کا لفظی ترجمہ، اس لئے اُن کا یہ اظہار غیظ و غضب جائز نہیں۔ شیرانی صاحب نے sentiments کا مفہوم جذبات و خیالات بتایا ہے، جو لُغت کے اعتبار سے صحیح ہے، ناراضی ظاہر کرنے کے بعد شمس العلماء نہایت معصومانہ انداز میں فرماتے ہیں:۔

"المختصر مصنف نے اپنی انگریزی عبارت میں صرف یہ کہا ہے کہ سبکتگین کے عہد میں اہل ہند کچھ منتشر فارسی کلمات و خیالات سے آشنا ہو گئے تھے، جو ایک نہایت راست اور معتدل بیان ہے لیکن مبصرّ نے اس میں ناروا تصرّف کر کے اس کو قابلِ اعتراض اور محلّ گفت و شنید بنا دیا۔ جو تبصرے کی شان سے ایک بعید امر ہے"۔

شمس العلماء یہاں اس حقیقت کو بھول گئے، کہ وہ اپنی کتاب کے صفحات ۷۰ و ۷۱ پر یہ فرما چکے ہیں، کہ فارسی شاعری اور ایرانی کلچر کا ذوق سبکتگین کے زمانے میں جڑ پکڑ چکا تھا، ہم اُن کے اصل الفاظ نقل کر دیتے ہیں تا کہ قارئین خود اس بات کا اندازہ لگا سکیں کہ شمس العلماء کی یہ برافروختگی کہاں تک مُناسب ہے۔

جب کہ وہ عہدِ سبکتگین میں اہلِ ہند کے فارسی جذبات وخیالات سے آشنا ہونے کے دعوے سے بھی بڑھ کر ارشاد کر چکے ہیں :-

"It seems probable however that the taste for Persian culture and Persian poetry had taken root in India during his (Mahmud's) father's regime since the latter had visited India several times on his mission of conquest and returned to Ghazni soon after giving battle to Jaipal, the Brahman Raja of the Punjab."

یہ اقتباس شمس العلماء کے اس بیان کی تردید کے لئے کافی ہے، کہ شیرانی صاحب نے ایک ایسی بات اُن کی طرف منسوب کر دی جو ان کے وہم وگمان میں بھی نہ تھی۔

شمس العلماء ایک دوسری جگہ سلطان محمود کے زمانے سے بہت پہلے ایران کے علماء اور شعراء کی آمد ہند کا ذکر کرتے ہیں :-

"Since long before Mahmud there was a continual procession of scholars and poets from Persia and other countries coming to India" (P 196)

کاش شمس العلماء اپنے نیازمندوں کو زیادہ نہیں تو کم از کم ایک دو شاعروں کے نام سے مطلع کرتے جو سلطان محمود کے عہد سے بہت پہلے ایران سے ہندوستان آئے، اور جن کی بدولت ہندوستان میں فارسی ذوق نے ابتدائی مراحل طے کئے۔

صفحہ نمبر ۵۶ ۔ مسعود سعد سلمان اور ادیب صابر۔ ادیب صابر اپنی شاعری پر فخر کرتے ہوئے مسعود کی قوت کا تصوّر اپنے ذہن میں لاتا ہے :-

گر ایں طرزِ سخن در شاعری مسعود را بودی   بجان صد آفریں کردی رواں سعد سلمانش

شمس العلماء کے اس بیان پر شیرانی لکھتے ہیں:-

"ہمارے نزدیک یہ شعر ایک شاعرانہ تعلّی ہے۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا، کہ ادیب صابر خواجہ مسعود کا معتقد اور نہ مدّاح تھا جیساکہ پروفیسر صفحہ ۲۰۵ پر ظاہر کر رہے ہیں۔ اصل مقصد ذاتی تعریف ہے۔"

اپنے نقطۂ نظر کی توضیح کے دوران میں شمس العلماء فرماتے ہیں، کہ ادیب صابر کے شعر سے انھوں نے کہیں یہ ثابت نہیں کیا کہ وہ خواجہ مسعود کا معتقد اور مدّاح تھا، اور یہ کہ اُن کی انگریزی عبارت کا مطلب مبصّر نہیں سمجھ سکے، اگر اُن کا یہ بیان صحیح ہے، تو پھر ہم اُن سے یہ پوچھنے کے مجاز ہیں کہ کیا انھوں نے یہ شعر مسعود کی تنقیص کے لئے نقل کیا ہے۔ اس سوال کا پُر لطف جواب شمس العلماء سے سُنئے، فرماتے ہیں:-

"بالفاظ دیگر شعر ہذا سے جو مُصنّف کے نزدیک بھی ایک شاعرانہ تعلّی ہے۔ مسعود کی تنقیص نکلتی ہے۔"

خدا کا شکر ہے کہ ع   متفق گردید رائے بوعلی با رائے من

شمس العلماء کے اس اقرار کے بعد یہ سوال رہ جاتا ہے کہ آخر کس سند پر وہ اپنی کتاب کے صفحہ ۲۰۲ پر ادیب صابر کو مسعود سعد کا محض مقلّد ہی نہیں بتاتے بلکہ یہاں تک کہتے ہیں کہ ادیب صابر مسعود کو اپنا اُستاد اور رہبر تسلیم کرتا ہے۔ اور پھر صفحہ ۲۰۵ پر ادیب صابر کو مسعود کا مدّاح بتاتے ہیں۔ چونکہ اس سوال کا جواب دینے سے شمس العلماء قاصر ہیں۔ بہت ہی معقول اور پُر لطف انداز میں فرماتے ہیں:-

"یہ مُصنّف کی رائے ہے جو دیگر روایات دکیفیات پر مبنی ہے، جس کے ماننے یا نہ ماننے کا ہر قاری کو اختیار ہے۔" (جواب تبصرہ صفحہ ۷۵)

صفحہ ۵۸۔ محمود غزنوی کے خطابات۔ شمس العلماء محمود غزنوی کے خطابات کی ایک فہرست دیتے ہیں۔ جس میں یمین الدولہ و امین الملتہ، کو جو دراصل ایک خطاب ہے اور جو اُس کی تخت نشینی سے ایک سال کے اندر اندر اُسے مل چکا

تھا، دو جُدا جُدا خطاب ظاہر کرتے ہیں، اور بعض ایسے خطابات کا ذکر کرتے ہیں مثلاً عضد الدولۃ، مویّد الملۃ، شہاب الدولۃ والدین جن کا ذکر معتبر تاریخی کتابوں میں نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ خطاب سیف الدولہ کا ذکر نہیں کرتے۔ جو محمود کو سامانیوں کی طرف سے ملا تھا۔

جواب تبصرہ میں شمس العلماء فرماتے ہیں کہ:۔

"پہلا خطاب یمین الدولہ درج کتاب ہے،" "علی ہذا امین الملہ بھی..... صفحہ ہذا پر موجود ہے: تیسرا خطاب 'سیف الدّولہ' ضرور قابل ذکر ہے لیکن اس کا حوالہ کسی تذکرے یا تاریخ میں مُصنّف کی نظر سے نہیں گزرا، اس لئے فہرست میں درج نہیں ہو سکا۔"

یمین الدّولہ و امین الملہ، ایک خطاب ہے نہ کہ دو الگ الگ جیسا کہ شمس العلماء بتا رہے ہیں۔ تعجّب ہے کہ "سیف الدولہ، جیسا خطاب کیسے شمس العلماء کی نظر سے نہ گذرا۔ غزنویوں کے متعلّق ہر مشہور تاریخی کتاب میں، سیف الدّولہ، کا خطاب ملتا ہے۔ الیمینی (مطبوعہ لاہور) کے صفحہ ۸۱ و ۸۲ پر یہ عبارت موجود ہے:۔

"ولقّب الامیر الرضی الامیر سبکتگین بناصر الدولۃ و وارث ملکہ السّلطان بسیف الدولۃ۔"

ابوالفتح بُستی اسی خطاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

بسیف الدولۃ اتسقت امورٌ رأینا ھا مبددۃ النظام

زین الاخبار صفحہ ۵۶ پر یہ عبارت ملتی ہے:۔

"ونیس او ابو القاسم محمود بن ناصر الدولہ را سیف الدولہ لقب کرد۔"

تاریخ بیہقی (مرتبہ سعید نفیسی)، کے صفحہ ۲۳۱ پر اس خطاب کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے:۔

"وسپاہ سالاری باامیر محمود دادندی وسوی بلخ جملہ باز گشتند وی را لقب سیف الدولہ کردند۔"

طبقات ناصری کے انگریزی ترجمہ (جلد اوّل) کے صفحہ ۷۴ و ۷۵ پر محمود کو خطاب سیف الدّولہ عطا کئے جانے کا ذکر موجود ہے۔ طبقات کے صفحہ ۸ پر یہ عبارت ملتی ہے :-

"امیر محمود را سپہ سالاری خراسان دادند و سیف الدولہ لقب شد"۔

تاریخ گزیدہ کے صفحہ ۳۹۳ پر اس کی طرف اشارہ ہے :- ملک غزنہ سیف الدولہ محمود را مسلم شد"۔

تاریخ فرشتہ (نولکشور) جلد اوّل کے صفحہ ۲۱ پر یہ عبارت پڑھی جا سکتی ہے :-

"و سلطان محمود ولد او را بلقب سیف الدّولہ مشرف ساختہ"۔

اسی صفحہ پہ پانچ مرتبہ سیف الدولہ محمود مذکور ہے اور صفحہ ۲۲ پر چھ مرتبہ یہ خطاب دُہرایا گیا ہے۔ ابن الاثیر کی الکامل (جلد نہم صفحہ ۴۲) میں سیف الدولہ کے خطاب کا ذکر موجود ہے۔

اِن بیانات کے ہوتے ہوئے شمس العلماء کیوں کر یہ عُذر کر سکتے ہیں، کہ اس خطاب کا حوالہ کسی تذکرے یا تاریخ میں اُن کی نظر سے نہیں گذرا۔

شمس العلماء کی فہرست میں یہ خطابات پائے جاتے ہیں، عضد الدولہ، موید الملہ، شہاب الدولۃ والدین، جمال الاسلام والمسلمین۔

جواب تبصرہ میں بھی شمس العلماء ان مأخذ کا نام نہیں بتاتے جہاں سے انھوں نے عضد الدولہ و شہاب کے خطابات نقل کئے ہیں۔ گردیزی کے زین الاخبار[۵۱] کی طرف رجوع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فتح سومنات کے بعد شوال ۴۱۷ھ میں خلیفہ القادر باللہ سلطان محمود، اُس کے بھائی اور بیٹوں کو یہ خطاب عطا کرتا ہے :-

امیر محمود۔ کہف الدولہ والاسلام، امیر مسعود۔ شہاب الدّولہ و جمال الملہ امیر محمد۔ جلال الدولہ و جمال الملۃ، امیر یوسف۔ عضد الدولۃ و امیر الملۃ۔

صفحہ ۵۸۔ فتح سومنات اور محمود کی بُت شکنی۔ شمس العلماء نے فتح سومنات

---

۵۱ زین الاخبار صفحہ ۸۷ و ۸۸۔

بیان کرتے ہوئے اُس واقعہ کا بھی ذِکر کیا ہے۔ جو تاریخ فرشتہ وغیرہ میں مذکور ہے اور وہ یہ کہ جب محمود نے بُت فروش ہونے کی بدنامی اپنے لئے گوارا کرنے سے اِنکار کر دیا اور سومنات کے بُت کو توڑا، تو اُس کے جوف میں سے بیش بہا اور قیمتی جواہرات نِکلے۔

شیرانی صاحب نے اس واقعہ کو غیر مُستند ٹھیراتے ہوئے بتایا کہ اگرچہ یہ متاخرین کی کتابوں میں مذکور ہے لیکن جواہرات کا بُت کے پیٹ میں سے برآمد ہونا بالکل غلط ہے۔ صحیح وہی ہے جو گردیزی نے لکھا ہے:۔

"گنج بود اندر زیر بُتاں، آں گنج را بر داشت و مالی عظیم از آنجا بحاصل کرد"

(زین الاخبار صفحہ ۷۸) بُتوں کے ہٹاتے وقت اُن کے نیچے سے خزانہ برآمد ہوا یعنی جس مقام پر بُت نصب تھے وہاں سے نِکلا۔ فرخی جو سفر سومنات میں محمود کا شریک اور شاہد عینی ہے تقریباً گردیزی کے بیان کی تصدیق کر رہا ہے:۔

زجائی بر کنند آں شہریار دین پرور	خدای حکم چناں کردہ بود کان بُت را
بکنند واینک با ماہی برد ہمبر	بداں نیت کہ مراورا بمکہ باز برد
بدست خویش بہ بُت خانہ در فگند آذر	چو بُت بکند از آنجا د مال وزر بر داشت

ڈاکٹر ناظم کی بلند پایہ کتاب سُلطان محمود کے متعلق شمس العلماء کے زیر مطالعہ رہ چکی ہے۔ جیسا کہ صفحہ ۱۴۲ کے ذیلی نوٹ میں وہ خود بیان کرتے ہیں، بلکہ ایک دو مقام پر اس کتاب سے اس کا نام لئے بغیر خوشہ چینی بھی کرتے ہیں پھر تعجب ہے کہ اس مشہور افسانے کی تصدیق کے لئے انھوں نے ڈاکٹر ناظم کی کتاب کی ورق گردانی کی ضرورت نہیں سمجھی، بلکہ گرمیٔ محفل کے خیال سے اسی بے بنیاد روایت کو قندِ مکرر سمجھ کر اس کا اعادہ کیا ہے۔ بیشتر اِس کے کہ ہم ان دلائل کا جائزہ لیں جو شمس العلماء نے اپنے بیان کی تائید میں پیش کئے ہیں۔ ہم ان کے لب و لہجہ کی طرف قارئین کرام کی توجہ مبذول کرانے کی اجازت چاہتے ہیں۔

"مبصر کا یہ اعتراض بالکل فضول اور رائے مجہول ہے۔ نہ وہ گردیزی

کے بیان کو صحیح سمجھے، اور نہ اُنھوں نے عبارت منقول کی ترکیب لفظی پر غور کیا۔ فرخی کے اشعار سے بھی جو مطلب اُنھوں نے اخذ کیا ہے۔ وہ محض خام خیالی ہے اور دعویٰ بلا دلیل ہے۔"

اس بے جا سب و شتم کے بعد وہ گردیزی کی عبارت کا صحیح مفہوم پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پہلا نکتہ جو اُن کی دقیقہ سنجی کا بہترین گواہ ہے۔ یہ ہے کہ گردیزی چھوٹے چھوٹے بتوں کی بابت کہہ رہا ہے، اور بڑے بُت کا جو زیر بحث ہے مطلق ذکر نہیں کر رہا ہے۔ اِس کے علاوہ عبارت میں لفظ 'اندر' بھی قابلِ غور ہے۔ مبصر" کا اخذ کردہ مفہوم اس لفظ 'اندر' کے بغیر یعنی صرف 'زیر بتاں' سے بخوبی اور صاف طور پر ادا ہو سکتا تھا۔ گردیزی کے الفاظ سے تو قریب قریب یہ مطلب نکلتا ہے کہ جب بُت توڑے گئے تو ان کے اندر نیچے کی طرف سے یعنی شکم کے حصہ زیریں سے خزانہ برآمد ہوا۔ گردیزی کی عبارت کا جو مفہوم شمس العلماء نے اخذ کیا ہے۔ یعنی "بتوں کے اندر نیچے کی طرف سے"۔ اِس کی داد تو اہلِ ذوق ہی دے سکتے ہیں۔ اگر وہ زین الاخبار اُٹھا کر دیکھتے تو انھیں بڑے بُت کا ذکر بھی وہیں مل جاتا۔ لیکن خدانخواستہ وہ ایسا کیوں کرنے لگے۔ ان کی اطلاع کے لئے ذیل کی عبارت نقل کی جاتی ہے:

"آں سنگ منات را از بیخ بر کندند و پارہ پارہ کردند و بعضی از و بر اشتر نہادند و بغزنین آوردند و تا بدین غایت (یعنی ۴۴۴ھ) بر در مسجد غزنین افگندہ است و گنجی بود۔ اندر زیر بتاں، آں گنج را بر داشت و مالی عظیم از آنجا بحاصل کرد" (صفحہ ۸۶ و ۸۷)، اب رہ گیا لفظ 'اندر' کا استعمال 'زیر' کے ساتھ، تو اُس کے لئے اپنے مخدوم کی خدمت میں گذارش ہے کہ انھیں لفظ 'اندر' دیکھ کر گھبرانا نہیں چاہیئے۔ پانچویں صدی ہجری کے وسط تک جیسا کہ ملک الشعراء بہار نے تشریح کی[۱] ہے، فارسی نثر میں 'در' کا لفظ نہیں ملتا بلکہ ان کے نزدیک نثر کہنہ اور نثر تازہ تر میں امتیاز کرنے کا ذریعہ اس لفظ کا موجود ہونا ہے۔ زین الاخبار میں اندر کا لفظ

---

[۱] سبک شناسی جلد اوّل ص ۳۸۴

بکثرت استعمال ہوا ہے۔ چونکہ در اندر کا مخفف ہے آہستہ آہستہ اس نے اندر کی جگہ لے لی۔ یہ توضیح ہم اس لئے ضروری سمجھتے ہیں تاکہ شمس العلماء کل کو یہ کہنے نہ لگ جائیں، کہ زیر کے پہلے در کا استعمال تو سُنا ہے، لیکن اندر کا استعمال نہ کہیں سُنا ہے اور نہ دیکھا ہے۔ در زیر کی مثالیں شمس العلماء ملاحظہ فرمائیں۔

ہزارش مزرعہ در زیر گشت است   کہ زاد رفتن راہ بہشت است

طفیان ناز بین کہ جگر گوشۂ خلیل   در زیر تیغ رفت و شہیدش نمی کنند

تاریخ بیہقی میں کئی جگہ 'در زیر' استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہوں اُس کے صفحات ۱۰۵، ۱۷۲، ۲۴۳، ۳۵۲، ۵۱۵ وغیرہ۔

فرخی نے ایک قصیدے میں 'اندر زیر' بھی استعمال کیا ہے۔

داغہا چوں شاخہائی بسدہ یاقوت رنگ   ہر یکی چوں نار دانہ گشتہ اندر زیر نار

شاید فرخی کا یہ شعر شمس العلماء کے لئے اطمینان کا باعث نہ بن سکے ہم شیخ علی ہجویری کی کشف المحجوب کا ایک اقتباس[۱] پیش کرتے ہیں، جس سے تمام شکوک دُور ہو جائیں گے۔

"وجوانی را دیدم اندر زیر دیوار کوشک ایستادہ، بامرقعہ درکوہ"

اِن مثالوں کے بعد شمس العلماء 'اندر زیر' کے معنی "اندر نیچے کی طرف سے" یا "شکم کے حصۂ زیریں" سے نہ کریں گے۔

فرخی کے متعلق تو شیرانی صاحب صاف صاف کہہ رہے ہیں، کہ وہ تقریباً گردیزی کے بیان کی تصدیق کر رہا ہے یعنی محمود سومنات کے بُت کو اُکھاڑتا ہے اور بُت خانہ سے بہت سا مال و زر لے جاتا ہے۔ لیکن شمس العلماء لفظ تقریباً نظرانداز کر جاتے ہیں۔ اور اعتراض کی ٹھان لیتے ہیں۔

شیرانی صاحب نے تبصرے میں یہ بھی لکھا تھا، کہ ہندوؤں کی پوجا کی اشیاء

---

[۱] کشف المحجوب مرتبہ ژوکوفسکی صفحہ ۵۳۳۔

(بُت)، مجوف اور جوڑ دار نہیں ہوتیں لیکن شمس العلماء اپنی چشم دید شہادت پیش کرتے ہیں، کہ ۱۹۲۵ء میں بزمانۂ قیام لندن انھوں نے برٹش میوزیم میں متعدد ایسی مورتیاں دیکھیں جو ٹھوس نہ تھیں۔ شمس العلماء کا یہ بیان اگر دُرست بھی ہو جب بھی ہم اُن کی خدمت میں صرف اِتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ یہاں سومنات کے بُت کا مجوّف ہونا معرضِ بحث میں ہے نہ کہ دوسری مورتیوں کا۔

شمس العلماء نے شیرانی صاحب کے اس بیان پر بھی غور نہیں کیا، کہ قدیم تاریخی کتابوں میں اِس افسانے کا سُراغ نہیں لگا سکے، جیساکہ ڈاکٹر ناظم اور شیرانی صاحب نے بتایا ہے۔ سُلطان محمود کے متعلق اس قسم کی روایتیں اُس کی موت سے بہت عرصہ بعد پھیلنا شروع ہوتی ہیں، اور سب سے پہلے ان کا ذکر شیخ فرید الدّین عطّار کی تصنیفات میں ملتا ہے۔ خود فرشتہ بھی شیخ عطّار کی منطق الطیر سے خوشہ چینی کرتا ہے۔ جیساکہ اُس کے بیان سے ظاہر ہے۔

قدیم تاریخی ماخذ کی طرف رجوع کرنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بُت فروش اور بُت شکن والے افسانے کا نام و نشان بھی ان میں موجود نہیں۔ گردیزی اور فرخی کی شہادتوں کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، وہ کہیں اِس واقعہ کی طرف اشارہ تک بھی نہیں کرتے۔ البیرونی جو کتاب الہند میں سُلطان محمود کو مرحوم کہتا ہے سلطان کی اس شاندار مگر مفروضہ عالی حوصلگی کا ذکر نہیں کرتا۔ سومنات کے بُت کے متعلق اس کا معاصرانہ بیان یہ ہے:-

"سلطان[1] محمود رضی اللہ عنہ نے ۴۱۶ھ میں اس پتھر کو اُکھڑوا دیا اور اُوپر کے حصّے کو توڑ کر مع اُس کے سونے کے جڑاؤ اور چمکیلے غلاف کے اپنے دارالسلطنت غزنی لے گئے۔ اس کا ایک جزو غزنی کے میدان میں چکرسوام، ایک پیتل کے بُت کے ساتھ جو تھانیسر سے لایا گیا تھا پڑا ہے۔ اور ایک جزو وہاں کی جامع مسجد کے دروازے پر ہے۔ جس پر پاؤں کی مٹّی اور نمی پونچھی جاتی ہے"۔

---

[1] کتاب الہند (انجمن ترقی اردو) جلد دوم ص۲۰۱

بیرونی یہ بھی بتاتا ہے کہ سومنات کا بُت مہادیو کا لنگ تھا اور براہمر کے حوالے سے اُس کے بنانے کی ترکیب بھی بتاتا ہے۔

اگر شمس العلماء کے پیش نظر بیرونی، گردیزی، اور فرخی کے بیانات ہوتے تو وہ فرشتہ کی سند پر بُت کے جوف میں سے جواہرات کا برآمد ہونا بیان نہ کرتے۔

ابن الاثیر نے الکامل میں جس کا حوالہ شمس العلماء نے بھی دو تین مقامات پر دیا ہے۔ سومنات کے بُت اور اُس کے توڑے اور جلائے جانے کی کیفیت بیان کی ہے۔ لیکن کہیں وہ اِس کے مجوّف ہونے کا ذکر نہیں کرتا۔ ابن الاثیر کے الفاظ یہ ہیں:۔

"فاخذہ یمین الدولۃ فکسرہ واحرق بعضہ واخذ بعضہ معہ الی غزنۃ، فجعلہ عتبۃ الجامع۔" (الجزء التاسع صفحہ ۱۴۳)

ابن خلکان کی وفیات الاعیان اور طبقات ناصری میں بھی اِس فرضی قِصّہ کا کہیں ذِکر نہیں۔ قدیم تاریخیں تو ایک طرف خود فرشتہ کے ہم عصر نظام الدین مصنّف طبقات اکبری اور مُلّا بدایونی بُت فروشی اور بُت شکنی کے دِل خوش کُن مگر فرضی افسانے کو اپنی کتابوں میں جگہ نہیں دیتے۔ اگر اِس افسانے میں ذرّہ برابر بھی حقیقت ہوتی تو یہ مورّخ جو سُلطان محمود کے غازی اور مجاہد فی سبیل اللہ ہونے کی داستان بڑے فخر سے بیان کرتے ہیں۔ اُس کی زندگی کے اِس اہم واقعہ کو کیسے نظر انداز کر سکتے تھے۔

صفحہ ۱۶۱۔ عرفی کی مِنّت پذیری۔ ابوالفرج رونی کے تذکرے کے ضمن میں شمس العلماء اُس منّت پذیری کا ذکر لے آتے ہیں جو عرفی ابوالفرج اور انوری کی نسبت ظاہر کرتا ہے، اور شہادت کے طور پر عرفی کے اُس قصیدے سے تین اشعار نقل کرتے ہیں۔ جو خانخاناں کی مدح میں ہے۔

شیرانی صاحب نے یہ بیان دیکھ کر بجا طور پر فرمایا کہ" ان اشعار میں ہمیں تو عُرفی کی ممنونیت یا احسان مندی کی جھلک تک نظر نہیں آتی، وہ جوش خودستائی میں اپنے ممدوح پر ان شعراء کے خلاف اپنی فضیلت اور برتری کا سِکّہ جمانے

کی کوشش میں مصروف ہے"۔
چونکہ شمس العلماء اس اعتراض کا کوئی معقول جواب نہیں دے سکتے۔ اس لئے وہ شیرانی صاحب پر حسبِ معمول غلط ترجمہ کرنے کا الزام لگاتے ہیں جو محض بے بنیاد ہے، اور پھر اپنی طرف سے اس عبارت کا ترجمہ دیتے ہیں۔ ہم شیرانی صاحب کی عبارت اور شمس العلماء کا ترجمہ دونوں قارئین کی خدمت میں اس غرض سے پیش کرتے ہیں تاکہ وہ خود بھی شمس العلماء کے اس بے بنیاد الزام کی حقیقت سے واقف ہو جائیں لُطف تو یہ ہے کہ شمس العلماء کی رائے میں۔ "درحقیقت یہ بڑا اخراج تحسین ہے جو عُرفی ابوالفرج کو ادا کرتا ہے"۔
شیرانی صاحب کی عبارت:۔ عُرفی جو اپنے آپ کو زمانے کا سب سے بڑا شاعر کہتا ہے۔ خانخاناں کے ایک مدحیہ قصیدے میں ابوالفرج اور انوری کے تعلق میں اپنی احسان مندی کا اعتراف کرتا ہے، وہ فخریہ اُن کو اس زمین میں اپنا رہبر اور خود کو ان کے وزن اور طرز کا مقلّد کہتا ہے"۔
شمس العلماء کا ترجمہ:۔ عُرفی جو اپنی خود بینی سے اپنے آپ کو اس وقت کا سب سے بڑا شاعر سمجھتا تھا اپنے ایک قصیدے میں جو اُس نے خان خاناں کی مدح میں لکھا تھا۔ ابوالفرج اور انوری کی نسبت اپنی منت پذیری تسلیم کرتا ہے۔ اور مغرورانہ انداز میں ان کو اس قصیدے کی زمین کا پہلا رہ نورد (پیشرو) اور خود کو ان کے طرز اور بحر کا متبع (پس رو) کہتا ہے"۔
یہ عجیب تماشا ہے کہ شمس العلماء نے اپنے ترجمہ میں "اپنی خود بینی سے" کے الفاظ کا اضافہ کر دیا ہے۔ جو ان کے لئے کسی طرح زیبا نہیں، پھر انہیں اس بات پر اعتراض ہے کہ شیرانی صاحب نے (boastfully) کا مفہوم فخریہ کے الفاظ سے کیوں ادا کیا ہے۔ جو ان کے نزدیک بالکل غلط اور محل اعتراض ہے۔ اس کا صحیح ترجمہ ان کے نزدیک "مغرورانہ لہجے یا انداز میں" ہونا چاہیئے۔ اگر ہم نے "فخریہ" کے دُرست ہونے کے حق میں انگریزی لغات کے حوالے دئے تو شاید

شمس العلماء انھیں بھی محلِ اعتراض ٹھیراتے ہیں۔ بفحوائے "شَہِدَ شَاہِدٌ مِنْ اَھلِھا" ہم ان ہی کی کتاب میں سے ایک انگریزی جملہ ان کی خدمت میں پیش کرنے کی جرأت کرتے ہیں جہاں خود انھوں نے (Boastfully) فخریہ کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ اصل کتاب کا صفحہ ۲۲۶ جہاں امیر خسرو حسن دہلوی کی فخریہ تقلید کرتے ہوئے بتائے گئے ہیں:-

The latter (Amir Khasrun) himself acknowledged Hasan's excellence in ghazal, and boastfully imitated him, as is evident from the following verse.

خسروا شعر تو اسرار حدیث است مگر کز سخن ہائے تو ام بوی حسن می آید"

اب اس بات کا فیصلہ ہم شمس العلماء کے انصاف پر چھوڑتے ہیں کہ یہاں (Boastfully) فخریہ کے معنی میں مستعمل ہے یا "مغرورانہ لہجہ اور انداز میں" اپنی غلطی پر بے جا اصرار ایک عالم کے شایانِ شان نہیں۔

شمس العلماء عرفی کی خود بینی اور غرور سے انکار نہیں کرتے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ عرفی ان دونوں شعرا (یعنی ابوالفرج اور انوری) سے مرعوب اور ان کی اُستادی کا دل سے معترف تھا، اگرچہ بظاہر الفاظ اس کا اظہار نہیں کرتا ہے جو عرفی جیسے خوددار کے لئے موزوں ہے۔

دلوں کے بھید خدا تعالیٰ جانتا ہے۔ عرفی کا ان شعراء سے مرعوب ہونا اور دل سے ان کی اُستادی کا قائل ہونا خدا کو معلوم ہو تو ہو ہم اہل ظاہر جو کشف باطنی سے محروم ہیں۔ ظواہر ہی کی بناء پر رائے قائم کیا کرتے ہیں۔ اسے عرفی کی خودداری کہیں گے یا اس کا ناز و کبر کہ دل سے تو اپنے پیشرودں کی اُستادی کا قائل ہے۔ لیکن بظاہر اپنی برتری اور فوقیت کا سکہ جمانے کی کوشش میں ان کی تنقیص کر رہا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ عرفی نے اپنے پیشروؤں کے قصیدوں پر قصیدے

لکھے تاہم ابوالفرج، خاقانی، سلمان، ازرقی، ظہیر اور سعدی جیسے اُستادوں کو خاطر میں نہیں لاتا، اس کو اپنی حد سے بڑھی ہوئی خود بینی کا خود بھی احساس ہے۔ "کبر و نازش نہ باندازۂ قدر است و محل۔" کا تتبع جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے اس کلیہ میں ہم ایک استثنا پاتے ہیں اور وہ خواجہ حافظ ہیں۔ جن کا تتبع عُرفی کے نزدیک اس بنا پر روا ہے "کہ دلِ بکاود و دردِ سخنوری داند"

صفحہ ۶۳۔ ("آمدن حنا بہ ہند" کے معنے) شمس العلماء نے شاہانِ ہندوستان کی ادب نوازی اور علمی سرپرستی اور ایران کے علماء و شعراء کی ہندوستان میں آمد کے سلسلے میں صائب کا یہ شعر اور اس کا انگریزی ترجمہ درج کیا ہے:۔

نیست در ایران زمیں سامانِ تحصیلِ کمال   تا نیامد سوی ہندوستان حنا رنگین نشد

دوسرے مصرع کا مفہوم بیان کرنے میں شمس العلماء نے آمدن حنا بہند، یا رفتن حنا بہند، کے محاورے کی پروا نہ کرتے ہوئے لفظی ترجمہ پر قناعت کی ہے۔

Until hena (myatle) came to India it acquired no colaur.

شیرانی صاحب نے آمدن حنا بہند کے معنے سیاہی زدن حنا، بتائے اور میر رضی دانش کا یہ شعر بھی اپنی تائید میں نقل کیا:۔

راہ دور ہند پابست وطن دار دمرا
چوں حنا شب در میاں رفتن بہ ہندوستان خوش است

اور یہ بھی لکھا کہ ملک الشعراء بہار نے "آمدن حنا بہند" کی مثال میں صائب کا یہی شعر نقل کیا ہے۔ اور صائب نے اس محاورے کے استعمال میں صنعت ایہام کی رعایت ملحوظ رکھی ہے۔

جہاں کہیں تحقیق کی بازی ہو شمس العلماء فوراً ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور اصل مسئلہ سے اعراض کر کے بعض غیر متعلق چیزوں پر گفتگو شروع کر دیتے ہیں۔ اور بعض اوقات ذاتیات میں بُری طرح اُلجھ جاتے ہیں۔ یہاں انھوں نے حسب بوالعجبی کا

مظاہرہ کیا ہے، وہ اُن کی شان سے بہت گری ہوئی چیز ہے۔ جب خود ایران کا مشہور شاعر اور ادیب اس محاورے کے معنی تسلیم کرتا ہے، اور لغت نویسوں نے بھی یہی معنی بتائے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ شمس العلماء اس پر غور کرنے کے بجائے اپنی تہذیب اور شائستگی کا نمونہ اس طرح پیش کرتے ہیں:۔

"ایران میں بھی حنا سے مُراد سیاہی بمعنی کالک نہیں ہے بلکہ شوخی رنگ مراد ہے۔ لیکن وہ سیاہی جو مُبصّر کے ذہن میں سمائی ہے، اور جس کے اظہار کی وہ مُصنّف کو تاکید فرما رہے ہیں وہ حنا سے نہیں بلکہ تارکول سے حاصل ہوتی ہے، جس سے مُصنّف نے اپنے ترجمے میں خاص طور سے احتراز کیا ہے..... المختصر مبصّر کی یہ اصلاح اور تشریح سخت ناکارہ اور گمراہ کُن ہے۔"

شمس العلماء کے یہ الفاظ کسی تشریح و توضیح کے محتاج نہیں۔ اُن کا غصّے میں آپے سے باہر ہونا سمجھ میں آ سکتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کے شاہ کار کو یوں پامالِ تنقید ہوتا دیکھ کر بھلا کیوں کر دامانِ صبر سنبھال سکتے ہیں۔

حنا کی شوخی رنگ سے بھلا کسے انکار ہو سکتا ہے، لیکن یہاں سوال اس سیاہی کا ہے جو اس شوخی اور گہرائی کا پیش خیمہ ہے۔ غضب ہے کہ اتنی سی سیدھی بات بھی شمس العلماء کی سمجھ میں نہیں آتی۔ بہارِ عجم اور فرہنگ انندراج میں اس محاورے کے معنی "سیاہ شدن حنا" دئے ہیں۔ ایرانی فضلا اور مستشرقین یورپ کی ہندستانی فرہنگ نویسوں کی نسبت احسان مندی کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے جو شیرانی صاحب نے اپنے تبصرے کے آخر میں درج کیا ہے اور وہ یہ کہ جب پروفیسر براؤن کے ایرانی دوست "آمدن حنا بہند" کے معنی بتانے سے قاصر رہ گئے تو انھوں نے پروفیسر محمد شفیع مدظلہ العالی کی طرف رجوع کیا۔ پروفیسر موصوف نے لغات کے حوالے سے محاورے کے صحیح معنی، اس کا محلِ استعمال اور اُس کے شواہد نقل کر کے براؤن مرحوم کے پاس بھیج دئے۔ یہاں اس امر کی طرف اشارہ کر دینا بھی ضروری ہے کہ بہارِ عجم اور سروِ آزاد میں یہ شعر سلیم کے نام پر دیا گیا ہو نہ کہ صائب کے۔

صفحہ ۴۴۔ قرونِ وسطیٰ میں ایران و ہندوستان میں علمی و ادبی مساوات۔

شمس العلماء کا یہ محبوب نظریہ ہے۔ جس کا اعادہ انھوں نے اپنی کتاب میں بار بار کیا ہے، غزنویوں کے دورِ حکومت میں جہاں تک علم و ادب کا تعلق ہے ہندوستان ایران سے بجا طور پر ہمسری کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ اس نے ابوالفرج رونی اور مسعود سعد سلمان جیسے زبردست شاعر پیدا کئے جن کی تقلید پر شعرائے ایران کو بھی ناز تھا۔ لیکن اس مساوات اور ہمسری کے حق میں جو دلائل شمس العلماء نے پیش کئے ہیں۔ وہ حد درجہ کمزور اور خیالی ہیں اور اس کے علاوہ وقت اور زمانہ کی تعیین میں وہ بہت غیر محتاط ہیں۔

ایک سب سے بڑی دلیل جس کی بنیاد پر شمس العلماء اپنی شاندار عمارت کھڑی کرنا چاہتے ہیں، یہ ہے کہ قبل از اسلام عہد میں لاکھوں خاندان ایران سے ترکِ سکونت کر کے ہندوستان آکر پنجاب میں بس گئے تھے، اس طرح محمودی حملوں سے ایک دراز مدت قبل ہند و ایران میں ایک تمدنی رابطہ اور لسانی یگانگت قائم ہو گئی تھی جس کے نتیجے میں پنجاب نے فارسی زبان اور فارسی شعر کا ذوق اپنے میں رچا لیا۔ ہندوستان میں ایرانیوں کے اس ازدحام کی مدنی سودمندی اور وہ نفع جو ایرانی تمدن کے ساتھ مستقل اور پائیدار ارتباط پیدا کرنے سے اس کو اپنے تعلیمی اور لسانی ارادوں میں حاصل ہوا بے حد ہے۔ ان اثرات میں یہاں کے لوگوں کے ادبی مذاق میں اس قدر انقلاب پیدا ہوا کہ پنجاب میں پیہم ایسے شاعر پیدا ہونے لگے جنھوں نے خود اہلِ ایران سے خراجِ تحسین وصول کیا، اور جوہر لحاظ سے ایران کے بہترین اساتذہ کے ہمسر تھے" (اصل کتاب صفحہ ۴۴۲، ۴۴۸)

شمس العلماء کا یہ بیان عالم حقائق سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ خواب و خیال کی دلفریب دُنیا کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے۔ جن وجوہ کی بناء پر شیرانی صاحب اُسے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ وہ یہ ہیں:۔

(۱) قبل از اسلام عہد میں افراسیاب کا لاکھوں ایرانیوں کو ایران سے

نکال دینا اور اُن کا آکر پنجاب میں بس جانا تاریخی حیثیت سے ثابت نہیں کیا جا سکتا اوّل تو یہ کہ افراسیاب ایران کے کیانی خاندان کا ہم عصر ہے۔ جس کا تاریخی وجود مشتبہ ہے۔ اِس طرح افراسیاب کی شخصیت تاریخی نہیں بلکہ اساطیری رہ جاتی ہے۔ اب ایسی اساطیری شخصیت کے لئے آج جب کہ ایران قدیم کے متعلق زمانۂ حال کے محققین کی بصیرت افروز تحقیقات ہمارے سامنے ہیں۔ شمس العلماء کا سنجیدگی کے ساتھ یہ دعویٰ کرنا کہ اس نے لاکھوں ایرانیوں کو جلا وطن کر دیا کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ لیکن اس کے باوجود چونکہ انھیں اپنے اس دعویٰ پر اصرار ہے جس کے لئے وہ بزعم خود زبردست تاریخی سند پیش کر چکے ہیں اِس لئے ان کی تاریخی سند کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ اپنے دعوے کی تائید میں انھوں نے تین کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ طبقات اکبری، مُلّا بدایونی کی منتخب التواریخ اور یاقوت کا بیان جس کا حوالہ شمس العلماء کے محبوب تذکرۂ سلاطین آل غزنین میں موجود ہے۔ یاقوت ساتویں صدی ہجری میں اور نظام الدّین اور بدایونی گیارھویں صدی ہجری میں لکھ رہے ہیں۔ اب ان متاخّرین کا حوالہ ایک ایسے شخص کے لئے جو قبل از تاریخ زمانے کا آدمی ہے۔ کیوں کر قابلِ اعتبار ٹھیر سکتا ہے، لیکن شمس العلماء ہیں کہ وہ اس حوالہ کو ایک محکم تاریخی شہادت سمجھ رہے ہیں۔

(۲) "بہت دشوار ہے کہ یہ ایرانی مہاجر ہزاروں سال تک ہندوستان میں رہنے بسنے کے باوجود اپنی قدیم تہذیب اور تمدّن پر قائم رہے ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ وہ ہندوستان کی قدیم آبادی میں گھل مل گئے ہوں۔ صوبۂ گجرات میں پارسیوں نے اپنی قومیت کو ضرور محفوظ رکھا ہے۔ لیکن ایرانیوں کے مقابلے میں وہ زیادہ تر ہندوستانی ہیں۔ حتّٰی کہ ان کی زبان بھی ہندوستانی ہے۔"

شیرانی صاحب کے اس بیان کے جواب میں شمس العلماء یہاں پھر اقلیتوں کے اپنے تمدّن کو محفوظ اور قائم رکھنے پر ایک لمبی چوڑی تقریر شروع کر دیتے ہیں، لیکن ہندوستان کے پارسیوں کے متعلق بالکل خاموش ہیں اور یہ بتانے کی تکلیف

گوارا نہیں کرتے کہ انھوں نے گجرات میں فارسی کا ذوق پھیلانے کے لئے کون سی ساز گار فضا پیدا کی۔

(۳) شمس العلماء کے اس نظریئے پر سب سے بڑا اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ اگر ایرانی مہاجروں کی جماعت ہندوستان کی قدیم آبادی میں گھل مل جانے سے محفوظ بھی رہ گئی ہو تو یہ لوگ کوئی ایسی زبان بولتے ہوں گے جو قدیم فارسی یا اوستا سے ملتی جلتی ہوگی، اس صورت میں یہ لوگ ادبی مذاق کی شمع کیا روشن کرتے اور شعرو شاعری کی فضا کیا تیار کرتے۔

چونکہ اس اعتراض کا جواب دینا شمس العلماء کے لئے ازبس مشکل ہے، اس لئے وہ اپنے بچاؤ کی یہ صورت نکالتے ہیں:۔

"مصنّف کے بیان میں زبان کا قدیم یا جدید ہونا زیر بحث نہیں ہے۔ اس نے تو اپنی کتاب میں مسلمہ اصول کے ماتحت صرف اس امر کو واضح کیا ہے کہ ان مہاجرین کا اثر جو بزمانۂ قبل اسلام پنجاب کے مرکزی شہر لاہور کے مضافات میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ اس خطّے کے باشندوں کی زبان اور معاشرت پر پڑ رہا تھا۔ اور علیٰ ہذا القیاس خطۂ لاہور کی زبان و معاشرت ان مہاجرین پر اپنا رنگ جما رہی تھی۔"

اگر شمس العلماء کا بیان محض اتنا ہی ہوتا تو ہمیں ان سے تعرض کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی، لیکن وہ ذکر کر رہے ہیں قبل از اسلام کے ایرانی مہاجروں کا اور نظّام معتزلی کے اصول طفرہ پر عمل کرتے ہوئے کئی صدیوں کی چھلانگ لگا کر اس ایران و ہند کے تمدّنی ارتباط اور لسانی یگانگت کا اثر پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں بتاتے ہیں جب ابوالفرج رونی اور مسعود سعد سلمان جیسے شاعر فارسی شاعری میں شاندار اضافہ کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ قبل از اسلام عہد کی فارسی زبان اور رونی اور مسعود کی فارسی میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ جب لسانی یگانگت ہی سرے سے مفقود ہے پھر اس کا اثر کہاں سے آ داخل ہوا۔ ایران اور ہندوستان کے درمیان

علمی مساوات کی اصل توجیہہ وہ ہے، جو شیرانی صاحب نے اپنے تبصرے میں بیان کی ہے:۔

"وہ (شمس العلماء) پنجاب میں غزنوی عہد کے دو شاعر ابوالفرج رونی اور مسعود سعد سلمان کے کلام کے نمونے دے کر یہ بحث چھیڑتے ہیں کہ ہندوستان کی شاعری ایرانیوں کی شاعری کے بالکل مساوی ہے۔ اس حد تک ہم ان کے ساتھ متفق ہیں۔ غزنی اس عہد میں فارسی شاعری کا گہوارہ تھا، پنجاب سلطنت غزنہ کا ایک صوبہ بن گیا تھا۔ بسلسلۂ ملازمت متعدد خاندان پنجاب میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ اُن آبادکاروں نے اپنی زبان و تہذیب اور دیگر روایات کو محفوظ رکھا۔ اس لئے ان کی شاعری کا وہی درجہ ہونا چاہیئے جو غزنویوں کی شاعری کا تھا، اور اُس میں کسی فخر اور تعجب کی بات نہیں وہ فارسی کے اہلِ زبان تھے، اپنے تمدن پر قائم رہے، لہٰذا دوسرے علاقے میں آباد ہو جانے سے کم از کم ایک دو نسل تک ان کی قومیت میں کوئی نہیں آسکتا۔"

صفحہ ۷۶۔ ابوالفرج رونی:۔ "کئی تصانیف ابوالفرج کی یادگار ہیں لیکن جو آج باقی ہیں ان میں ایک رسالہ عروض پر ہے اور ایک ضخیم دیوان ہے، جو اس نے اپنے مربی سلطان ابراہیم کے نام پر معنون کیا۔"

شمس العلماء کے اس مختصر بیان میں شیرانی صاحب نے تین غلطیاں بتائیں:۔

(۱) ابوالفرج نے عروض پر کوئی تصنیف اپنی یادگار نہیں چھوڑی۔

(۲) اس کے دیوان کو ضخیم کہنا تصدیق طلب ہے۔

(۳) اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ ابوالفرج نے اپنا دیوان سلطان ابراہیم کے نام پر معنون کیا۔

نمبر (۱) کے متعلق شمس العلماء فرماتے ہیں کہ "اس کو غیر ضروری سمجھ کر انھوں نے حوالہ نقل نہیں کیا۔" ان کو اگر ذرا بھی یہ گمان ہوتا کہ زمانۂ مستقبل قریب میں ایک ایسے صاحبِ تبصرہ سے دوچار ہونا پڑے گا، جس کا مسلک ہی تنقیص و نکتہ چینی ہوگا تو وہ یقیناً اس عروضی تالیف کا ماخذ مع حوالہ صفحہ و سطر نوٹ کر لیتا۔" ایک

مصنف کے لئے یہ اعتراض اور پہلو بھی اچھی نہیں۔ انہیں پہلے کی طرح یہاں بھی سہوِ نظر یا سہوِ قلم کا عذر پیش کر دینا چاہیئے تھا۔ اور بس (نمبر۲) کے بارے میں شمس العلماء نے اپنے اسی پُرانے حربے سے کام لیا ہے یعنی یہ کہ شیرانی صاحب نے ان کی اس انگریزی عبارت کا ترجمہ دُرست طریق پر نہیں کیا:۔

"Abul Faraj left several works of which those extant are...."

ان کے نزدیک اس کا دُرست ترجمہ یہ ہونا چاہیئے :۔ ابوالفرج نے متعدد تصانیف چھوڑیں جو ان میں باقی رہیں الخ"

وہ فرماتے ہیں کہ مصنف کی مندرجۂ بالا عبارت میں لفظ "آج" موجود نہیں ہے جو مبصرؔ کا جعلی مستزاد ہے۔ حالانکہ شمس العلماء کا ترجمہ "جو ان میں باقی رہیں" صحیح نہیں لفظ extant کے معنے still existing ہیں یعنی جواب بھی موجود ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ جب شمس العلماء کے لئے کوئی راہ گریز نہیں رہتی تو وہ یہ کہہ کر بچ نکلنا چاہتے ہیں کہ مبصرؔ ان کی انگریزی عبارت کا مفہوم نہیں سمجھ سکے۔

نمبر (۳) کے متعلق شمس العلماء نے سکوت کو گویائی پر ترجیح دی ہے اور بہتر بھی یہی ہے۔

صفحہ ۶۹۔ سنائی کے ہندی اشعار۔

اس عُنوان کے تحت شمس العلماء نے سنائی کے دو شعر دئے ہیں جن میں ہندی الفاظ صرف دو ہیں۔ یعنی لنگھن اور پانی، ان اشعار کو کسی طرح بھی ہندی نہیں کہا جا سکتا لیکن شمس العلماء کی عالمانہ تحقیق ملاحظہ ہو کہ ایک دلفریب عُنوان تراش کر دو فارسی اشعار نقل کرتے ہیں اور جب شیرانی صاحب اس بے احتیاطی کی طرف ان کی توجہ مبذول کراتے ہیں تو اپنی غلطی تسلیم کرنے کے بجائے مناظرانہ انداز میں لکھتے ہیں کہ:۔

"نمونہ کے لئے تھوڑی ہی چیز پیش کی جاتی ہے کیونکہ زیادتی مقدار سے نمونہ کی

صفت قائم نہیں رہتی"

سنائی کے ہندی اشعار کا نمونہ بقول شمس العلماء:-

گرترا لنگھنت کُند فربہ سیر خوردن تراز لنگھن بہ

نہ در آمدن معدہ خدرہ میدہ نہ دراں دیدہ قطرۂ پانی

صفحہ ۷۰۔ بیک واسطہ شاگرد کے معنی۔

شمس العلماء نے "بیک واسطہ شاگرد مسعود سعد سلمان بود" کا ترجمہ حسب ذیل کیا ہے :-

"and in a way a pupil of Masud Sad Salman."

شیرانی صاحب نے بتایا کہ بیک واسطہ شاگرد کے معنی یہ ہیں کہ وہ مسعود کے شاگرد کا شاگرد ہے، شمس العلماء اس مفہوم سے ناواقف تھے لیکن اپنی ناواقفیت کو چھپانے کے لئے اپنے ترجمے کو بہتر اور پسندیدہ تر بتاتے ہیں حالانکہ "in a way" (یعنی ایک لحاظ سے) ہرگز ہرگز بیک واسطہ شاگرد، کا مفہوم ادا نہیں کرتا۔ واقعہ یہ ہے کہ شمس العلماء بیک واسطہ کا مفہوم نہیں سمجھ سکے، چنانچہ وہ صفحہ ۲۶۴ پر لکھتے ہیں:-

"He was a pupil of Masud Sad Salman the famous Indian poet already cited."

اسی طرح امام فخرالدین رازی کے متعلق بدایونی کے بیان میں تملق اور نفاق کا نام شیرانی صاحب نے خوشامد اور نفاق کیا ہے۔ لیکن شمس العلماء امام رازی کے تقدس کا واسطہ دے کر اس سے اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہیں اور تملق کا ترجمہ "دوستی یا سازگار موافقت، اور نفاق کا ترجمہ جھگڑا یا اختلاف بتاتے ہیں جو کسی حیثیت سے بھی درست نہیں۔ تملق اور نفاق کے معنی ایک ہی رہیں گے خواہ وہ کسی عالم اور حامل شریعت کے لئے استعمال کئے جائیں خواہ کسی رند گنہگار کے لئے۔

امام رازی کے سلسلے میں شمس العلماء فرماتے ہیں کہ "انھوں نے بدایونی کی حرف بحرف پیروی اس لئے نہیں کی کہ ان کے پاس بدایونی کے ماخذ اور حوالے کی کوئی سند موجود نہ تھی جس کو وہ عندالطلب اپنی براءت میں پیش کرتے"۔ یہی روایت ابن الاثیر کی الکامل میں ایک دوسری صورت میں پائی جاتی ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ امام رازی سلطان شہاب الدین کے مکان پر وعظ کہا کرتے تھے، ایک روز حاضر ہوئے اور وعظ کیا اور اپنے وعظ کے آخر میں کہا "کہ اے سلطان نہ تیری بادشاہت رہے گی اور نہ رازی کی تلبیس ہم سب کو خدا کی طرف لوٹنا ہے۔ شہاب الدین اتنا رویا کہ لوگوں کو اس کی گریہ زاری پر ترس آگیا (الکامل بارھویں جلد صفحہ ۱۰۰) شمس العلماء کو چاہیئے کہ ابن الاثیر سے بھی باز پرس کریں کہ اُس نے امام رازی کی نسبت تلبیس کا لفظ کیوں استعمال کیا ہے۔

صفحہ ۲۷۔ شیخ علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخش۔

خواجہ معین الدینؒ اجمیری کے تذکرے کے ضمن میں شمس العلماء نے شیخ علی ہجویری پر خواجہ صاحب کی برتری ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے اور ذیلی حاشیے میں شیخ ہجویری کی مشہور عالم تصنیف "کشف المحجوب" کو ان سوالات کا جواب بتایا ہے جو شیخ کے ایک دوست اور رفیقِ طریقت ابو سعید ہجویری نے وقتاً فوقتاً کئے تھے۔ شمس العلماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ کتاب لاہور میں لکھی گئی تھی۔

شیرانی صاحب کی رائے میں شیخ ہجویری اور خواجہ اجمیریؒ کے درمیان مقابلہ اور موازنہ مناسب نہیں اس لئے کہ شیخ ایک عالی مرتبہ صوفی ہونے کے علاوہ کشف المحجوب جیسی گراں قدر کتاب کے مصنف ہیں جو فارسی ادب میں ایک امتیازی حیثیت کی مالک ہے۔ دوسرے یہ کہ کتاب کے بعض مندرجات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کتاب لاہور میں نہیں بلکہ ہندوستان کے باہر کہیں لکھی گئی ہے۔ تیسرے یہ کہ یہ کتاب سوالات کا جواب نہیں جو وقتاً فوقتاً شیخ کے ایک دوست نے ان سے کئے بلکہ صوفی اور صوفیانہ زندگی، طریق تصوف،

مصطلحات تصوّف، مقامات صوفیہ، ان کے مذاہب اور مقالات اور رموز و اشارات پر ایک جامع کتاب ہے۔

جس انوکھے انداز میں شمس العلماء اپنی صفائی پیش کرتے ہیں اس کا اندازہ ان کے جواب کے تمہیدی جُملوں سے لگایا جا سکتا ہے:

"مصنّف کو کشف المحجوب اور ایرانی و انگریزی کتُب تواریخ کے مطالعے سے جس میں ڈاکٹر نکلسن کا مقالہ بھی شامل ہے۔ جو کچھ مکشوف ہوا وہ سُپردِ قلم کر دیا گیا ہے۔ اس میں نہ کوئی غیر معمولی دعویٰ ہے" اور نہ کوئی اعلانِ جنگ۔ اگر مبصّر اس کو تسلیم نہیں کرتے تو نہ سہی۔ وہ اپنے مخصوص نظریے کے مالک و مختار ہیں۔"

ہمیں خود بھی اسی امر کا افسوس ہے کہ شمس العلماء نے کشف المحجوب اور ڈاکٹر نکلسن کے مقالے پر نہایت ہی سرسری نظر ڈالی ہے ورنہ ان کے قلم سے ایسی باتیں نہ نکلتیں جو تحقیق کی کسوٹی پر پوری نہ اُتر سکیں۔

(۱) شمس العلماء فرماتے ہیں کہ میں نے شیخ ہجویری اور خواجہ صاحب کے درمیان کوئی مقابلہ نہیں کیا بلکہ ہر ایک کے کارناموں کی خصوصیات بتائی ہیں۔ ہم بسر و چشم شمس العلماء کے اس بیان کو صحیح تسلیم کر لیتے اگر انھوں نے یہاں پھر تقابل کی کوشش نہ کی ہوتی۔ بہر حال یہ پسند اور ذوق کا معاملہ ہے۔ خواجہ صاحب سے شمس العلماء کی زبردست عقیدت خواجہ صاحب کی برتری کا کھُلا اعلان ہے اور شمس العلماء اس بات کے کہنے کے پورے مجاز ہیں کہ خواجہ صاحب بے اولادوں کو اولاد عطا کرتے ہیں اور بے مُرادوں کی مُرادیں بر لاتے ہیں وعلیٰ ہذا القیاس۔

(۲) ڈاکٹر نکلسن جنھوں نے کشف المحجوب کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے خود زیادہ سے زیادہ یہ کہتے ہیں کہ اس کا کچھ حصّہ لاہور میں لکھا گیا ہے اور ان کا یہ قیاس خود شیخ کے اس بیان پر مبنی ہے کہ:-

کتب من بہ حضرت غزنین مانده بود و من از اجارۂ لاہور کہ از مضافات ملتان است

درمیان ناجنسان گرفتار شدہ بودم" کشف المحجوب مرتبہ نرکوحسکی (صفحہ ۱۰۱)
میں یوں درج ہے :۔
"امادریں وقت بیش ازیں ممکن نگشت حرسہا اللہ ماندہ بود و من اندر دیار ہند اندر میان ناجنساں گرفتار ماندہ۔"
اس اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کشف المحجوب غزنی یا کسی اور جگہ انجام کو پہنچی ہے نہ کہ لاہور میں۔ دوسرے یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ پہلی مرتبہ لاہور میں آنے کے بعد شیخ واپس غزنی چلے جاتے ہیں اور شمس العلماء کا یہ بیان غلط ہے کہ لاہور میں آکر وہ یہیں مقیم ہو گئے اور پھر کہیں نہیں گئے۔ شیخ کے یہ جملے بھی جو شیرانی صاحب نے اپنے تبصرے میں نقل کئے ہیں اسی بات کے موید ہیں کہ کشف المحجوب ہندوستان کے باہر لکھی گئی ہے :۔
"و اندر ہندوستان مردی دیدم کہ مدعی بود بہ تفسیر و تذکیر و علم با من اندریں معنی مناظرہ کرد، و در ہندوستان دیدم کہ اندر زہر قاتل کرمی پدید آمدہ بود و زندگی وی بداں زہر بود۔"
(۳) شمس العلماء اپنے اس بیان سے کہ کشف المحجوب مخدوم کے ایک رفیقِ طریقت ابو سعید الہجویری کے وقتاً فوقتاً کئے ہوئے سوالات کے جوابات کا مجموعہ ہے۔ نہایت ہوشیاری کے ساتھ وقتاً فوقتاً From time to time کے الفاظ خارج کر دیتے ہیں جو ان کی اصل کتاب میں موجود ہیں اور جن پر اصلی اعتراض وارد ہوتا ہے۔ ابو سعید نے شیخ سے وقتاً فوقتاً کوئی سوال نہیں کئے بلکہ شیخ سے ان الفاظ میں درخواست کی ہے :۔
"بیان کن مرا اندر تحقیق طریقت تصوف و کیفیت مقامات ایشان و بیان مذاہب و مقالات، اظہار کن مرا رموز و اشارات ایشاں و چگونگی محبت خدائی عزوجل و کیفیت اظہار آن بر دلہا آں و سبب حجاب عقل از کُنہِ ماہیت آں و نفرت نفس از حقیقت آں و آرام روح با صفوت آں و آنچہ بدیں

تعلق دارد از معاملت آں"۔

یہ ہے ابوسعید کی درخواست یا سوال جس پر شیخ نظام تصوف پر ایک جامع کتاب لکھتے ہیں یہ کتاب ان سوالات کا جواب نہیں جو ابوسعید وقتاً فوقتاً شیخ سے کرتے ہیں جیسا کہ شمس العلماء ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔

شیرانی صاحب کے تبصرے میں کئی جگہ شمس العلماء نے بزعم خود تاریخ کی غلطیاں ڈھونڈھ نکالی ہیں، اس کی ایک مثال کشف المحجوب کی تاریخ تصنیف ہے جس کے متعلق شیرانی صاحب نے لکھا کہ ۴۳۱ ہجری بتائی جاتی ہے۔ کتابت کی غلطی سے ۳۳۱ ہجری چھپ گیا لیکن اس کی تصحیح جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے رسالہ اُردو کے شمارہ جولائی ۱۹۴۳ء میں کر دی گئی تھی۔ بھلا شمس العلماء اس تصحیح پر کیوں نظر ڈالنے لگے۔ انھیں تحقیق حق منظور کب ہے۔ وہ تو مجلس مناظرہ قائم کر کے اپنی فتح مندی کا اعلان کر رہے ہیں لیکن انھیں یاد رکھنا چاہیئے کہ ؎

بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں تماشائی بھی

صفحہ ۱۴۷۔ خواجہ معین الدین سنجری ہیں یا سجزی؟ اور کیا خواجہ صاحب پہلے صوفی ہیں جو بالائی ہندوستان میں آکر تصوّف کا چراغ روشن کرتے ہیں؟

شمس العلماء کو اصرار ہے کہ اکثر مؤرخین نے سنجری لکھا ہے بعض نے سنجری بعض نے "ہروی از قریۂ چشت" اور بعض نے اصفہانی وغیرہ، کیا ہی اچھا ہوتا، اگر شمس العلماء کسی ایک موّرخ کا حوالہ نقل کر کے یہ بتاتے کہ وہ خواجہ صاحب کو سنجری لکھتا ہے، وہ یکسر یہ بتانے سے قاصر ہیں لیکن پھر بھی وہ اس کا اظہار واجب سمجھتے ہیں کہ اصل لفظ اکثر تواریخ میں سنجری لکھا ہے نہ سجزی۔ ہم بہت سی تاریخ کی کتابوں کے حوالے ان سے طلب نہیں کرتے، وہ کسی ایک موّرخ کی شہادت ہی پیش کر دیں تو ہم آمنّا و صدّقنا پکار اُٹھیں گے۔

شیرانی صاحب نے سجزی کے حق میں آئین اکبری، تاریخ فرشتہ اور عصامی کی فتوح السلاطین کے حوالے نقل کئے۔ اتّفاق سے آئین اکبری تک شمس العلماء،

کی رسائی نہ ہو سکی، تاریخ فرشتہ کا جو نسخہ شمس العلماء کے زیر مطالعہ ہے اس میں "و تولد او در بلدہ سجستان بودہ" موجود نہیں، شمس العلماء نے ہمیں یہ نہیں بتایا کہ ان کے پاس فرشتہ کا کون سا نسخہ ہے، نولکشور کا یا بمبئی کا، ممکن ہے کہ ان کے کتاب خانہ میں کوئی قلمی نسخہ ہو۔ ہم ان سے درخواست کریں گے کہ وہ دوبارہ نولکشوری ایڈیشن دیکھنے کی زحمت گوارا فرمائیں تو انھیں مندرجہ بالا الفاظ مل جائیں گے، رہی فتوح السلاطین تو اس کے مرتب ڈاکٹر مہدی حسین نے وہی قرأت پسند کی ہے جس کا حوالہ شیرانی صاحب نے اپنے تبصرے میں دیا ہے۔

معین الدین آں سجزی دین پناہ — کہ خفتہ است باجمیر آں مرد راہ

شمس العلماء یہاں جلد بازی سے کام لیتے ہوئے پہلے مصرع میں یوں اصلاح دیتے ہیں:-

معین دین آں سنجری دین پناہ

کاش انھیں اس بات کا علم ہوتا کہ ہر سمجھ دار آدمی اُسے اِسی طرح پڑھے گا یہاں اصلاح دینے کی کوئی ضرورت نہیں وہ فتوح السلاطین کا مطالعہ فرمائیں گے تو انھیں اس قسم کی بے شمار مثالیں ملیں گی، اصلاح کے بعد بھی اس سند کو مجہول اور ناقابل قبول ٹھیراتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہ لفظ سجزی اور سنجری دونوں پڑھا جا سکتا ہے لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ اسی غلط پڑھنے کی بدولت وہ آج اس لفظ کے سنجری ہونے پر مصر ہیں۔

اکبر نامہ جلد دوم کے انگریزی ترجمہ کے صفحہ ۲۳۸ پر یہ عبارت ملتی ہے:-

"The Khwaja came from Sistan and They write him Syzi which is Arabic for Sigzi"

انڈیا آفس کی فہرست مخطوطات کے مرتب ایتھے صفحہ ۲۶۴ پر لکھتے ہیں:-

"Sizi as explained in a margined glass an folio 5a."

"بکسر سین مہملہ و سکون جیم و کسر زائی معجمہ"

یہ ایک نہایت ہی معمولی بات ہے کہ سیستان یا سجستان کے رہنے والے کو سکزی یا سجزی کہتے ہیں شمس العلماء کا اپنا بیان ہے کہ خواجہ صاحب کے بزرگ سیستان میں رہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ سیستان کے باشندے کو سجزی کہیں گے نہ کہ سنجری۔ تحفتہ الکرام کا مصنف علی شیر قانع دوسری جلد کے صفحہ ۸۵ پر یوں رقمطراز ہے:۔

"سیستان۔ آں را سجستان نیز گویند چہ سجستان بن فارس آباد کردہ وبہ زابلستان وشہر نیمروز نیز شہرت دارد واہل آں دیار را سکزی نیز می خوانند وعرب معرب ساختہ سجزی نیز کردند"۔

اور پھر صفحہ ۸۶ پر مشاہیر سیستان میں خواجہ معین الدین سجزی شیخ الشیوخ طریقت کا ذکر بھی کرتا ہے۔

شمس العلماء کا بیان ہے کہ خواجہ صاحب پہلے صوفی ہیں جو بالائی ہندوستان میں آکر تصوف کا چراغ روشن کرتے ہیں۔ اگرچہ شیرانی صاحب نے محض اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور اس پر کوئی نکتہ چینی نہیں کی لیکن شمس العلماء کو یہ اشارہ بھی ناگوار گزرا اور انھوں نے اپنے بیان کو سچا ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا ہے لیکن ہمیں افسوس ہے کہ اس جہد بلیغ کے باوجود بھی وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ شمس العلماء فرماتے ہیں کہ ان کا بیان "ایرانی مورخین اور محققین یورپ کے زبردست اسناد پر مبنی ہے"۔ آیئے ذرا ان اسناد کا جائزہ لیں۔ ایرانی مورخین میں سے مجمع الفصحا کے مصنف رضا قلی ہدایت کا بیان ملاحظہ ہو:۔

"وی در ہندوستان مروج مذہب اسلام شدہ"

اس بیان میں تصوف کا کہیں ذکر موجود نہیں۔ شمس العلماء محض اس بیان کی بناء پر یہ کیسے دعویٰ کر سکتے ہیں کہ خواجہ صاحب پہلے صوفی ہیں جنھوں نے بالائی ہندوستان میں آکر تصوف کا چراغ روشن کیا۔ یہ ایرانی مورخ تو یہاں محض ہندوستان میں اسلام کی ترویج واشاعت کا ذکر کر رہا ہے نہ کہ تصوف کے فروغ وترقی کا۔ اور اس پر لطف یہ ہے کہ اس ایرانی مورخ کے مندرجہ بالا

بیان میں یہ کہیں نہیں پایا جاتا کہ خواجہ صاحب ہندوستان میں پہلے مبلّغ اسلام ہیں۔ تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں خواجہ صاحب کی خدمات ہر لحاظ سے مستحق ستائش ہیں لیکن جس طرح یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ہندوستان میں اسلام کے پہلے مبلّغ ہیں اسی طرح یہ دعویٰ بھی بے بُنیاد ہے کہ خواجہ صاحب پہلے صوفی ہیں جنھوں نے بالائی ہندوستان میں آکر تصوّف کا چراغ روشن کیا۔ اِن سے بہت پہلے شیخ علی ہجویری جیسے بزرگوار اپنے مبارک وجود سے اس سرزمین کو مشرّف کر چکے تھے۔ ہاں اگر شمس العلماء کہیں کہ چشتیہ سلسلہ کو بعض اسباب کی بناء پر بہت فروغ حاصل ہوا تو ایک امر واقعہ ہوا ایرانی مورّخ کی شہادت تو آپ ملاحظہ فرما چکے۔ محقّقین یورپ میں سے ڈاکٹر ریو اور ڈاکٹر نکلسن کا نام لیا گیا ہے لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ وہ بھی خواجہ صاحب کو ہندوستان کا پہلا صوفی مانتے ہیں۔ کشف المحجوب کا ترجمہ کرنے کے باوجود ڈاکٹر نکلسن ایسی غلط بات کیونکر کہہ سکتے ہیں۔

صفحہ ۸۰۔ خواجہ معین الدّین اجمیری کا دیوان۔

شمس العلماء خواجہ صاحب کی غزلیات پر رائے زنی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ خواجہ صاحب اپنے عہد کے سب سے بڑے شاعر تھے! اس بات پر قناعت نہ کرتے ہوئے وہ خواجہ صاحب کا حافظ سے مقابلہ کر کے اوّل الذکر کی برتری اور تفوّق کا اظہار کرتے ہیں۔

شمس العلماء کے لئے بڑی مشکل یہ ہے کہ وہ اپنے ہم عصر علماء کی تحقیقات سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور اگر کبھی استفادہ کریں بھی تو اکثر اصل ماخذ کا ذکر غائب کر جاتے ہیں۔ رسالہ اُردو کے شمارۂ جولائی ۱۹۲۷ء میں شیرانی صاحب اپنے ایک مفصّل مضمون میں اس پر بحث کر چکے ہیں کہ یہ دیوان جو خواجہ معین الدّینؒ اجمیری کی طرف منسوب ہے دراصل مولانا جامی کے ہم عصر مولانا معین الدّین کی مِلک ہے۔ اس دیوان کی کئی غزلیں مولانا معین الدین کی کتاب "معارج النبوۃ" میں درج ہیں جہاں مُصنّف صاف طور پر انھیں اپنی تصنیف بتاتا ہے۔ اگر شیرانی صاحب کا یہ

مضمون شمس العلماء کے پیش نظر ہوتا تو وہ خواجہ صاحب کو صاحبِ دیوان قرار نہ دیتے اور حافظ شیریں سخن سے ان کا مقابلہ کرنے کا خیال تک بھی اپنے دل میں نہ لاتے۔ شمس العلماء کے اس فرضی بیان پر شیرانی صاحب اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"خواجہ صاحب نہایت خوش قسمت ہیں جنھیں شمس العلماء کی ذات میں ایسا جوشیلا معتقد مل گیا ہے جس نے تمام دُنیا کے برخلاف نہ صرف خواجہ صاحب کو شاعر ہی ثابت کر دیا بلکہ پورے جوش و خروش کے ساتھ ان کی شاعری کے پائے کو حافظ سے بھی بڑھا دیا لیکن یہ کیا حقیقت ہے یا ہم کوئی خواب دیکھ رہے ہیں۔"

شیرانی صاحب نے شمس العلماء کے اطمینان قلب کے لئے ان کی انتخاب کردہ غزلیات میں سے نمونتاً ان چند غزلوں کی نشان دہی بھی کی جو مولانا معین الدین کی تالیف "معارج النبوۃ" میں درج ہیں اور آخر میں یہ بھی لکھا کہ:۔

"جب دیوان کے اس قدر ابیات مولانا کے ثابت ہوئے تو کیا وجہ ہے کہ باقی غزلوں کو مولانا کی زادۂ طبع نہ مانیں اور تمام دیوان ان ہی کی طرف منسوب نہ کریں جس کے فی الحقیقت وہ مالک اور جائز مالک ہیں۔"

یہ چونکا دینے والی اطلاع شمس العلماء کی خواجہ صاحب سے از حد عقیدت کی بنا پر ان کے لئے نہایت ہی مایوس کُن ثابت ہوئی۔ وہ تو اپنے زعم میں خواجہ صاحب کو حافظ سے بھی بہتر شاعر قرار دے چکے تھے لیکن اب وہ عالیشان قصر جس کی حقیقت بیت العنکبوت کی سی تھی دھم سے آگرا۔ اور شمس العلماء کی امیدیں خاک میں مل گئیں اگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ہمت ہار دیتا۔ لیکن شمس العلماء ایسی باتوں سے تھوڑی دبنے والے ہیں چنانچہ انھوں نے خواجہ صاحب کے شاعر و صاحبِ دیوان ہونے کے حق میں مندرجہ ذیل زبردست دلائل پیش کئے۔

(۱) ایرانی تذکرہ نویسوں کی سند پر خواجہ صاحب کو شاعر قرار دیا گیا

ہے۔ مجمع الفصحا کی جلد اوّل میں خواجہ صاحب کا تذکرہ شعرائے فارسی کے ماتحت کیا گیا ہے۔ اس لئے شیرانی صاحب کا یہ الزام کہ شمس العلماء نے تمام دُنیا کے برخلاف خواجہ صاحب کو شاعر ثابت کر دیا ہے۔ بالکل بے بنیاد اور مضحکہ خیز ہے"۔ مزید برآں مجمع الفصحا کے مُصنّف نے خواجہ صاحب کے منتخب اشعار بھی بطور نمونہ کلام ان کے دیوان سے اپنے تذکرے میں نقل کئے ہیں جو خواجہ صاحب کے نہ صرف شاعر بلکہ صاحبِ دیوان ہونے کا بھی ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کر رہے ہیں۔

نولکشور پریس نے پہلی مرتبہ ۱۲۸۸ھ میں خواجہ صاحب کا دیوان طبع کیا اور ادھر رضا قلی ہدایت ۱۸۷۲ء میں وفات پا چکے تھے، یقیناً ان کے پاس کوئی دوسرا قدیم ایرانی نُسخہ ہوگا جس سے اُنھوں نے خواجہ صاحب کے اشعار انتخاب کر کے اپنے تذکرے میں درج کئے ہیں"۔

یہ ہیں شمس العلماء کے زبردست دلائل۔ خواجہ صاحب کو شاعر ثابت کرنے کے سِلسِلہ میں مجمع الفصحاء کی شہادت چنداں وقیع نہیں اس لئے کہ فحول شعراء کے تذکرے کے ساتھ ساتھ اس میں بعض ایسے مشاہیر کا ذکر بھی موجود ہے جنھوں نے اپنی زندگی میں گاہے گاہے طبع آزمائی کی ہے۔ ان سلاطین اور امراء کے علاوہ جن کے اشعار کے نمونے مجمع الفصحاء کے ابتدائی صفحوں میں دئے گئے ہیں خود فصحاء کے زمرے میں ابن سینا، امام غزالی اور محقق طوسی کے اشعار درج کتاب ہیں اگر یہ علماء چند شعر کہنے کی بناء پر شاعر کہلانے کے مستحق ہو سکتے ہیں تو اس صورت میں خواجہ صاحب کو بھی شاعر کہا جا سکتا ہے۔ مجمع الفصحاء میں خواجہ صاحب کے دو شعر اور دو رُباعیاں درج ہیں۔ اس ایرانی تذکرہ نویس نے خواجہ صاحب کی بابت جو تین چار سطریں لکھی ہیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس بارے میں اس کی معلومات ناقص ہی نہیں بلکہ غلط بھی ہیں۔ چونکہ شمس العلماء اس ایرانی محقق کے بہت گرویدہ ہیں ہم ذیل میں اس کی عبارت نقل کرتے ہیں:۔

"معین الدّین چشتی ۔ از خواجگان سلسلہ چشتیہ و از اصحابش سلطان شمس الدّین غوری و شہاب الدّین غوری بودہ اند دی در ہندوستان مروّج مذہب اسلام شدہ اصلش از چشت من توابع ہرات است ۔ از آن جناب است ۔"

خواجہ صاحب کے لئے یہ کہنا کہ " اصلش از چشت من توابع ہرات است" کس قدر غلط ہے ۔ پھر شمس الدّین کو غوری بتانا کہاں تک صحیح ہے!
شمس العلماء کا یہ دعوٰی کہ رضا قلی نے خواجہ صاحب کے اشعار کسی قدیم ایرانی نُسخے سے نقل کئے ہوں گے حد درجہ کمزور اور فرضی ہے ۔ رضا قلی اپنے تذکرہ میں ہرگز ہرگز خواجہ صاحب کو صاحبِ دیوان نہیں بتاتا ۔ کوئی تعجّب نہ ہوگا کہ رضا قلی نے وہی اشعار نقل کئے ہوں جو تقی اوحدی، والہ داغستانی اور میر حسین دوست سنبھلی یا کسی اور تذکرہ نگار نے خواجہ صاحب کی طرف منسوب کئے ہیں ۔ جو دو رُباعیاں مجمع الفصحاء میں خواجہ صاحب کے نام سے دی گئی ہیں ۔ لُطف علی آذر اپنے آتش کدہ میں وہی دو رُباعیاں الفاظ کی معمولی تبدیلی کے ساتھ خواجہ صاحب کی طرف منسوب کرتا ہے ۔

(۲) " شیخ علی ہجویری کی شان میں خواجہ صاحب کے قصیدے کا یہ مطلع بھی جسے مبصّر نے اپنے تبصرے میں نقل کیا ہے ۔ خواجہ صاحب کے شاعر ہونے کا ثبوت ہے ۔

گنج بخش ہر دو عالم مظہرِ نورِ خدا

ناقصاں را پیرِ کامل، کاملاں را رہنما"

عام طور پر صرف یہی ایک شعر نقل کیا جاتا ہے لیکن آج شمس العلماء سے ہم یہ سُن رہے ہیں کہ ایک پورا قصیدہ لکھا گیا تھا جس کا مطلع مندرجۂ بالا شعر ہے، بفرضِ محال یہ شعر ایک قصیدے کا مطلع ہے پھر بھی اس سے خواجہ صاحب کا صاحبِ دیوان ہونا کہاں ثابت ہوا ۔ کیا ہر شخص جس نے کبھی کبھار چند شعر نظم

گئے ہوں۔ صاحبِ دیوان شاعر کہلانے کا مُستحق ٹھہرتا ہے؟

اس کے علاوہ شیرانی صاحب خود اپنے تذکرے میں تقی اوحدی، والہ اور میر حسین دوست سنبھلی کا خواجہ صاحب کی طرف اشعار منسوب کرنا بیان کر چکے ہیں۔

(۳) شمس العلماء نے دعویٰ کیا ہے کہ بغیر دھوکہ کھائے خواجہ صاحب کی جن غزلوں کا انگریزی ترجمہ اُنھوں نے اپنی کتاب میں دیا ہے۔ وہ نولکشور ایڈیشن کی غزلوں سے مختلف ہیں۔ چنانچہ مقابلہ کر کے دیکھا جا سکتا ہے کہ دونوں میں کس قدر تفاوت لفظی ہے۔

جب شمس العلماء کو خود اس بات کا اقرار ہے کہ دیوان کا وہ نُسخہ جس سے اُنھوں نے استفادہ کیا ہے ہندوستان میں ۱۹۱۰ء میں طبع ہوا ہے (یعنی نولکشور پریس کا ایڈیشن) پھر کیا ہم ان سے دریافت کر سکتے ہیں کہ اُنھوں نے کس مطبوعہ یا قلمی نسخے کی سند پر غزلوں کے الفاظ میں تغیر و تبدّل کیا ہے واقعہ یہ ہے کہ اپنے اس اصول کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے کہ کسی قرأت میں کوئی تبدیلی نہ کرنی چاہیئے جب تک کہ کلام کے مہمل ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔ شمس العلماء نے ایک آدھ جگہ اصلاح دینے کی کوشش کی ہے لیکن جیسا کہ شیرانی صاحب نے بتایا ہے۔ شمس العلماء نے صحیح کلام کو مہمل بنا دیا ہے۔ مطبوعہ دیوان میں معین الدّین کی ایک غزل کا یہ مطلع ہے:-

وقت آنست کہ دل واقف اسرار شود
جائی آنست کہ جان طالبِ دیدار شود

شمس العلماء کی قرأت ملاحظہ ہو:-

واقف آنست کہ دل واقف اسرار شود
مرد آنست کہ جان طالبِ دیدار شود

شمس العلماء کی اصلاح نے شعر کا حُسن دو بالا کر دیا ہے۔

(۴) چونکہ شمس العلماء اپنی انتخاب کردہ غزلیات اور قصائد میں سے چار غزلوں اور ایک قصیدے کو مولانا معین الدین کی ملک پاتے ہیں اس لئے شیرانی صاحب کے اعتراض کو "بے شبہ اہم" سمجھتے ہیں لیکن اطمینانِ قلب کے لئے ابھی مزید دقت اور تحقیق کے طالب ہیں اور اسے حق الیقین کے درجے تک پہنچا دینے کے لئے تیار نہیں۔ ہم شمس العلماء سے درخواست کریں گے کہ اگر وہ مولانا معین الدین کی معارج النبوۃ میں نقل کردہ غزلوں کا مقابلہ دیوان معین الدین سے کریں تو پندرہ سولہ کے قریب انھیں ایسی غزلیں ملیں گی جو دونوں میں مشترک ہیں۔

ہمیں شمس العلماء سے یہ شکایت بھی ہے کہ وہ حوالہ تو صرف مجمع الفصحاء کا دیتے ہیں لیکن ذکر کرتے ہیں ایرانی تذکروں کا، اس قسم کا مبالغہ کہاں تک دُرست ہے؟

صفحہ ۸۵۔ کھوکھر اور دَمیک۔

شمس العلماء لفظ کھوکھر کو کھکر بفتح کاف لکھتے ہیں اور دَمیک کو بضم دال، شیرانی صاحب نے تصریح کر کے لکھا کہ اصل لفظ کھوکھر ہے۔ اس کا قدیم تلفظ بہ تخفیف واو تھا۔ ہائے مخلوط فارسی لکھی نہیں جاتی اس لئے ککر بضم اوّل لکھتے ہیں۔ اور شیرانی صاحب نے یہ بھی بتایا کہ دمیک بفتح دال ہے نہ بضم۔

شمس العلماء اپنے جواب میں لین پول کی "تاریخ ہند قرونِ وسطیٰ میں" کا حوالہ دے کر اپنے دعوے پر اصرار کرتے ہیں کہ یہ لفظ ککر بفتح کاف معجمہ ہے نہ بالضم، لہٰذا مبصر کی تحقیق اور اصلاح غیر مستند اور ناقابل قبول ہے۔

تعجب ہے کہ شمس العلماء نے متقدمین کو نظرانداز کر کے لین پول سے کیوں استناد کیا۔ میجر راورٹی نے طبقات ناصری کے انگریزی ترجمہ میں صفحہ ۴۵۸ پر لفظ کھوکھر پر ایک نوٹ لکھا ہے جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ کھوکھر اور گگھر بالکل علیحدہ قومیں ہیں۔ کھوکھر کو بعض اوقات ککھر بھی لکھا جاتا ہے لیکن پہلی

صورت صحیح ترین ہے۔ ابن الاثیر الکامل کی بارھویں جلد کے صفحہ ۹۶ پر "ذکر قتال شہاب الدّین الغوری نبی کوکر" لکھتے ہیں۔ چونکہ عربی میں گ نہیں اس لئے اسے کاف میں تبدیل کر دیا گیا ہے لیکن گجرات کی عربی تاریخ ظفر الوالہ کا مصنّف صاف "عصیان کھوکران" لکھ رہا ہے (جلد دوم صفحہ ۶۸۲)

طبقات ناصری میں کھوکھراں[۱] اور بدایونی[۲] کے یہاں طائفۂ کھوکھران ملتا ہے، یہ دعوے کرنے کے بجائے کہ مؤرخ دییک کو بضم دال بھی لکھتے ہیں۔ شمس العلماء کو چاہیئے تھا کہ کسی ایک مؤرخ کا حوالہ بھی تو دیتے لیکن اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے تو انھیں ایسا بے بنیاد دعویٰ نہیں کرنا چاہیئے۔

صفحہ ۸۶۔ عطارد اور تیر۔

شمس العلماء عطارد کا فارسی مرادف منشی فلک یا دبیر فلک بتاتے ہیں اس پر شیرانی صاحب نے لکھا کہ دبیر فلک یا منشی فلک تو کنا یہ ہے، عطارد کی فارسی تیر ہے۔ شمس العلماء صاحب کی ضد اکثر مضحکہ انگیز ہوتی ہے۔ اپنی بات پر اصرار کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"مصنّف کا بیان صحیح ہے۔ عطارد سے جو مراد ہے یعنی عموماً جو مفہوم لیا جاتا ہے وہ منشی فلک یا دبیر فلک ہے، تیر دراصل عطارد کا فارسی نام ہے جو خارج از بحث ہے۔" حالانکہ جس چیز کو یہاں خارج از بحث کہا جا رہا ہے وہی موضوع بحث ہے لیکن شمس العلماء کو کون سمجھائے۔

صفحہ ۸۷۔ تاج الدین ریزہ:-

شمس العلماء لکھتے ہیں کہ تاج الدّین دہلوی کا دادا غزنویوں کے آخری تاجدار خسرو بن ملک شاہ کے عہد میں ہندوستان آیا تھا اور شاہی فوج میں شامل ہو گیا تھا۔ نوجوان شاعر کا باپ ۵۸۰ھ میں اس خاندان کی آمد کے بہت جلد بعد دہلی میں پیدا ہوا۔ ان کے اسلاف میں سے کوئی شاعر نہ تھا اس نے کئی

---

۱ طبقات ناصری صفحہ ۱۲۳۔ ۲ منتخب التواریخ جلد اوّل صفحہ ۵۲۔

(نظموں) میں التمش کی فتوحات کا ذکر کیا ہے۔ صفحہ ۳۳۸ کے ذیلی نوٹ میں شمس العلماء لکھتے ہیں کہ سیر السالکین کا مصنف اسے "تاج الدین شمس دبیر" کہہ کر پکارتا ہے اور وہ حضرت نظام الدین اولیاء کا اُستاد تھا۔

شمس العلماء کے بیان میں سے شیرانی صاحب کو ان چیزوں پر اعتراض ہے:

(۱) غزنویوں میں کوئی ملک شاہ نہیں گذرا۔ خسرو نام کے اس خاندان میں دو بادشاہ ہیں معزالدولہ خسرو شاہ بن بہرام شاہ، دوسرا تاج الدولہ خسرو ملک۔

(۲) دہلی ۵۸۸ھ میں پرتھی راج کے قبضے میں تھی۔ مسلمانوں کا قبضہ اس پر ۵۸۹ھ میں ہوتا ہے یہ فرض کر کے کہ تاج دبیر کے بزرگ فتح دہلی کے فوراً بعد آئے تو بھی ۵۹۰ھ سے قبل نہیں آسکتے اگر تاج کا باپ ۵۹۱ھ میں پیدا ہوا اور اُس کی عمر کے بیسویں سال یعنی ۶۱۱ھ میں تاج پیدا ہوا اور اس کی عمر کے بیسویں سال یعنی ۶۱۱ھ میں تاج پیدا ہوا تب بھی شاعری میں نام پیدا کرنے اور شمس الدین التمش کا مداح اور دبیر بننے کے لئے بہت کم وقت ملتا ہے۔ ادھر ہم دیکھتے ہیں کہ جب ۶۲۶ھ میں خلیفہ عباسی المستنصر باللہ کا سفیر التمش کے واسطے خلعت لے کر آتا ہے تاج الدین مبارکباد میں اس موقع پر ایک قصیدہ لکھتا ہے۔ ۶۱۱ھ اور ۶۲۶ھ میں صرف پندرہ سال کا فرق ہے۔ چودہ سال کی عمر میں نہ دبیر الملک بن سکتا نہ ایسا پختہ مغز شاعر ہو سکتا کہ التمش کے سامنے قصیدہ خوانی کر سکے۔

(۳) سیر السالکین کے مصنف نے دو مختلف شخصوں کو ایک شخص سمجھ لیا ہے تاج الدین ریزہ اور شمس دبیر دو جُدا گانہ شخص ہیں۔ ان میں آخر الذکر شیخ نظام الدین اولیاء کا اُستاد تھا۔

نمبر ۱ کے بارے میں شمس العلماء تسلیم کرتے ہیں کہ غزنویوں کے آخری تاجدار کا نام خسرو ملک بن خسرو شاہ ہے نہ کہ خسرو بن ملک شاہ البتہ وہ شیرانی صاحب کے بیان میں یہ غلطی نکالنا چاہتے ہیں کہ بہرام شاہ کا نام خسرو نہیں تھا بلکہ یہ اُس

کے لڑکے نام تھا۔ اگر شمس العلماء نے شمارۂ جولائی ۱۹۴۳ء میں شائع شدہ تصحیح ملاحظہ فرمائی ہوتی تو وہ اس تحقیق کی زحمت سے بچ جاتے۔

نمبر ۲ چونکہ شمس العلماء یہ نہیں بتا سکتے کہ تاج الدین دبیر کی تاریخ پیدائش کیا ہے اس لئے وہ بر سبیل تنزّل خلیفہ عبّاسی کے سفیر کی دہلی میں آمد کے وقت تاج الدین کی چودہ سال کی عمر تسلیم کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس میں تعجّب کی کون سی بات ہے۔ ابوالفضل نے چودہ سال کی عمر میں آیۃ الکرسی کی تفسیر لکھی تھی جو اُس نے دربار اکبری میں سُنائی تھی اور خراج تحسین حاصل کیا تھا۔

شمس العلماء کے غلط بیانات کی کوئی کہاں تک تردید کرے، ابوالفضل کی تاریخ پیدائش ۹۵۸ھ ہے اور ۹۸۱ھ میں تقریباً ۲۳ برس کی عمر میں وہ اکبر کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے لیکن شمس العلماء ہیں کہ اسے چودہ سال کی عمر میں دربار اکبری میں شرف باریابی حاصل کرتا دیکھتے ہیں آخر اس درجہ بے احتیاطی کیوں؟

نمبر ۳ کے متعلق شمس العلماء اپنی براءت یوں پیش کرتے ہیں کہ یہ تو امیر السالکین کے مُصنّف کا بیان ہے نہ کہ ان کا اپنا۔ چلئے یوں ہی سہی لیکن سوال یہ ہے کہ شمس العلماء نے بغیر کسی تذبذب کے اس بیان کو نقل کیوں کر دیا جب کہ وہ خود اس کی صحت کے بارے میں مطمئن نہ تھے۔

صفحہ ۹۰۔ شہاب مہمرہ اور عُرفی۔

شہاب مہمرہ کے ذکر میں ایک موقع پر شمس العلماء کہتے ہیں کہ عرفی نے ہندستان آنے پر قصائد میں شہاب کی طرز نگارش اور تخئیلی رُجحان کا تتبع کیا ہے۔

شیرانی صاحب کے لئے شمس العلماء کا یہ بیان موجب حیرت ہے۔ شہاب کا انداز، علمیت، سنگلاخ زمین اور صنعت لزوم مالا یلزم و دیگر صنائع ہیں اس کے علاوہ عرفی کے قصائد سے کہیں اس تتبع کی تصدیق نہیں ہوتی۔

شمس العلماء تکلّف اور کوشش سے شہاب اور عُرفی کے کلام میں مماثلت کی صورتیں پیدا کرتے ہیں لیکن چونکہ وہ خود بھی اس کوشش سے مطمئن نہیں ہیں اس لئے

یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ

"مُصنِّف کا یہ نظریہ اور مشاہدہ ضروری نہیں ہے کہ ہر ایک کو راست آئے"۔

شمس العلماء کا فرض تھا کہ وہ عُرفی کے کلام میں شہاب کی طرف کہیں معمولی سا اشارہ بھی ڈھونڈھ نکالتے بھلا عُرفی جو ابو الفرج رونی، انوری، خاقانی اور ازرقی کو اپنے مقابلے میں کچھ نہیں سمجھتا وہ بچارے شہاب کو کیا خاطر میں لاتا۔

صفحہ ۹۱ و ۹۲۔ عمید سنامی کا قصیدہ حبسیہ۔

شمس العلماء نے عمید سنامی کا قصیدۂ حبسیہ درج کتاب کیا ہے اور اس کا عُنوان فی التوحید، دیا ہے حالانکہ عمید نے یہ قصیدہ بحالت قید لکھا ہے اس میں صریح اشارے ایک بُرج میں قید کئے جانے اور پاؤں میں بیڑیاں پڑنے کے متعلق موجود ہیں چنانچہ :۔

رہ دریں یک برج بی روزن نمودندم ولی
من بہمت رہ برون از ہفت روزن کردہ ام

در گریباں سر فرو برد اژدہائی ہفت سر
تا من ایں مارِ دو سر در زیر دامن کردہ ام

بند بیژن می کنندم عرض در چارہ ستم
نی منیژہ دیدم و نی جرم بیژن کردہ ام

شمس العلماء کی نکتہ آفرینی ملاحظہ ہو کہ "قید خانے میں کوئی قصیدہ لکھے جانے سے اس کی سرخی "حبسیہ قصیدہ" نہیں ہو جاتی"۔ اگر ایک شاعر اپنی قید و بند کا ذکر پورے قصیدے میں کرے اور آخر میں خدا تعالیٰ سے کرم و بخشش اور خلعت امن کی التجا کرے لیکن چوں کہ اس کا مرغِ جان خدا کی توحید کے ترانے گاتا ہے تو کیا اس پورے قصیدے کو نظر انداز کر کے محض اس کے آخر میں دعائیہ الفاظ سے یہ نتیجہ نکالیں گے کہ یہ قصیدہ فی التوحید ہے۔

شمس العلماء کو اس بات پر بھی اصرار ہے کہ "مبصر کے منقول اشعار میں

کسی جگہ بھی "حبسیہ" یا لفظ حبس کا مذکور تک نہیں۔" ہم اس حد تک بدگمان نہیں ہو سکتے کہ شمس العلماء "برج بے روزن" اور "بند بےدر" کے معانی سے ناآشنا ہیں۔ بہر حال اگر ان کی تشفی لفظ حبس سے ہی ہو سکتی ہے تو وہ بھی حاضر ہے۔

همه مانم هر یکی در شغل و من در بند حبس
حاش لله زین سخن تنها گنه من کرده ام
حبس بر من شیون آورده است واز لطف سخن
شور دیدستی که من در عین شیون کرده ام

اس آخری شعر کے بعد قصیدے کے چار شعر اور رہ جاتے ہیں جن میں شاعر خدا کی بارگاہ میں دعا کرتا ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ ڈاکٹر اقبال حسین اپنی کتاب "ہندوستان کے قدیم شعرا" میں اس قصیدے کا عنوان صحیح طور پر "حبسیہ" دیتے ہیں (کتاب مذکور صفحہ ۲۱۲ اور ۲۱۳)، یہاں شمس العلماء پھر تحریف کے مرتکب ہوئے ہیں، شیرانی صاحب کے نقل کردہ شعر:۔ "همه مانم هر یکی در شغل و من در بند حبس" میں "من در بند حبس" کی جگہ شمس العلماء "من در بندگی" بنا کر فرماتے ہیں "لفظ حبس کا مذکور تک نہیں"، تعجب ہے کہ شمس العلماء، جنھیں "الحاج" ہونے پر ناز ہے ایسی علمی خیانت کیسے روا رکھتے ہیں جبکہ خود ان کی کتاب میں "در بند حبس" درج ہے۔ (صفحہ ۳۷۲)

صفحہ ۹۸۔ امیر خسرو اور نستعلیق و شکستہ خط۔

شمس العلماء فرماتے ہیں کہ خسرو کے والد نے مشہور خوش نویس مولانا سعد الدین خطاط کو ان کا اُستاد مقرر کیا جو خسرو کو نستعلیق و شکستہ خطوں کی تعلیم دیتے تھے۔

شمس العلماء کا یہ حیرت انگیز بیان پڑھ کر شیرانی صاحب نے لکھا کہ "سنہ ۷۶۰ھ کے قریب خط نستعلیق و خط شکستہ دُنیا کے پردے پر موجود نہیں تھے امیر خسرو کے عہد میں خط شکستہ کا دعویٰ کرنا تاریخ سے بے خبری کا ثبوت دینا ہے۔" انصاف

اور سچائی کا تقاضا تو یہی تھا کہ شمس العلماء کشادہ پیشانی کے ساتھ اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتے لیکن ایسی سلامت روی کی توقع ان سے کیونکر کی جا سکتی ہے فرماتے ہیں کہ:-

"الفاظ شکستہ و نستعلیق بمعنی اصطلاحی و بلحاظ تاریخ استعمال نہیں کئے گئے ہیں نہ اُن کا یہ مفہوم مُصنّف کے ذہن میں تھا۔ مُصنّف کی مراد اول الذکر سے معمولہ کاروباری رسم الخط ہے جو بے تکلف و قلم برداشتہ لکھا جائے اور مؤخر الذکر سے مُراد عُمدہ اور صاف خط ہے جو قلم روک کر خوش خط لکھا جائے۔"

ایسی کھینچا تانی سے تو یہ کہیں بہتر ہوتا کہ شمس العلماء اپنی ناواقفیت کا اقرار کر کے اس غلطی کی اصلاح فرما لیتے۔

صفحہ ۹۹۔ امیر خسرو اور مثنوی تاج الفتوح یا مفتاح الفتوح۔

امیر خسرو کی تصنیفات کے ضمن میں شمس العلماء نے ایک مثنوی کا نام تاج الفتوح بتایا ہے۔ جو جلال الدّین فیروز شاہ خلجی کے جلوس کے سال میں تصنیف ہوتی ہے۔

شیرانی صاحب نے لکھا کہ اس مثنوی کا نام مفتاح الفتوح ہے اور اسے پروفیسر یسین خاں نیازی نے اورینٹل کالج میگزین لاہور میں شائع کر دیا ہے۔ شمس العلماء بھلا اس مشورے کو کیسے منظور کر سکتے تھے جب کہ خوش قسمتی سے آسی پریس کے کُتُب خانہ میں ایک قلمی نسخہ تاج الفتوح کے نام سے محفوظ ہے اس کے علاوہ مولانا شبلی نے شعر العجم میں اس مثنوی کا نام تاج الفتوح لکھا ہے۔ اس کے بعد بھلا کسی شہادت کی ضرورت ہی نہیں۔

وَ لَیْسَ وراء عبادان قریۃ

اس مثنوی کے آخر میں خود امیر خسرو اس کا نام مفتاح الفتوح لکھتے ہیں ہم خاتمہ میں سے چند شعر یہاں نقل کرتے ہیں تاکہ شمس العلماء کو حق الیقین کا مرتبہ حاصل ہو جائے۔

(صفحہ ۴۴ و ۴۵ میگزین فروری ۱۹۳۷ء)

زدہ فتحش می اندر جام کردم ۔ کہ مفتاح الفتوحش نام کردم
بر آوردم چو فردوسِ برینش ۔ دوم عشر جمادی آخرینش
بتاریخ آنچہ در سلک عدد بود ۔ زہجرت سال بر ششش صد نود بود

شمس العلماء اپنی تحریر کو بہت جلد بھلا کر تناقض میں مبتلا ہو جاتے ہیں ورنہ اس مثنوی کا نام خود انھوں نے اپنی کتاب کے صفحہ ۲۱۸ پر مفتاح الفتوح دیا ہے اب شمس العلماء کے کس بیان کو سچّا سمجھیں۔

صفحہ ۱۰۰۔ خان شہید کے ساتھ تاتاریوں کی جنگ۔

شمس العلماء نے برنی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ خان شہید کی تاتاریوں کے ساتھ لڑائی دیبال پور اور لاہور کے وسط میں ہوئی اور تاتاریوں کے سردار کا نام تیمور خان تاتار ہے۔

شیرانی صاحب فرماتے ہیں کہ امیر خسرو اور خواجہ حسن دونوں جو اس جنگ میں موجود تھے صاف بیان دیتے ہیں کہ یہ جنگ دریائے لاہور پر ہوئی ہے نیز تاتاریوں کے سردار کا نام تیمور نہیں بلکہ ایتمر ہے برنی نے یہ نام بہ تخفیف یا اتر قلمبند کیا ہے۔

"درمیان لوہور و دیوبال پور یا اتر ملعون.... محاربہ و مقاتلہ افتاد"۔

شمس العلماء اپنی صفائی میں دوبارہ برنی کا حوالہ دیتے ہیں حالانکہ یہی حوالہ معرضِ بحث میں ہے۔ چونکہ ایتمر کے نام کے سلسلہ میں شیرانی صاحب نے برنی کی عبارت نقل کی ہے شمس العلماء فوراً اُچھل پڑے اور فرمایا کہ یہ مبصر کا سہوِ قلم یا سہوِ نظر ہے کہ اُنھوں نے بھی برنی کا وہ اقتباس نقل کیا ہے جس میں لاہور اور دیبال پور کے درمیان جنگ کا واقع ہونا مذکور ہے۔ حالانکہ ایک معمولی فہم کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ یہ اقتباس ایتمر کے سلسلے میں نقل کیا گیا ہے نہ کہ جنگ کا محلِ وقوع متعین کرنے کے لئے۔

شمس العلماء بیجا طور پر مغلوں کے سردار کا نام تیمور بتاتے ہیں۔ اور انھیں شیرانی صاحب کی اصلاح سے اتفاق نہیں چنانچہ فرماتے ہیں کہ:-

مبصرؔ کا برنی کی منقول عبارت میں "بائمر کو بہ اتمر" یعنی الف کو متحرک پڑھنا بلا سند ہے، البتہ اگر مبصرؔ بھی کوئی خارجی شہادت مصنّف کی طرح پیش کرتے تو ان کا عُذر قابل تسلیم ہوتا کیونکہ صرف برنی کی عبارت جس میں الف متحرّک اور ساکن دونوں طرح سے پڑھا جا سکتا ہے ان کے حق میں فیصلہ کُن نہیں ہے۔

شمس العلماء فرشتہ کا حوالہ دے کر جس میں غالباً طباعت کی غلطی ہے اپنی فتح مندی کا ڈنکا بجاتے ہیں اور اپنے قارئین کو اس مغالطہ میں اُلجھانا چاہتے ہیں کہ شیرانی صاحب نے صرف برنی کی شہادت پیش کی ہے جو بہر حال شک و شُبہ سے خالی نہیں۔ شمس العلماء ہمیں معاف فرمائیں اگر ہم یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں کہ وہ یہاں علمی دیانت سے کام نہیں لے رہے بلکہ صریح غلط بیانی کے مرتکب ہیں۔ شمس العلماء نے اپنی کتاب میں حسن دہلوی کا مرثیہ منثور بتمام و کمال نقل کیا ہے اور شیرانی صاحب نے اس مرثیہ کی اصل عبارت نقل کر دی جس میں مغل سردار کا نام صراحت کے ساتھ ائیمر لکھا ہوا موجود ہے لیکن شمس العلماء اُسے نظر انداز کر گئے۔ ان کے پندار کی شکست کی خاطر ہم وہی عبارت دوبارہ نقل کرنے کی اجازت چاہتے ہیں۔

برائے مشکل کشائی عرض داشتند کہ ائیمر با تمامی لشکر بہ سہ فرسنگی فرود آمدہ است (اصل کتاب صفحہ ۳۰۴)، بدایونی کی منتخب التواریخ میں ائیمر ہی درج ہے۔ (جلد اوّل صفحہ ۱۳۱)

اب شمس العلماء فرمائیں کہ اس واضح خارجی شہادت کے ہوتے ہوئے ان کا "کاکل سرکش سبزۂ خط سے دبا ہے یا نہیں اور یہ زمرّد ان کے دم افعی کا حریف ہے یا نہیں۔

صفحہ ۱۰۱۔ امیر خسرو اور ان کا مربّی ملک امیر علی خان جہاں۔ شمس العلماء لکھتے ہیں کہ خان شہید کی وفات کے بعد امیر خسرو کچھ سال تک ملک امیر علی

کے پاس رہے جو غیاث الدین بلبن کا درباری امیر تھا وہ عام طور پر حاتم خان کے نام سے یاد کیا جاتا تھا کیونکہ شعراء کے حق میں حاتم کی طرح فیاض تھا۔ خسرو نے اس کی مدح میں متعدد قصیدے لکھے اور ایک منظوم اسپ نامہ بھی اس کے واسطے تالیف کیا۔

شیرانی صاحب کو شمس العلماء کا یہ بیان بوجوہ ذیل تسلیم نہیں۔

(۱) خان شہید جمعہ کے روز غروب آفتاب کے وقت ۶۸۳ھ ہجری کے ذی الحجہ کی آخری تاریخ کو شہادت پاتا ہے اور خسرو گرفتار ہو کر دو سال بلخ میں گزارتے ہیں جیسا کہ مشہور ہے۔ یہ مدت ہمیں ۶۸۶ ہجری تک پہنچا دیتی ہے جو معز الدین کیقباد کی تخت نشینی کا سال ہے۔ کیقباد انہیں بلاتا ہے مگر ملک اختیار الدین (نظام الدین) وزیر کے ساتھ اچھے تعلقات نہ ہونے کی وجہ سے خسرو دربار میں نہیں جاتے اور خان جہان کے ساتھ اودھ چلے جاتے ہیں جو اس صوبے کا والی تھا۔ تعجب یہ ہے کہ خسرو اسی خان جہان کو حاتم کا خطاب دیتے ہیں دو سال اس کے ساتھ گزارتے ہیں۔ اس وقت تک ۶۸۸ھ ہجری شروع ہو گیا ہے یا ہونے والا ہے۔ اسی سال ربیع الاول کی کسی تاریخ سے وہ قران السعدین کی تصنیف پر بحکم کیقباد مصروف ہیں۔ اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ خسرو کو اس ملک کے پاس کچھ سال گذارنے کا موقع نہیں ملتا۔

(۲) ملک امیر علی کا نام بھی زمانۂ حالی کا سا ہے۔

(۳) شمس العلماء نے خسرو کی قید کا زمانہ محسوب نہیں کیا۔

شمس العلماء نے شیرانی صاحب کے دوسرے اعتراضات سے قطع نظر کر کے اپنا تمام زور بیان نمبر ۲ پر صرف کر دیا ہے۔ شیرانی صاحب نے بجا طور پر شک ظاہر کیا تھا کہ ملک امیر علی کا نام زمانۂ حال کا سا ہے۔ شمس العلماء نے اپنے بیان کی صداقت ثابت کرنے کیلئے برنی صاحب کا حسب ذیل بیان پیش کیا ہے۔

"چهارم ملکی از نوادر ملوک در عصر سلطان بلبن ملک امیر علی سرجاندار مولازادۂ سلطان بلبن بود و اورا از بسیاری بخشش حاتم خان گفتندی و مدائحِ او در دیوان امیر خسرو بسیار است و امیر خسرو چاکر او بود و اسپ نامہ بنام او گفتہ است"

شمس العلماء کے نزدیک یہ بیان "شیرانی صاحب کے تمام شکوک اور اعتراضات کا مسکت جواب ہے اور اس سے ظاہر ہے کہ وہ ان تاریخی واقعات سے نابلد ہیں اور ملک امیر علی کے نام کے متعلق ان کے تبصرے کی حقیقت کھُل جاتی ہے جس سے ان کا علم اللسان سے نابلد ہونا بھی پوری طرح منکشف ہو جاتا ہے"۔

شمس العلماء اس جواب کو مسکت کہہ کر اپنا دل خوش کر سکتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ شمس العلماء خود بھی تسلیم کرتے کہ امیر خسرو بلخ میں مغلوں کی قید میں تقریباً دو سال گزارتے ہیں (اس لئے یہ دو سال کی مدت ہمیں ۶۸۶ھ ہجری تک پہنچا دیتی ہے، جو معز الدین کیقباد کی تخت نشینی کا سال ہے جیساکہ شمس العلماء اپنی کتاب کے صفحہ ۱۴۴ اور ۱۴۵ پر رقمطراز ہیں امیر خسرو وزیر ملک نظام الدین سے اختلاف کے باعث خان جہان کے پاس چلے جاتے ہیں جو بادشاہ کی طرف سے اودھ کا عامل تھا اور وہاں دو سال امن میں گذارنے کے بعد دہلی لوٹتے ہیں اب شمس العلماء فرماتے ہیں کہ انھوں نے قید کا یہ زمانہ کیوں نظر انداز کر دیا ہے جیساکہ ہم ابھی عرض کریں گے۔ شمس العلماء قبلہ خود اُلجھن کا شکار ہو کر امیر علی اور خان جہان کو دو الگ شخصیتیں مان رہے ہیں۔

چونکہ برنی کے بیان میں شمس العلماء نے ملک امیر علی لکھا ہوا پایا فرطِ مسرت سے اُچھل پڑے اور شیرانی صاحب کی علم اللسان سے ناواقفیت کا اعلان کر دیا اگر وہ ذرا غور و فکر سے کام لیتے جس کے وہ عادی نہیں ہیں تو انھیں معلوم

۵ے شمس العلماء کی کتاب صفحہ ۱۰۰۔

ہوتا کہ وہ علم اللسان سے اپنی ناواقفیت کا اظہار کر رہے ہیں نہ کہ شیرانی صاحب کی۔ شیرانی صاحب کا یہ بیان بالکل درست ہے کہ اس ملک کا نام ملک امیر علی نہیں ہو سکتا۔ ملک اور امیر اس کے خطابات ہیں اور اس کا حقیقی نام علی ہے غرۃ الکمال میں امیر خسرو کا ایک منظوم خط ملتا ہے جو اُنھوں نے تاج الدین زاہد کے نام لکھا ہے جس میں اختیار الدین حاتم خان علی بن ایبک عامل اودھ کی عنایات کا ذکر کرنے کے بعد عزیزوں اور دوستوں کے فراق کے درد کا اظہار کیا ہے۔ ان ہی درد انگیز جذبات کا اظہار امیر خسرو اس خط میں کرتے ہیں۔ جو اُنھوں نے اودھ سے اپنے دوست شاعر نجم الدین حسن کو لکھا (رسالہ خامسہ اعجاز خسروی) اس میں بھی وہ اس امیر کا نام اختیار الحق والدین......علی ایبک سلطانی دیتے ہیں۔ شمس العلماء نے اپنی کتاب کے صفحہ ۱۴۸ پر اسپ نامہ کے تین اشعار نقل کئے ہیں ان میں بھی اس ملک کا نام صاف طور پر علی دیا گیا ہے۔

شاہ عہد اختیار دولت و دین آفتاب شرف بخانۂ دین
ہم علی نام و ہم بشیر دلی شیر دلدل سوار ہم چو علی

کیا یہ شواہد شمس العلماء کے اطمینانِ قلب کیلئے کافی ہیں یا نہیں؟

اس سلسلہ میں ہم شمس العلماء کی یہ اُلجھن بھی دُور کر دینا چاہتے ہیں کہ امیر علی سر جاندار اور خان جہاں عامل اودھ دو جُدا جُدا شخصیتیں تھیں۔ خان شہید کی شہادت کے بعد امیر خسرو کو مغل گرفتار کر کے لے جاتے ہیں، لیکن بلخ میں ان کا بحالت قید دو سال گذارنا صحیح نہیں۔ ڈاکٹر وحید مرزا نے خود خسرو کے بیان کی

لے ڈاکٹر وحید مرزا کی امیر خسرو صفحہ ۲۰۷ ۲ے قرآن السعدین، دیباچہ۔ صفحہ ۱۲ ۳ے شمس العلماء اپنی کتاب کے صفحہ ۱۴۸ پر ملک امیر علی سر جاندار الملقب بہ حاتم خان کا ذکر کرتے ہیں اور صفحہ ۱۵۱ پر خان جہان حاکم اودھ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ گویا امیر علی سر جاندار اور خان جہان دو الگ شخص ہیں۔

رُو سے ثابت کیا ہے کہ گرفتاری کے فوراً بعد امیر نجات حاصل کر لیتے ہیں اور دہلی پہنچتے ہیں۔ اسّی سالہ بادشاہ بلبن اپنے قابل بیٹے کی وفات کا صدمہ برداشت نہ کر سکا اور راہی ملک بقا ہوا چونکہ اس کے جانشین کیقباد کے وزیر نظام الدّین سے خسرو کے تعلقات اچھے نہ تھے اس لئے وہ نوجوان کیقباد کی دعوت کو قبول نہیں کرتے اور امیر علی سرجاندار المعروف بہ حاتم خاں کی پناہ میں چلے جاتے ہیں جب بغرا خان نے اپنے پایۂ تخت لکھنوتی میں بیٹھ کر کیقباد کی عیّاشی اور ملک نظام الدّین کے مظالم کی داستان سُنی تو وہ اپنے بیٹے کی سرکوبی کیلئے روانہ ہوا ادھر کیقباد نے بھی باپ سے مقابلہ کرنے کی پوری تیّاریاں کر لیں۔ باپ بیٹا دونوں اودھ میں ایک دوسرے کے مقابل پہنچ گئے لیکن آخر دونوں میں صُلح صفائی ہو گئی۔ بغرا خان واپس لکھنوتی چلا گیا اور کیقباد دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ روانگی کے وقت کیقباد امیر علی سرجاندار کو اودھ کا عامل مقرر کرتا ہے اور چونکہ امیر خسرو پہلے سے اس امیر کی ملازمت میں تھے انہیں اپنی مرضی کے خلاف اودھ میں کچھ مدّت کے لئے اور رکنا پڑا جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں :۔

با علم فتح دران راہ دُور	سایہ فشان شد بحد کنت پور
خان جہاں حاتم مفلس نواز	گشت باقطاع اودھ سرفراز
من کہ بدم چاکر او پیش ازان	کرد کرم زانچہ کہ بد بیش ازان

(قرآن السعدین مطبوعہ علی گڑھ صفحہ ۲۲۱)

یہ حقیقت کہ یہ "خان جہان حاتم مفلس نواز" امیر علی سرجاندار تھا۔ اس منظوم خط سے واضح ہو جاتی ہے جو امیر خسرو نے تاج الدّین زاہد کے نام لکھا۔ اس خط میں بھی جو انھوں نے نجم الدّین حسن کے نام لکھا اور جس کے آغاز میں ہی وہ اختیار الحق والدین ...... علی ایبک سلطانی کی توجہات کا ذکر

---

۵۱ وحید میرزا۔ صفحہ ۶۲۔

کرتے ہیں وہ اس امیر کے عامل اودھ ہو جانے کا تذکرہ ذیل کے الفاظ میں کرتے ہیں۔

"ہم در اثنای راہ مخدوم بندہ بمنزلت اقطاع اودھ شرف دست بوسی یافت۔ بندہ کہ چوں عطارد در شعاع آن آفتاب است نتوانست کہ بخانۂ خویش راجع شود۔ ضرورت بہ استقامت آں طرف رضا داد ......" (دیباچہ قرآن السعدین صفحہ ۱۸)

کیقباد کی وفات کے بعد جب جلال الدّین فیروز شاہ خلجی سریر آرائی سلطنت ہوتا ہے تو کشلی خان المعروف بہ ملک چھجو علم بغاوت بلند کر دیتا ہے۔ اس کے حامیوں میں سے ایک امیر علی سرجاندار عامل اودھ بھی ہوتا ہے برنی کے یہ الفاظ اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں۔

"در دویم سال جلوس ملک چھجو برادر زادۂ سلطان بلبن در کڑہ چتر برگرفت و خطبہ بنام خود خوانانید و امیر علی سرجاندار مولازادہ سلطان بلبن کہ اورا حاتم خان می گفتندی و اقطاع اودھ داشت یار او شُد" (تاریخ فیروز شاہی ص۱۸)

مُندرجہ بالا بیان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ امیر علی سرجاندار اور خان جہان دو الگ شخصیتیں نہیں ہیں۔

صفحہ ۱۰۳- کیا خزائن الفتوح نثر کی کتاب ہے یا مثنوی ہے؟ شمس العلماء نے لکھا ہے کہ جلال الدّین خلجی کی وفات کے بعد امیر خسرو علاؤ الدّین کی ملازمت میں آگئے۔ اُنھوں نے اس کی تعریف میں کئی قصیدے لکھے اور ایک مثنوی جس کا نام خزائن الفتوح ہے۔

شیرانی صاحب نے خزائن الفتوح کے متعلق بتایا کہ وہ مثنوی نہیں ہے بلکہ نثر کی کتاب ہے۔ علی گڑھ یونی ورسٹی کے پروفیسر محمد حبیب اس کا فارسی متن اور انگریزی ترجمہ شائع کر چکے ہیں۔

شمس العلماء اپنی غلطی کا اس دلچسپ طریقہ سے اعتراف کرتے ہیں اکہ

وہ بھی نیم دلی کے ساتھ۔

"محققین یورپ نے اس خاص قسم کی نثر کو "نثر منظوم" لکھا ہے جس پر نہ خالص نظم کا اطلاق ہوتا ہے نہ نثر کا۔ اسی نظریئے کے مطابق غلط نامے میں اس کی اصلاح ہو چکی ہے۔"

اس فاضلانہ نکتہ آفرینی کی داد تو اہلِ علم ہی دے سکتے ہیں۔ ہم نیازمند صرف اتنا دریافت کرنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ مشرق و مغرب کا وہ کون سا محقق ہے جو ایک نثر کی کتاب کو مثنوی قرار دے گا۔ شاید شمس العلماء ہی وہ فاضل یگانہ ہیں جنھیں اس قسم کی تحقیقات پر ناز ہو سکتا ہے۔

صفحہ ۱۰۵۔ خواجہ حسن دہلوی سنجری ہیں یا سجزی۔ شمس العلماء نے خواجہ حسن دہلوی کو سنجری لکھا تھا جس پر شیرانی صاحب نے اُنھیں ٹوکا اور بتایا کہ یہ سجزی ہے اور سنجری جاہل کاتبوں کی بدولت مشہور ہو گیا ہے۔

لُطف یہ ہے کہ کُلّیاتِ حسن دہلوی کے مُرتّب مولانا محوی نے بھی سجزی کو ہی دُرست قرار دیا ہے۔ لیکن شمس العلماء نے اپنی کتاب میں ان کی تغلیط کی ہے۔ اس سے زیادہ پُرلطف مجموعۂ تذکار کی وہ عبارت ہے جس کی بناء پر شمس العلماء اصرار کرتے ہیں کہ سنجری کی نسبت ہی صحیح ہے حالانکہ وہ اس عبارت کا صحیح مفہوم سمجھ نہیں سکے۔ یہ عبارت نہایت سادہ اور واضح ہے اور اس سے ہر شخص وہی مُراد لے گا جو شیرانی صاحب لے چکے ہیں، ذیل کی عبارت:۔

"گویند لقب وی امیر از قدیم است کہ اجدادش در عہد سلطان سنجر سلجوقی ازین نسبت ممتاز بودہ اند۔"

نقل کرنے کے بعد شمس العلماء فرماتے ہیں کہ:۔

اس بیان سے حُسن کا خاندانی تعلق سلطان سنجر کے دربار سے پوری طرح ظاہر ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے اسی خاندانی اعزاز کو برقرار رکھنے کیلئے امتیازی نسبت اپنے نام کے ساتھ لگا کر اپنے کو سنجری لکھا۔ یہ اکیلی ایک ایسی

محکم دلیل ہے جس کے سامنے مبصر کی تمام عبارت آرائی فضول ہے۔"
ایک معمولی سمجھ رکھنے والا شخص بھی جان سکتا ہے کہ یہاں حسن کے لقب امیر کی طرف اشارہ ہے نہ کہ سنجری کی طرف، کیا شمس العلماء واقعی اتنی سادہ بات سمجھنے سے بھی قاصر ہیں یا مناظرہ کے میدان میں محض اپنے حریف کو شکست دینے کیلئے ہر قسم کے حربے کو روا رکھتے ہیں؟

تحریف اور غلط بیانی کی بعض مثالیں

صفحہ ۷، شمس العلماء کی کتاب کا دوسرا باب "غزنویوں سے قبل کا زمانہ" ہے شیرانی صاحب نے اپنے تبصرے میں لکھا کہ "اصل موضوع کا خیال کرتے ہوئے یہ باب بھی اتنا ہی بے محل اور بے موقع معلوم ہوتا ہے جتنا پہلا باب اس کے علاوہ براؤن اور لیوی نیز دیگر مغربی مصنفین یہی زمین بار بار طے کر چکے ہیں۔"

شیرانی صاحب یہاں صاف طور پر غزنویوں سے قبل کے زمانہ کی طرف اشارہ کر رہے ہیں لیکن شمس العلماء کی زبردستی ملاحظہ ہو کہ وہ اس سے ہندوستان میں فارسی ادب کی تاریخ مراد لیتے ہیں۔ اور حیرت انگیز غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"نیز مبصر کا یہ ادعا کہ برون اور دیگر مغربی مصنفین بھی یہی زمین بار بار طے کر چکے ہیں کوئی اصلیت نہیں رکھتا۔ نہ براؤن نے یہ زمین طے کی ہے نہ دیگر مغربی مصنفین نے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کس قسم کا تبصرہ ہے جس میں صحیح تنقید کے بجائے تنقیص کی فکر اور دھن غالب ہے جس کے زیر اثر خیالی برون تراشے گئے ہیں۔ برون کے حسب فرمائش تو مصنف نے کیمبرج یونی ورسٹی میں رہ کر "ہندوستان میں فارسی زبان و ادب بعہد مغل" پر مقالے لکھے تھے۔ اور عہد قبل مغل کو ایک بہت وسیع اور اہم مضمون سمجھ کر اور بنا بریں اپنے محدود وقت اور ذرائع سے باہر پاکر آئندہ کے لئے اٹھا رکھا تھا۔"

شمس العلماء کا یہ بیان پڑھ کر ہر شخص حیران رہ جائے گا۔ شیرانی صاحب تو ذکر کر رہے ہیں غزنویوں سے قبل کے زمانے کا اور شمس العلماء صریح غلط بیانی سے کام لے کر ہندوستان میں فارسی زبان اور ادب کی داستان سُنا رہے ہیں۔

صفحہ ۱۶۔ سبکتگین کی جے پال سے جنگ:۔ شیرانی صاحب نے اپنے تبصرے میں لکھا کہ سبکتگین کی جے پال کے ساتھ صرف دو مرتبہ جنگ ہوئی۔ شمس العلماء جے پال کی جگہ ہندو لکھ کر تحریف اور غلط بیانی کے مرتکب ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ "مبصر کا عدد شمار بھی کہ جنگیں صرف دو ہوئیں غلط ہے۔ فرشتہ نے بروایت حمد اللہ مستوفی لکھا ہے کہ سبکتگین نے جبکہ وہ الپتگین کے عہد میں اس کی افواج کا کماندان اعلیٰ تھا پندرہ برس تک ہندوؤں کے ساتھ متعدد جنگیں کیں اور کامیاب رہا۔

شیرانی صاحب کا بیان تو محض اس قدر ہے کہ سبکتگین کی جے پال کے ساتھ دو مرتبہ جنگ ہوئی۔ شمس العلماء اصل مسئلہ سے اعراض کر کے فرشتہ کا ایک غلط بیان پیش کرتے ہیں، اُنہیں چاہیئے تھا کہ وہ یہ ثابت کرتے کہ سبکتگین کی جے پال کے ساتھ دو سے زیادہ جنگیں ہوئیں، چونکہ وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے اس لئے جے پال کے بجائے ہندو کا لفظ داخل کر دیا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فرشتہ حمد اللہ مستوفی کا حوالہ دیتا ہے لیکن یہ حوالہ دُرست نہیں۔ حمد اللہ کی تاریخ گزیدہ چھپ چکی ہے اس میں الپتگین کے لئے صرف یہ لکھا ہوا ہے کہ "با ہندوان غزا کردی" اور ان الفاظ کے بعد اس کے کماندان اعلیٰ سبکتگین کی زیر قیادت ان جنگوں کا ہونا مذکور نہیں۔ ممکن ہے کہ شمس العلماء یہ کہیں کہ فرشتہ کے پاس تاریخ گزیدہ کا کوئی اور مخطوطہ ہوگا جہاں سے اُس نے اپنی تاریخ میں وہ الفاظ نقل کئے ہیں، اس شبہ کی درستی کو ایک لمحہ کے لئے تسلیم کرتے ہوئے ہم ایک دوسرے پہلو سے اس پر نظر ڈالنا

ل تاریخ گزیدہ صفحہ ۳۹۳

چاہتے ہیں۔ کیا یہ تاریخی واقعہ ہے کہ سبکتگین الپتگین کے پاس پندرہ برس رہا؟ اگر شمس العلماء نے اس مسئلہ پر غور کیا ہوتا تو وہ فرشتہ کا ایک غلط بیان بغیر سوچے سمجھے درست نہ مان لیتے، سبکتگین کو الپتگین کے پاس آئے ابھی بمشکل چار پانچ سال بھی نہیں ہوئے کہ الپتگین [۵۱] اُس دُنیا سے چل دیتا ہے۔ ۳۴۸ھ میں الپتگین سبکتگین کو خرید [۵۲] کرتا ہے اور ۳۵۲ھ میں خود وفات پا جاتا ہے۔

فرشتہ کی عبارت کے ترجمے میں بھی شمس العلماء سے ایک غلطی سرزد ہوئی ہے، اس کی اصل عبارت یہ ہے۔

"الپتگین بروایت حمد اللہ مستوفی پانزدہ سال ایام بدولت واقبال گذرانید و دریں مدت چندیں کرت سپہ سالاروی سبکتگین یا ہندوان غزوات کردہ قرین فتح و نصرت گردید۔"

شمس العلماء مندرجہ بالا عبارت کا یہ مفہوم بتاتے ہیں:۔

"فرشتہ نے بروایت حمد اللہ مستوفی لکھا ہے کہ سبکتگین نے جبکہ وہ الپتگین کے عہد میں اس کی افواج کا کماندان اعلیٰ تھا۔ پندرہ برس تک ہندوؤں کے ساتھ متعدد جنگیں کیں اور کامیاب رہا۔"

حالانکہ فرشتہ پندرہ برس کی مدت کے اندر لکھ رہا ہے نہ کہ پندرہ برس تک جیساکہ شمس العلماء سمجھ رہے ہیں۔

صفحہ ۲۹۔ تاریخ سیستان کا سنہ تالیف:۔ شمس العلماء نے ۴۴۸ھ کے قریب لکھا ہے۔ شیرانی صاحب نے اس کی تصحیح و توضیح کرتے ہوئے لکھا کہ "تاریخ سیستان کی تالیف ۴۴۸ھ ہجری میں نہیں بلکہ ۴۴۸ھ ہجری میں شروع ہوتی ہے۔" شمس العلماء "شروع" کا لفظ اپنے جواب میں غائب کر جاتے ہیں اور بڑی معصومیت کے ساتھ لکھتے ہیں کہ "۴۴۸ھ میں اس کے تالیف ہونے کا فیصلہ خود تاریخ سیستان کے مصحح ملک الشعراء بہار اپنے مقدمہ میں کر چکے ہیں۔"

---

۵۱ ڈاکٹر ناظم کی کتاب "محمود آف غزنہ" صفحہ ۲۶ ۵۲ ایضاً صفحہ ۲۸

صفحہ ۵۴۔ مسعود سعد سلمان کی تعریف میں حکیم سنائی کے اس شعر کے دوسرے مصرع کا ترجمہ شمس العلماء کے یہاں اس طرح ہے :۔

چون علو و صحیح و لوع جہان بشعر تو دید
عقل او گرد طبع جولان کرد

His wisdom swiftly went round his disposition (desire)

اس پر شیرانی صاحب نے لکھا کہ " ہمارے خیال میں شاعر کا مقصد ہے کہ اس کی عقل نے اس کی اشاعت کا اقدام کرنا چاہا"۔

شمس العلماء تحریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ..... ظاہر ہوتا ہے کہ طباعت و اشاعت کا مفہوم عہد غزنوی میں موجود تھا۔ حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ اس وقت طباعت کا مفہوم کتم عدم میں تھا۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ طباعت کا لفظ شمس العلماء کا اضافہ ہے۔ طباعت کا مفہوم عہد غزنوی میں یقیناً کتم عدم میں تھا۔ لیکن اشاعت کا کام خطاطوں کے ذریعہ برابر جاری تھا۔ غالباً شمس العلماء اشاعت کے اصلی مفہوم سے ناآشنا ہیں یا پھر وہی مناظرانہ حربہ کا استعمال ہے۔

صفحہ ۷۹۔ خواجہ معین الدین اجمیری کی طرف منسوب کلام۔ شمس العلماء کی کتاب میں یہ شعر اس طرح درج ہوا ہے:۔

بیا دہر دو جہان را بہ ششدر اندرنہ
دریں قمار بیک داد ہر چہ ہست ترا

شیرانی صاحب نے بتایا کہ دوسرے مصرع میں داد کی جگہ " داو " چاہیئے۔ شمس العلماء یہاں غلط بیانی سے کام لے کر لکھتے ہیں کہ مبصر بیک داؤ " کے اصطلاحی مفہوم کو نہیں سمجھے اس لئے غلط اصلاح دے بیٹھے کہ داؤ کی جگہ " دار " ہونا چاہیئے۔

کیا غلط بیانی کی اس سے بدتر مثال مل سکتی ہے، سچ ہے۔

چہ دلاور است دزدی کہ بکف چراغ دارد

اس شعر کا ترجمہ شمس العلماء اس طرح کرتے ہیں:-

Come and put both the worlds with in the six gates in this gamble stake the whole of enistenee.

یہ ترجمہ جس قدر غلط ہے اس کا اندازہ ناظرین خود لگا سکتے ہیں۔ شیرانی صاحب کے اعتراض کے بعد شمس العلماء یہ مطلب پیش کرتے ہیں جو تقریباً صحیح ہے "اے مخاطب تو دونوں جہاں کو ایک ہی داؤ میں جیت لے"

شمس العلماء اپنی غلطی پر اصرار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ انھوں نے ششدر بمعنی مجازی (عجز و حیرانی) نہیں لیا ہے بلکہ ششدر (بمعنی لغوی (چھ دروازے) لیا ہے جو صوفیا کی اصطلاح میں بمعنی چھ حواس ہے۔

کوئی حضرت سے پوچھے کہ یہاں تو قمار بازی اور دونوں جہاں جیت لینے کا ذکر ہے پھر یہ صوفیائے کرام کی "چھ حواس" والی اصطلاح کہاں سے آنازل ہوئی لیکن شمس العلماء بھی کیا کریں۔ غلطی پر اصرار کرنے کا نتیجہ یہی ہوا کرتا ہے۔

صفحہ ۱۰۴۔ امیر خسرو کے دیوان غرۃ الکمال کا پندرہ روز میں تصنیف ہونا۔

اپنی کتاب کے صفحہ ۳۸۸ اور پھر صفحہ ۹۱۸ پر شمس العلماء نے یہ بیان کیا ہے کہ امیر خسرو نے مطلع الانوار کی طرح اپنے دیوان غرۃ الکمال کو جو مجموعۂ قصائد و غزلیات ہے صرف پندرہ روز میں تیار کیا تھا۔

شیرانی صاحب نے اس بیان کو ناقابلِ قبول بتاتے ہوئے لکھا کہ "غرۃ الکمال ایک ضخیم چیز ہے اور اس کے صفحات پانسو سات سو کے قریب ہوں گے، کاتب پندرہ روز میں تو اس کی کتابت بھی نہیں کر سکتا لہٰذا یہ کہنا کہ غرۃ الکمال امیر نے پندرہ روز میں تیار کر لیا ہمارے اعتقاد کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا ہے"۔

تعجّب ہے کہ شمس العلماء کی علمی دیانت نے انھیں کس طرح اس بات کی اجازت دی کہ شیرانی صاحب کے اس سادہ بیان میں جسے ایک عامی بھی سمجھ سکتا ہے تحریف اور غلط بیانی کو روا رکھیں، اوپر والی عبارت میں شیرانی صاحب محض غرۃ الکمال کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ دیوان پندرہ روز میں تیار نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ خود امیر خسرو[۵۱] اس کے دیباچہ میں صراحت کے ساتھ لکھتے ہیں کہ مجموعہ میں وہ تمام کلام شامل ہے جو انھوں نے ۳۴ برس سے لے کر ۴۳ برس کی عمر تک یعنی ۶۸۵ھ سے لے کر ۶۹۳ھ تک کہا ہے لیکن بعد میں اور کلام بھی اس میں شامل کر لیا گیا۔ اب اس صریح بیان کی موجودگی میں شمس العلماء کے ارشاد کی کوئی حقیقت نہیں رہتی لیکن شمس العلماء جو فن مناظرہ کے امام ہیں نہایت خوبی کے ساتھ مطلع الانوار کا ذکر چھیڑ دیتے ہیں اور پورا زور اس بات کے ثابت کرنے پر صرف کر دیتے ہیں کہ مطلع الانوار پندرہ دن میں لکھی گئی۔ ہم صرف اتنا دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ اس سے شیرانی صاحب نے کب انکار کیا ان کا اعتراض تو غرۃ الکمال کے متعلق شمس العلماء کے بیان پر تھا، اگر شمس العلماء چاہتے تھے کہ کھوٹا کھرا سامنے آجائے" تو انہیں چاہیئے تھا کہ وہ غرۃ الکمال کا پندرہ روز میں تصنیف ہونا ثابت کرتے اور اگر وہ اس پر قادر نہ تھے تو ان کیلئے اپنے قارئین کو یوں غلط فہمی میں بتلا کرنا زیبا نہ تھا۔

صفحہ ۱۰۶۔ امیر خسرو، خواجہ حسن اور ضیا برنی کے باہمی تعلقات:۔

شمس العلماء فرماتے ہیں کہ ضیا برنی کے تعلقات امیر خسرو اور خواجہ حسن کے ساتھ نہایت دوستانہ تھے اور آخر تک پائدار رہے بلکہ یہ برنی ہے جو دونوں بزرگوں میں دوستی کا باعث بنا۔

اگرچہ شمس العلماء کا یہ بیان بڑی حد تک برنی کے اپنے بیان پر مبنی ہے شیرانی صاحب کے خیال میں بوجوہ ذیل محل نظر ہے:۔

---

[۵۱] وحید مرزا کی امیر خسرو، صفحہ ۱۵۹۔

(۱) برنی کے ساتھ خسرو اور حسن کے روابط ان کی عمروں کا فرق دیکھتے ہوئے اتنے گہرے نہیں ہو سکتے، جب برنی پیدا ہوتا ہے دونوں بزرگ بتیس تینتیس سال اپنی عُمر گذار چکے ہیں۔

(۲) برنی کا یہ بیان بھی مشتبہ ہے کہ وہ ان دونوں بزرگوں میں دوستی کا باعث بنا ہے، کیا یہ بلند پایہ شاعر جس کی عُمر کا اکثر حِصّہ دہلی میں بسر ہوتا ہے۔ جہاں انہیں سینکڑوں مواقع ملنے جلنے کے میسّر ہو سکتے تھے اور دونوں خان شہید کی خِدمت میں برسوں ملازم بھی رہے برنی کے زمانے تک ایک دوسرے سے ناواقف رہے۔

اگرچہ برنی کا بیان شیرانی صاحب کے سامنے نہ تھا تاہم اس کا مطلب جو وہ سمجھے درست تھا۔ یعنی برنی کے ذریعہ سے اُن میں یگانگت یا رشتہ داری کا سلسلہ قائم ہوا ہے ورنہ ان بزرگوں کے سامنے برنی کی حیثیت خورد اور شاگرد کی سی ہو سکتی ہے۔

اپنے جواب میں یہاں پھر شمس العلماء شیرانی صاحب کی عبارت میں ایک ناروا تصرف روا رکھتے ہیں جو ایک عالم کے لئے کسی صورت میں بھی زیبا نہیں اور وہ یہ کہ "برنی کے ذریعے سے ان میں یگانگت یا رشتہ داری کا سلسلہ قائم ہوا ہے"، کو "یگانگت یا رشتہ داری کا سلسلہ قائم نہیں ہوا ہے" بنا دیتے ہیں۔ اس، نہیں، کے اضافے کے بعد وہ حسب عادت طعن و طنز کی بوچھار شروع کر دیتے ہیں کہ مبصرؔ کی حیرت انگیز بصیرت اور کرامت کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ برنی کی عبارت بن دیکھے ہی وہ برنی کا مفہوم سمجھ گئے۔ ان کا یہ تبصرہ گویا تبصرۂ غیبی ہے جس پر ایمان لانا ہر مومن کلمہ گو کا فرض ہے۔ برنی کے اصلی الفاظ یہ ہیں:۔

و از صحبت من میان ایشان ہر دو استاد قرابتی شد و در خانہائی یک دیگر آمد و شد کردن گرفتند۔"

شمس العلماء نے اپنی کتاب (صفحہ ۴۷ ۵ء) میں قرابت سے دوستی مراد لی ہے۔ اور شیرانی صاحب اس سے رشتہ داری مراد لیتے ہیں، اگرچہ لغت اور قرینہ دونوں سے شیرانی صاحب کے خیال کی تائید ہوتی ہے لیکن شمس العلماء اپنے کو بے بس پاکر شیرانی صاحب کی عبارت میں تحریف کرکے مناظرے میں سرخرو ہونا چاہتے ہیں۔

شمس العلماء کے اپنے قول کے بموجب ضیا برنی ۶۸۴ھ اور ۶۸۵ھ کے درمیان پیدا ہوتا ہے۔ ادھر اعجاز خسروی[۵۱] میں امیر خسرو کا وہ محبت آمیز خط موجود ہے جو انھوں نے یکم ماہ رجب سے ۶۸۷ھ میں اودھ سے خواجہ حسن کے نام بھیجا ہے۔ اس خط میں شمس دبیر اور قاضی اثیرالدین محمدؔ سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے کس حسرت سے لکھتے ہیں:-

تمامت روز دریں تحیّر می بودم کہ یا رب اگر درمجلس شمسی آں بخم علا بچشم آمدی نوراً علیٰ نور بودی"۔

یہ برادرانہ اور دوستانہ روابط جن کا ذکر امیر خسرو اپنے خط میں کر رہے ہیں شمس العلماء کے اس بیان کی تردید کے لئے کافی ہیں کہ ضیا برنی جو ۶۸۷ھ میں ابھی دو تین سال کا بچہ تھا امیر خسرو اور خواجہ حسن میں دوستی کا باعث بنا،

شمس العلماء بہ حیثیت ایک ناقل اور مقلدؔ کے

اگرچہ پچھلے صفحات میں شمس العلماء کی علمی تحقیق کے جو نمونے ہم پیش کر چکے ہیں ان سے شمس العلماء کے محض ناقل اور مقلدؔ ہونے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے تاہم قارئین کرام کی ضیافت طبع کے لئے چند اور مثالیں حاضر ہیں۔ بار بار اپنے جواب میں شمس العلماء اس کا اعلان کرتے ہیں کہ ان کی حیثیت ایک ناقل کی سی ہے۔ اس لئے انھیں ردّ و بدل کرنے کا کوئی حق نہیں۔

---

۵۱ دیباچۂ قرآن السعدین صفحہ ۱۳-۲۰۔

صفحہ ۲۶- آئین بزرگی از دادبہ چارسی المعروف بہ عبداللہ ابن المقفع تالیف ۲۳۷ھ -

شمس العلماء کے بیان پر شیرانی صاحب نے دو اعتراض کئے (۱) سنہ تالیف غلط ہے اس لئے کہ ابن المقفع ۱۴۰-۱۴۲ ہجری میں مارا جاتا ہے اور شمس العلماء سنہ تالیف ۲۳۷ھ بتاتے ہیں (۲) ابن المقفع کا نام دادبہ نہیں بلکہ روزبہ ہے اور اس کے باپ کا نام داذویہ ہے اور اس قول کی تائید میں شیرانی صاحب نے رسالہ کا وہ ایک اقتباس بھی نقل کیا ہے۔

بظاہر ایسی صاف اور واضح بات ماننے میں شمس العلماء کو کوئی عُذر نہ ہونا چاہئے تھا۔ لیکن وہ بھی مجبور رہیں کیا کریں آقای بہروز مرتب آئین بزرگی نے سرورق پر دادبہ لکھ دیا ہے اگرچہ اپنے دیباچے میں بہروز اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ: "برخی نام او را روزبہ نوشتہ اند" یہ "برخی" کون ہیں اس پر شمس العلماء بھی کوئی روشنی نہیں ڈالتے۔ واقعہ یہ ہے کہ اکثر کے نزدیک ابن المقفع کا نام روزبہ ہے مثلاً نکلسن (تاریخ ادبیات عرب)، کلیمان ہوا (ادبیات عرب)، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد دوم (ابن المقفع کے تحت)، براکلمن ۱: ۱۵۱ اسپلیمنٹ ۱: ۲۳۳ رضازادہ شفق (تاریخ ادبیات ایران صفحہ ۳۰)، (طبع یورپ ص ۱۱۸) احمد امین (ضحی الاسلام الجزء الاول) سب سے قدیم سند ابن ندیم کی ہے جو کتاب الفہرست (مطبوعہ مصر) کے صفحہ ۱۷۲ پر لکھتا ہے:-

اخبار عبداللہ بن المقفع و اسمہٗ بالفارسیۃ روزبہ[۱] وھو عبداللہ بن المقفع۔

---

[۱] فلوگل مصحح کتاب الفہرست نے اپنے حواشی ص ۵۲ میں طبع وستنفلد وفیات الاعیان سے روزبہ کی قرأت داذویہ دی ہے۔ مگر وفیات طبع قاہرہ ۱: ۱۵۱ پر ہے: والمقفع بضم المیم وفتح القاف وتشدید الفاء وفتحہا وبعدہا عین مہملۃ و اسمہ داذویہ، ظاہر ہے کہ مقفع کا نام داذویہ ہے نہ ابن المقفع کا۔

اب اس مشہور قول کو چھوڑ کر شمس العلماء کا محض آقای بہروز کی سند پر اصرار کرنا مناسب نہیں، آقای عباس اقبال بھی جنھوں نے عبداللہ ابن المقفع کے سوانح و حالات پر ایک مختصر رسالہ لکھا ہے روزبہ نام کے بعد صاحب قاموس کی روایت کے مطابق دادبہ بھی لائے ہیں۔

سنہ تالیف ۲۳۷ھ کے بارے میں شمس العلماء بالکل خاموش ہیں اور اپنی غلطی کا اعتراف تک نہیں کرتے لیکن اس سے زیادہ دلچسپ شمس العلماء کا یہ حیرت انگیز بیان ہے کہ "نامۂ آئین بزرگی" فارسی نثر کی قدیم ترین کتاب ہے حالانکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس کتاب میں ابن المقفع کی کتاب الادب الکبیر کے مضامین کا خلاصہ شدہ فارسی میں دیا گیا ہے۔ چونکہ ہم اپنے مضمون (رسالہ اُردو جولائی ۱۹۴۷ء) میں اس پر نہایت تفصیل کے ساتھ لکھ چکے ہیں۔ اس لئے اس کا یہاں اعادہ نہیں کرتے لیکن یہ بات موجب حیرت ہے کہ شمس العلماء جیسا تجربہ کار پروفیسر قدیم اور جدید فارسی میں امتیاز نہیں کر سکا۔

صفحہ ۲۸۔ ترجمان البلاغۃ از فرخی۔ شمس العلماء کے نزدیک اس کی تاریخ تصنیف ۳۹۵ھ اور مقام تالیف غزنین ہے۔ شیرانی صاحب کے اس قول پر کہ فرخی اس تاریخ سے کئی سال بعد غزنین آیا ہے شمس العلماء فرماتے ہیں کہ:۔

مُصنّف نے اپنے بیانِ واقعہ میں کسی قیاس اور خیال آرائی کی گنجائش نہیں رکھی اور اپنا تاریخی ماخذ تحریر کر دیا ہے۔ (دیکھو حاجی خلیفہ اور تذکرہ دولت شاہ)

شمس العلماء نے حاجی خلیفہ اور دولت شاہ کا نام تو لے لیا لیکن یہ نہ بتایا کہ وہ لکھتے کیا ہیں۔ یہ دونوں فرخی کی ترجمان البلاغۃ کا ضرور ذکر کرتے ہیں۔ لیکن تاریخ و محل تصنیف کے متعلق کچھ نہیں لکھتے دولت شاہ

کے الفاظ یہ ہیں:-

"وکتاب ترجمان البلاغۃ در صنائع شعر از جملہ مؤلفات اوست و سخن او را فضلا بہ استشہاد می آوردند"

حاجی خلیفہ کے اصل الفاظ ملاحظہ کیجئے:-

ترجمان البلاغۃ فارسی لفرخی الشاعر جمع فیہ الصنائع البدیعۃ (کشف الظنون الجزء الاول صفحہ ۲۷۹) ان تاریخی ماخذوں میں کہیں بھی ترجمان البلاغۃ کے سنہ تالیف کی طرف اشارہ تک موجود نہیں۔

صفحہ ۵۳ مسعود سعد سلمان کے حبسیہ قصیدے۔ نظامی عروضی چہار مقالہ میں مسعود کی حبسیات کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "ارباب خرد و انصاف دانند کہ حبسیات مسعود در علو بچہ درجہ است"

اہل علم بخوبی جانتے ہیں کہ میرزا محمد قزوینی نے بڑی محنت اور عرقریزی سے چہار مقالہ ایڈٹ کیا ہے اور مرحوم براؤن نے اس کا انگریزی میں ترجمہ بھی شائع کر دیا ہے۔ قزوینی کے ایڈیشن کی کئی نقلیں ہندوستان میں چھپ چکی ہیں، خدا جانے شمس العلماء کے پاس وہ کون سا نسخہ تھا کہ انھوں نے حبسیات کی جگہ 'حسیات' لکھ کر اس کا ترجمہ کیا جیسے شیرانی صاحب نے غلط بتایا اور صحیح قرائت 'جلسیات' کی طرف شمس العلماء کی توجہ مبذول کرائی اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ خواجہ مسعود اپنی حبسیات کے لئے مشہور عالم ہیں۔

شمس العلماء کا عذر لنگ ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں کہ جس نسخۂ کتاب سے یہ عبارت نقل کی گئی ہے اس میں 'حسیات' ہی تحریر ہے۔ بنا بریں مصنف کو اس میں اصلاح دے کر 'حبسیات' کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔

کیا شمس العلماء ہمیں بتائیں گے کہ چہار مقالہ کا جو نسخہ ان کے زیر مطالعہ تھا کیا وہ صحیفۂ آسمانی تھا جس میں کسی قسم کے رد و بدل کی گنجائش

نہیں ہو سکتی تھی۔ ایک عالم کے لئے ایسی اندھی تقلید کسی طرح بھی جائز نہیں ہو سکتی اور پھر خود چہار مقالہ کی عبارت کا سباق و سیاق شمس العلماء کی تردید کر رہا ہے۔

نیز شمس العلماء کو شیرانی صاحب کا یہ بیان کہ "خواجہ مسعود اپنی حبسیات کے لئے مشہور عالم ہیں" ناقابل تسلیم ہے ان کے نزدیک حبسیات کی کوئی تخصیص نہیں بلکہ مسعود اپنے اقسام کلام کے لئے مشہور عالم ہیں، ہم شمس العلماء کی خدمت میں رشید وطواط کی رائے پیش کرنا چاہتے ہیں اور وہ یہ ہے:۔

وبیشتر اشعار مسعود سعد سلمان کلام جامع است خاصہ آنچ در حبس گفتہ است وہیچ کس از شعرائے عجم بگرد او نہ رسند نہ در حسن معانی و نہ در لطف الفاظ (حدائق السحر صفحہ ۸۲)

اسی طرح نظامی عروضی وغیرہ اس کی حبسیات کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ آقای رشید یاسمی نے حال ہی میں مسعود سعد سلمان کا دیوان بہت صحت اور اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ دیباچہ کا آغاز وہ اس طرح کرتے ہیں "میں مدرسہ میں تھا کہ مسعود سعد سلمان کی حبسیات نے پہلی بار مجھے متاثر کیا اور اس بات کی طرف متوجہ کیا کہ پرانے اور نئے قصیدہ گو شاعروں میں سے ایک ایسا شخص بھی ہے جس نے ممدوح کی تعریف، جلب مال اور کسب جاہ کے علاوہ بھی کبھی قصیدہ سے کام لیا ہے اور کلام کو صحیح معنی میں اپنے احساسات کا ترجمان بنایا ہے"

رضا زادہ شفق مسعود کی "حبسیات" کا اس طرح ذکر کرتے ہیں۔

"ظاہر ہے کہ مسعود سعد کا خاص طرز جس کی وجہ سے وہ ہمارے بلند مرتبت شعراء کی صف میں بلند مقام کا مالک ہے اس کی "حبسیات" میں جلوہ گر ہے اس قسم کے اشعار ہمارے ادبیات میں کمیاب ہیں۔ ....

یہ بات بلا وجہ نہیں کہ

نظامی عروضی جیسا مصنف جو کم و بیش مسعود کا ہم عصر تھا لکھتا ہے:۔

"وقت باشد کہ من از اشعار او ہمی خوانم موی بر اندام من بر پای خیزد و جای آن بود کہ آب از چشم برود" تاریخ ادبیات ایران صفحہ ۱۵۶۔

صفحہ ۷۳۔ ابوشکور بلخی کا ایک شعر۔ شمس العلماء اس طرح نقل کرتے ہیں :۔

چنیں داستان کس نگفت از خیال
ابر سی صد و سی و سہ بود سال

جب شیرانی صاحب نے بتایا کہ خیال کی جگہ، "فیال" چاہیئے تو شمس العلماء فرماتے ہیں کہ ماخذ میں "خیال" تحریر تھا اس لئے نقل میں اس کی پابندی کی گئی، اصلاح دے کر ردّ و بدل کرنا مصنّف کی حد نظر نہیں"۔

ہمیں نیک گمان سے کام لینا چاہیئے ورنہ شبہ ہوتا ہے کہ ابوشکور کے کلام میں یہ اصلاح شمس العلماء کی طبع زاد ہے سعید نفیسی نے رودکی کی تیسری[1] جلد میں یہ شعر اس طرح نقل کیا ہے :۔

برین داستان کس نگفت از فیال
ابر سی صد و سی و شش بود سال

اور حاشیہ میں فیال کے یہ معنی دئے ہیں۔ "فیال بلغت بلخ آغاز باشد"۔

صفحہ ۹۳۔ عمید سنامی :۔ "شمس العلماء اس شاعر کی نسبت تونکی بیان کرتے ہیں۔ مگر اس نام کا کوئی قصبہ معلوم نہیں اس کی دوسری شکل "لومک" ہے بہت ممکن ہے کہ تولک ہو جس کا ذکر طبقات ناصری میں آتا ہے اور غور میں ایک قصبے کا نام ہے اس سے تولکی نسبت بنے گی لیکن پروفیسر اس کو سنامی کیوں نہیں کہتے"۔ شمس العلماء کو، تولکی، اس بنا پر تسلیم نہیں کہ اس کا ذکر بدایونی اور رضا قلی ہدایت نے نہیں کیا۔ عمید کو وہ اس لئے سنامی کہنے کے لئے تیار نہیں کہ ان کی تحقیق میں سنام عمید کا مولد نہیں بلکہ منشاء

[1] رودکی کی تیسری جلد صفحہ ۱۲۳۷،

جائے تربیت ہے،

اوّل تو ڈاکٹر اقبال حسینؔ[1] نے عرفات العاشقین کی سند پر عمید کا مولد سنام بتایا ہے لیکن اگر سنام کو محض جائی تربیت ہونے کا فخر حاصل ہو پھر بھی سنامی کی نسبت غیر معلوم لونکی اور لوکی سے تو بہتر ہو گی شمس العلماء یہ کہہ کر اپنی مجبوری ظاہر کرتے ہیں کہ "مصنف محض ناقل کلام ہے" اب نقل میں بیچاری عقل کی گنجائش کہاں؟

ہندوستان میں ایرانی ادیبوں اور شاعروں کی آمد

"ہندوستان میں موقع بہ موقع وقتاً فوقتاً ایرانی ادیبوں اور شاعروں کی آمد یا ہجرت کا ذکر پروفیسر (شمس العلماء) کی تالیف کی نمایاں خصوصیت ہے لیکن ان ہجرتوں کی تفصیل یا ان کے اثرات واضح طور پر کبھی نہیں دکھائے۔ ...... "ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اطلاعیں تاریخی نہیں ہیں بلکہ مفروضہ ہیں"

شیرانی صاحب نے مندرجہ بالا الفاظ میں شمس العلماء کے اس دعوے پر اعتراض کیا کہ "معزالدین کے عہد میں فارسی ادب کی ترقی کے حق میں ایک اہم محرک خراسان سے اس کے لشکروں کے ساتھ ادیبوں کی آمد تھی۔ ایرانی ادیبوں کی یہ ہجرت ہندوستان اور ایران کے مابین تمدنی سنگم قائم کرنے میں درمیان کی کڑی ثابت ہوئی" (اصل کتاب ۲۷۰)

شمس العلماء نے اپنے جواب کے خاتمے میں بعض ایرانیوں کی ہجرت کا ذکر کیا ہے۔ (ان کے اس بیان کو ہم ابھی تحقیق کی کسوٹی پر پرکھیں گے) لیکن وہ معزالدین غوری کے زمانے میں ایرانی ادیبوں کی آمد کا کوئی تاریخی

---

[1] ہندوستان کے قدیم فارسی شعراء۔ صفحہ ۲۰۰۔

ثبوت ہم نہیں پہنچا سکے۔ لے دے کے ایک امام فخر الدّین رازی ہیں جن کا ذکر انھوں نے بدایونی کی سند پر بیان کیا ہے اگرچہ وہ خود بدایونی کے بیان سے مطمئن نہیں ہیں اس لئے کہ اس کے ماخذ کا شمس العلماء کو کوئی پتہ نہیں تاہم انھوں نے اس تصدیق طلب بیان کی بناء پر ایک شاندار عمارت کھڑی کر دی ہے۔ وہ امام رازی کا معزالدّین غوری کے لشکر کے ساتھ ہندوستان میں آنا یقینی تصوّر فرماتے ہیں اور ان کو افسوس ہے کہ "امام رازی کی اس ہفتہ وار مجلس وعظ کی حقیقی اہمیت کے تمام پہلوؤں کو جس میں شاہی لشکریوں کے علاوہ ہندوستان کے لوگ سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں شریک ہوتے تھے۔ ایرانی مورّخ پوری طرح نہیں سمجھ سکے، بلا شُبہ اس کا اثر دوررس تھا جہاں تک کہ اس نے لوگوں کے ادبی مذاق میں انقلاب پیدا کر دیا اور شائستہ اور موزوں طبع گروہ کو فارسی زبان میں لکھنے پر اُکسایا۔"

شمس العلماء کا یہ بیان حد درجہ کمزور بنیاد پر مبنی ہے اور یہ محض ان کے تخیل کی بلند پروازی کا بہت اچھا نمونہ ہے، جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں۔ ابن الاثیر جو ساتویں صدی ہجری کے نصفِ اوّل میں اپنی الکامل تالیف کرتا ہے امام رازی کا شہاب الدین غوری کے مکان پر وعظ کہنا اور ایک موقع پر شہاب الدّین کا وعظ سے متاثر ہو کر زار زار رونا بیان کرتا ہے۔ جب شمس العلماء کے بیان کی بنیاد ہی اس درجہ کمزور ہو تو ظاہر ہے کہ جو عمارت بھی اس پر کھڑی کی جائے گی وہ کتنی کمزور ہوگی۔

شمس العلماء ہمت ہارنے والے انسان نہیں۔ اگرچہ وہ معزالدّین غوری کے لشکر کے ساتھ ایرانی ادیبوں کی آمد ثابت نہیں کر سکے پھر بھی انھوں نے ہمّت نہیں ہاری اور اپنے جواب کے آخر میں بعض مثالیں پیش کی ہیں۔ چونکہ ان میں سے بعض غیر صحیح اور بعض غیر متعلق ہیں ہم ان پر

تفصیل کے ساتھ بحث کرنا چاہتے ہیں۔

(۱) شمس العلماء کے نزدیک سب سے پہلی ہجرت ان ایرانیوں کی ہے جن کو زمانۂ قبل اسلام میں افراسیاب نے جلاوطن کر دیا تھا اور جو آکر پنجاب میں آباد ہو گئے تھے۔ اس تحقیق اور انکشاف پر شمس العلماء کو اتنا ناز ہے کہ اُن کی اس بے جا تعلّی اور خود ستائی کا کھوکھلا پن ظاہر کرنے کیلئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اصلی الفاظ پیش کر دئے جائیں۔ تاکہ قارئین بھی ان کی اس خوشی اور مسرت میں شریک ہو سکیں:۔

"یہ درحقیقت اپنی اپنی جستجو اور مطالعہ کا ثمرہ ہے جس کو ہم فرق بصیرت و بصارت کہہ سکتے ہیں۔ بے شبہ جن تاریخوں کے صفحات مبصر اور دیگر محققین اُلٹ چکے تھے وہی تاریخیں مصنّف کے بھی پیشِ نظر تھیں لیکن کسی کی نظر اس نکتہ تک پہنچ گئی کسی کی نہ پہنچی۔

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے

وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے"

ہمیں شمس العلماء کے ساتھ پورا اتفاق ہے کہ واقعی یہ بصیرت اور بصارت کا فرق ہے کہ جس افسانہ اور سراب کو دوسرے محققوں نے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا شمس العلماء نے فقط اُسے غیر معمولی اہمیت ہی نہیں دی بلکہ اس کے مفروضہ دور رس اثرات کو بڑے مزے لے کر دُہرایا" آیئے ذرا دیکھیں کہ یہ کون سی تاریخ کی کتابیں ہیں جن کی طرف شمس العلماء اشارہ کر رہے ہیں۔ یہ مشہور کتابیں بدایونی کی منتخب التواریخ اور نظام الدّین کی طبقات اکبری ہیں ان کے علاوہ تاریخ فرشتہ میں بھی اس واقعہ کا ذکر ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ مصنّف جنھوں نے زمانۂ حال میں ہندوستان کی تاریخیں لکھی ہیں ان کے سامنے یہ بیان موجود ہو گا لیکن اُنھوں نے اس کے غیر معقول اور نادرست ہونے کے باعث اسے کسی توجّہ کا مستحق نہیں سمجھا۔

سر وسلی ہیگ نے کیمبرج ہسٹری آف انڈیا کی تیسری جلد میں اس مقام کو جہاں سے سلطان ابراہیم غزنوی کا ایک لاکھ ایرانیوں کو اپنے ساتھ غزنین لے جانا بیان کیا جاتا ہے نوساری فرض کیا ہے جو سورت کے پاس ہے لیکن اس تاویل کا غیر موجہ ہونا بالکل واضح ہے۔ شمس العلماء کی ایک اور سند یاقوت کی معجم ہے جس کا حوالہ ایک گمنام تذکرہ سلاطین آل غزنین میں دیا گیا ہے۔ جس کا ایک نسخہ خوش قسمتی سے شمس العلماء کے پاس ہے۔ اس گمنام تذکرہ کے مصنف نے یہ نہیں بتایا کہ معجم سے مراد کون سی کتاب ہے معجم البلدان یا معجم الادبا۔ تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیجئے کہ ان میں سے کسی ایک کتاب میں محولہ بالا واقعہ کا ذکر سچ مچ موجود ہے پھر بھی یاقوت جو ساتویں صدی ہجری میں اپنی کتابیں تالیف کرتا ہے افراسیاب کے زمانے کے لئے جو غیر تاریخی ہے سند کیونکر مانا جا سکتا ہے۔ مرحوم پروفیسر شاپورشاہ ہوڈی والا جنھوں نے ایلیٹ اور ڈاؤسن کی تاریخ ہند کی آٹھ جلدوں پر ایک ضخیم ناقدانہ تبصرہ[۵۱] شائع کیا ہے اس تبصرے میں ایرانیوں کی اس ہجرت پر شرح و بسط کے ساتھ بحث کرتے ہیں۔ ہم ان کی تحقیق کا خلاصہ درج ذیل کرتے ہیں:۔

ہندوستان میں سلطان ابراہیم غزنوی کے حملوں کے بیانات اس قدر مبہم اور پیچیدہ ہیں اور جن مقامات پر اس کے لشکروں نے حملے کئے ان کے ناموں کے اس قدر مختلف ہجے دئے گئے ہیں کہ اُن کی بنا پر اُس وقت یا اس کے بعد شمالی ہند میں زردشتیوں کی وسیع بستیوں کے موجود ہونے کے بارے میں نظریے قائم کرنا میرے نزدیک بے سود ہے۔

ہم عصر شاعر مسعود سعد سلمان ان حملوں کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن اس کے قصیدوں میں کہیں اس کا ذکر نہیں کہ ایک لاکھ خراسانیوں کو جنھیں افراسیاب نے ہندوستان سے جلا وطن کر دیا تھا۔ غزنین بھیجا گیا واقعہ یہ ہے کہ اس افسانہ

---

[۵۱] "ناقدانہ تبصرہ"۔ صفحہ ۵۶۳۔

کی قدیم ترین سند روضتہ الصفا معلوم ہوتی ہے جو پندرھویں صدی عیسوی کے آخر میں لکھی گئی۔ افراسیاب کا وجود اور اس کا خراسان پر مفروضہ حملہ اساطیری اور غیر تاریخی ہیں اور چونکہ خراسانیوں کا غزنین لے جایا جانا اسی افسانے کا شاخسانہ ہے اس لئے دونوں کسی اعتبار کے مستحق نہیں۔ سر ولسلی ہیگ نے کیمبرج ہسٹری آف انڈیا کی تیسری جلد (صفحہ ۳۴ و ۳۵) میں اس افسانے کو حقیقت میں بدلنے کی یوں ناکام کوشش کی ہے۔ "سلطان ابراہیم (غزنوی) کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ۱۰۷۹ عیسوی میں اس نے ایک شہر ردپال نام فتح کیا شاید اسی نام کا ایک شہر مہی کانٹھا میں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان مغربی ساحل کی طرف بڑھا اور پارسیوں کی ایک نوآبادی پر جا پہنچا جو گجرات میں نوساری ہو سکتی ہے۔ یہی ایک فرضی صورت ہے جس کے ذریعہ ایک مُسلم مؤرّخ کے اس غلط بیان کی توجیہ کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک ایسے شہر میں پہنچا جہاں وہ خراسانی رہتے تھے جنھیں افراسیاب نے ہندوستان جلاوطن کر دیا تھا۔"

ہیگ کے یہ الفاظ نقل کرنے کے بعد پروفیسر ہوڈی والا استفسار کرتے ہیں کہ ایسے صریح غلط بیان کو ماننے کی کیا ضرورت ہے جبکہ مفروضہ صورت بھی اس درجہ کمزور ہے۔"

اسی سلسلۂ ہجرت کی مزید شہادت جو بزمانۂ اسلام برنی کی تاریخ فیروز شاہی میں شمس العلماء کی نظر سے گزُری ہے یہ ہے کہ اس کثرت سے ایران و دیگر ممالک اسلامی سے ادباء، علماء، شعراء، دہلی میں جمع ہو گئے تھے کہ دہلی، رشکِ بغداد و ایران و مصر بن گیا تھا۔ برنی صرف اس قدر کہتا ہے کہ "ہر قوم کے بزرگوں، ہر علم کے استادوں، اور ہر ہُنر کے ماہروں کا اجتماع تخت گاہ دہلی میں دیکھا گیا کہ دہلی رشکِ بغداد، غیرتِ مصر، قسطنطنیہ کی ہمسر اور بیت المقدّس کی مقابل ہو گئی" برنی یہاں کہیں ایران اور دیگر ممالک

کے علماء اور شعراء کا ذکر نہیں کرتا۔

تاریخ برنی سے ذیل کا اقتباس بھی دیا گیا ہے:۔

"در تمامی عصر علائی در دار الملک دہلی علمای بودند کہ آنچنان استادان کہ یکی علامۂ وقت در بخارا و سمرقند و بغداد و مصر..... و در ربع مسکون نہ باشند"

برنی یہاں علمائے دہلی کی تعریف کرتا ہوا کہتا ہے کہ ان جیسے علماء بخارا، سمرقند، بغداد اور مصر میں موجود نہ تھے۔ یہاں ایرانی علماء اور شعراء کی ہجرت کا کہاں ذکر ہے۔

تیسرا اقتباس تاریخ فرشتہ سے لیا گیا ہے جس میں وہ یہ کہتا ہے کہ سلطان غیاث الدین بلبن کے زمانے میں جب کبھی "پادشاہزادہائی ولایات و بزرگانِ وقت" آتے تھے۔ تو سلطان خندہ پیشانی کا اظہار کرتا اور شکرِ الٰہی بجالاتا اور ہر ایک کے لئے ایک علیحدہ محلّہ متعیّن کر دیتا چنانچہ اس طرح دہلی میں پندرہ محلّے بن گئے۔ ان محلّوں کے نام یہ تھے:۔ عبّاسی، سنجری، خوارزم شاہی، دیلمی، علوی، اتابکی، غوری، چنگیزی، رومی، سنقری، یمنی، موصلی، سمرقندی، کاشغری، خطائی۔

کیا شمس العلماء یہ بتا سکتے ہیں کہ ان پادشاہزادہائی ولایت و بزرگان وقت" میں سے کتنے ایرانی علماء و شعراء تھے اور ان کے نام کیا تھے؟

چوتھا اقتباس پھر برنی سے نقل کیا گیا ہے اور اس کی بنا پر یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ "برنی نے ایک موقع پر چھیالیس نام ایسے ملکی اور غیر ملکی علماء و فضلا و ادبا کے گنائے ہیں جن کے فیض صحبت سے وہ مستفید ہوا تھا یا اس کو ان سے تلمّذ حاصل تھا کہتا ہے:۔

"و این چہل و شش استاد مذکور کہ من القاب (و) اسامی الیشان

نوشتہ ام آنانند کہ من در پیش بعضے تلمذ کردہ ام و بخدمت بعضے رسیدہ و بیشتری را در مسند افادت دیدہ ام" (صفحہ ۳۵۴)

برنی بلا شبہ چھیالیس اُستادوں کا ذکر کرتا ہے لیکن ملکی اور غیر ملکی کا کہیں نام نہیں لیتا۔ یہ اضافہ شمس العلماء کا اپنا ہے، اصل میں یہ عبارت برنی کے "در تمامی عصر علائی در دارالملک دہلی علمای بودند" والی عبارت کے ساتھ متعلق ہے جس کا مفہوم حضرت شمس العلماء نہ سمجھ سکے اور یہ لکھ دیا (ملاحظہ ہو اصل کتاب ۱۷۴) کہ "برنی کے تمام اُستاد بلا استثناء بڑے متبحر عالم تھے جو منگولوں کے حملوں اور تباہی کے ڈر کے مارے بخارا سمرقند خراساں اور بحر خزر پار کے علاقوں سے ہندوستان چلے آئے تھے" حالانکہ برنی اس کے برعکس یہ کہتا ہے کہ علمای دہلی کی نظیر اسلامی ممالک اور ربع مسکون میں ملنا مشکل ہے ؎

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

بعض غیر متعلق اور غیر ضروری مباحث۔

شیرانی صاحب نے اپنے تبصرے میں اس بات کی شکایت کی تھی کہ کتاب کا پہلا باب جو تمہیدی ہے اگرچہ مفید معلومات کا حامل ہے لیکن موضوع زیر بحث کا خیال کرتے ہوئے بہت کچھ غیر ضروری اور غیر متعلق کہا جاسکتا ہے..... پروفیسر لکھنے بیٹھے تھے قبل از مغل فارسی ادبیات ہند کی داستان مگر مقدمے میں ایسے مضامین چھیڑ بیٹھے جن سے نفس مضمون کو دُور کا بھی تعلق نہیں مثلاً عربوں کی فتح ایران کے بعد عربی اور فارسی کے روابط، فتح سندھ از عرب..... وغیرہ طفیلی جمع شد چنداں کہ جائی میہماں گم شد"

دوسرا باب غزنویوں سے قبل کا زمانہ ...... اصل موضوع کا خیال کرتے ہوئے یہ باب بھی اتنا ہی بے محل اور بے موقع معلوم ہوتا ہے جتنا پہلا باب"

شمس العلماء، اس شکایت کی تاب نہ لا سکے اور سخت برہم ہوئے اور اس برافروختگی کے عالم میں اُنھوں نے براون کی "ایران کی ادبی تاریخ" کی مثال پیش کی" اس کتاب کا موضوع اگرچہ ایران کی ادبی تاریخ ہی لیکن اس میں خلفائے راشدین، اموی اور عبّاسی خلفاء کا تذکرہ بھی موجود ہے اس لئے مبصرؔ کو پہلے بروان پر اعتراض کرنا چاہیئے" اگر شمس العلماء خفا نہ ہوں تو ہم یہ عرض کرنے کی جرأت کریں کہ اگرچہ بروان کی کتاب کا نام "ایران کی ادبی تاریخ" ہے لیکن حقیقت میں یہ ایران کی ذہنی و عقلی تاریخ ہے، اس کے تمدّن و ثقافت کی تاریخ ہے اور ایرانیوں کے علمی کارناموں کی تاریخ ہے خواہ اُن کی زبان عربی ہو یا فارسی، براؤن اپنے مقصد کی توضیح اس طرح کرتے ہیں (ایران کی ادبی تاریخ جلد اول دیباچہ صفحہ ۸)

"اس لئے کہ میں ایرانیوں کی عقلی تاریخ لکھنا چاہتا تھا نہ کہ صرف ان شعراء اور مصنّفین کی تاریخ جنھوں نے بذریعہ فارسی زبان اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، مذہب، فلسفہ اور علم کے میدانوں میں (ایران کی) قومی روح کے تمام مظاہر میرے لئے اتنے ہی دلچسپ تھے جتنے کہ وہ مظاہر جن کا تعلق ایک محدود تر معنی میں اقلیم ادب کے ساتھ ہے۔ اور میرے نقطۂ نظر سے یہ بات غیر اہم تھی کہ خیالات کے اظہار کے لئے کون سی زبان اختیار کی گئی ہے"۔

شمس العلماء کے لئے یہ کسی طرح درست نہیں کہ اپنی تالیف کا براؤن کی بلند پایہ اور قابل قدر کتاب سے مقابلہ کریں۔

اس بحث کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ شمس العلماء نے اپنا تمام زور حشو اور زوائد پر صرف کر دیا ہے اور اصل موضوع پر بہت کم لکھا ہے شعرا میں سے مسعود سعد سلمان، ابوالفرج رونی، عمید سنامی،

تاج الدین دبیر، خواجہ معین الدین اجمیریؒ، امیر خسرو اور امیر حسن وغیرہ کے سوانح و کلام پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے اور نثر نگاروں میں لے دے کے منہاج سراج اور ضیا برنی کے کارناموں کی داد دی گئی ہے، بدر چاچ اور قاضی ظہیر کو شمس العلماء نے اس لئے چھوڑ دیا ہے کہ "ان کے احوال کی فراہمی اور کلام پر تبصرے کے لئے کم از کم دو سال کا وقت اور دو سو صفحات درکار ہوتے" اس کے علاوہ یہ امر بھی ملحوظ رکھا گیا کہ "کتاب کا حجم ناخوشگوار حد تک بڑھنے نہ پائے" اگر شمس العلماء کے پیشِ نظر یہ امر تھا تو انھیں پہلے دو ابواب پر اتنی تفصیل اور اطناب کے ساتھ نہ لکھنا چاہیئے تھا، ضروری مباحث کو وہ اختصار کے ساتھ بھی بیان کر سکتے تھے۔ لیکن بڑی مشکل یہ ہے کہ افتتاحی باب اور دوسرے باب کو وہ اپنا شاہ کار سمجھتے ہیں حالانکہ اصل موضوع سے ان کا کوئی تعلق نہیں شمس العلماء کو خود اس بات کا اعتراف ہے کہ محمود کے حملوں کے ساتھ ہندوستان میں فارسی شعر کے ذوق کا آغاز ہوتا ہے افتتاحی باب کا خاتمہ شمس العلماء اس طریق پر کرتے ہیں:۔

"درحقیقت ابھی فارسی زبان کے لئے ہندوستانیوں کو اپنی طرف مائل کرنے کا موقع کم تھا لیکن ایک عظیم الشان واقعہ رونما ہونے والا تھا جس سے ہندوستان کی کلچرل تاریخ میں ایک بالکل نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ واقعہ ہندوستان کے سین (منظر) پر غزنویوں کا ظہور تھا"

اس اعتراف کے باوجود شمس العلماء کا یہ اصرار کہ پہلے دو باب بہت ضروری ہیں۔ "ہماری سمجھ میں نہیں آتا، یہ بتانے کے لئے کہ جس قدر کام شمس العلماء نے کیا ہے اس سے کہیں زیادہ وہ چھوڑ گئے ہیں" (شمس العلماء بھی اس قول کو حقیقت پر مبنی مانتے ہیں) شیرانی صاحب نے اپنے تبصرے کے تتمے میں بہت سے مصنفین اور شعراء کا ذکر کیا ہے اور اگر شمس العلماء

کی برہمی کا ہمیں ڈر نہ ہو تو ہم یہ کہنے کی جرأت کریں کہ اصل موضوع سے متعلق جتنا ضروری مواد شیرانی صاحب نے اپنے تبصرے میں بہم پہنچایا ہے وہ شمس العلماء کی فراہم کردہ معلومات سے ہر حیثیت سے زیادہ قیمتی ہے۔ شمس العلماء نے نثری تالیفات سے ایک گونہ اپنی بے نیازی اور بیخبری کا ثبوت دیا ہے اُمّید ہے کہ کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں شمس العلماء شیرانی صاحب کی تحقیقات سے فائدہ اٹھا کر نثر کی طرف بھی توجّہ مبذول فرمائیں گے۔

رسم الخط کے متعلّق شمس العلماء کا ارشاد

شمس العلماء جذبۂ انتقام سے مغلوب ہو کر شیرانی صاحب کے رسم الخط پر بھی معترض ہیں حالانکہ انھیں اس بات کا علم ہونا چاہیئے کہ یہ رسم الخط شیرانی صاحب کا ذاتی خط نہیں بلکہ انجمن ترقّیٔ اُردو کا تجویز کردہ ہے اور رسالہ اُردو میں جتنے مقالے بھی شائع ہوتے ہیں ان میں اسی رسم الخط کی پابندی کی جاتی ہے شیرانی صاحب کا تبصرہ لیتھو میں نہیں بلکہ ٹائپ میں چھپا تھا اس لئے اس میں ہر جگہ ہندوستان کو ھندستان لکھا گیا ہے، شمس العلماء خود اپنی کتاب کی ورق گردانی فرمائیں تو اس میں بھی "ھا" کو یونہی لکھا گیا ہے، ہندوستان کو بہ تخفیف واو لکھنے کی مثالیں خود شمس العلماء کی کتاب میں موجود ہیں ملاحظہ ہو صفحہ ۱۹۸- ۱۹۹- ۲۴۶-

ہم عصر علماء کی تحقیقات سے فائدہ اُٹھانا اور اس کا اعتراف نہ کرنا۔

شمس العلماء کی کتاب کا ایک تاریک اور افسوسناک پہلو یہ ہے کہ وہ اپنے ہم عصر علماء کی تحقیقات سے فائدہ اُٹھاتے ہیں لیکن اس علمی استفادہ کا اعتراف تو درکنار وہ بعض اوقات ان علماء کا نام تک بھی اپنی کتاب میں ذکر نہیں کرتے اور اس عدم اعتراف کا نتیجہ یہ ہو کہ

کبھی کبھی اصل ماخذ کا غلط حوالہ درج کردیتے ہیں اور اس طرح اُن کی خوشہ چینی کا راز فاش ہوجاتا ہے ہم ذیل میں چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔

(۱) فارسی کا قدیم ترین شعر۔ علامہ قزوینی پہلے شخص ہیں جنھوں نے عربی ماخذ سے بعض فارسی اشعار کا سُراغ لگایا ہے۔ اس موضوع پر ان کا مضمون بیست مقالہ قزوینی جلد اوّل میں چھپ چکا ہے۔ ایک ہندوستانی عالم ڈاکٹر عمر محمّد داؤد پوتہ اپنی ذاتی تحقیق و تفتیش سے وہی معلومات فراہم کرتے ہیں لیکن جب ان کی توجہ بیست مقالہ کی طرف مبذول کرائی گئی تو انھوں نے فوراً اس بات کا اعتراف کیا کہ ان سے پہلے میرزا قزوینی یہی زمین طے کرچکے ہیں لیکن اس کے برعکس شمس العلماء اسی اطّلاع کو اپنی کتاب میں درج کرتے ہیں اور اپنے فاضل پیش رَو کا کہیں نام تک نہیں لیتے اس عدم اعتراف کی وجہ یہ نہیں کہ وہ میرزا قزوینی کی تحقیقات سے واقف نہیں ہیں بلکہ خلیفہ ماموں کی مدح میں ابوالعبّاس مروزی کے قصیدے کے متعلّق جو شکوک میرزا قزوینی اور براؤن نے ظاہر کئے ہیں شمس العلماء نے نہایت قابلیت کے ساتھ ان شکوک کا جواب دینے کی کوشش کی ہے ہمیں افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہاں شمس العلماء اپنے دلائل کے لئے آقای جلال ہمائی کے ممنون ہیں اگرچہ وہ ہمائی یا ان کی کتاب کا ذکر نہیں کرتے، جلال ہمائی نے اپنی تاریخ ادبیات ایران جلد دوم (صفحہ ۱۸۳ - ۲۴۴) میں میرزا قزوینی کے اُن دلائل کا جواب دیا ہے جو میرزا نے اس تاریخی واقعہ کی عدم صحت کے متعلّق پیش کئے ہیں شمس العلماء شاید توارد کا عذر پیش کریں اسی طرح ابن مناذر اور ماسرجویہ طبیب کا واقعہ بھی غالباً "کتاب الاغانی" سے براہِ راست نہیں بلکہ ہمائی کی کتاب سے نقل کیا گیا ہے، ہمائی نے اُسے نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے (جلد دوم صفحہ ۲۸۶ - ۲۸۹)

(۲) مولانا سلیمان ندوی کی "عرب و ہند کے تعلقات" سے شمس العلماء نے دو تین مقامات پر خوشہ چینی کی ہے اور پوری کتاب میں سید صاحب کا نام تک نہیں آنے دیا، ترمذی کے ابواب الامثال اور بشارات کے متعلق ہم اپنے مضمون (اردو، جولائی ۱۹۴۹ء) میں وضاحت کے ساتھ لکھ چکے ہیں، یہاں ہم صرف کھمبایت کی مسجد کے متعلق عوفی کے نقل کردہ بیان کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں، سید صاحب نے اس واقعہ کو عوفی کی جوامع الحکایات سے اپنی کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" میں نقل کیا ہے، شمس العلماء، ہندو راجاؤں کی مسلم نوازی کے نمونے کے طور پر اسے پیش کرتے ہیں لیکن اپنے اصل ماخذ کو چھوڑ کر فٹ نوٹ میں" باب دوم (ذکر ملوک طوائف و احوال ایشاں) درج کرتے ہیں جہاں تک ہمیں معلوم ہے جوامع الحکایات ابھی تک زیور طبع سے عاری ہے، ہاں ڈاکٹر نظام الدّین نے اس کے مطالب کا انڈکس تیار کیا ہے۔ لیکن شمس العلماء نہ سید صاحب کا حوالہ دیتے ہیں نہ ڈاکٹر نظام الدّین کا۔

(۳) ڈاکٹر ناظم کی کتاب "سلطان محمود آف غزنہ" شمس العلماء نے سلطان محمود کو ایک مجاہد اور غازی اسلام کی حیثیت سے اپنی کتاب میں پیش کیا ہے اور ان کی رائے میں سلطان کی فتح سومنات کلمۂ توحید کا اعلان اور صنم پرستی کی شکست ہے حالانکہ کتاب کے ابتدائی حصے میں وہ ہندو حکمرانوں کی رواداری اور فیاضی کی داستان کو تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں اور پچھلے بیان کے پیش نظر ان کا یہ اظہار فخر و مسرت بہت حد تک غیر موزوں ہوتا ہے۔ پھر بھی ہمیں ان کے اس خاص نظریے سے یہاں تعرض کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ہمیں جس چیز سے یہاں سروکار ہے وہ شمس العلماء کا ڈاکٹر ناظم کے محققانہ مقالے سے

بغیر کسی اعتراف کے استفادہ کرتا ہے۔ شمس العلماء نے تین چار جگہ ابن الاثیر کی الکامل کے حوالے دیئے ہیں لیکن جہاں تک ہمارا خیال ہے شمس العلماء نے بذاتِ خود الکامل کی ورق گردانی کی زحمت گوارا نہیں کی اور اُنھوں نے ڈاکٹر ناظم کے بھروسے پر فٹ نوٹ میں الکامل کی جلد اور صفحہ درج کر دیا ہے، قارئین کرام کے سامنے ہم شمس العلماء کے ایسے دو بیان پیش کرنا چاہتے ہیں جو ڈاکٹر ناظم سے ماخوذ ہیں، ان میں سے ایک میں تو ڈاکٹر ناظم کے غلط بیان کو نقل کر لیا گیا ہے۔ اور دوسرا بیان نامکمّل ہے اگرچہ ڈاکٹر ناظم نے ایک دوسرے مقام پر اس کو مکمّل صورت میں بھی پیش کیا ہے۔

(۱) فتح سومنات۔ شمس العلماء ابن الاثیر کی سند پر کہتے ہیں کہ جب ۱۵ ذوالقعدہ ۴۱۶ھ کو مسلمان قلعہ کی دیواروں پر قابض ہو گئے تو اُنھوں نے شعارِ اسلامی کا اعلان کیا، ادھر ہزاروں ہندوؤں نے گڑگڑا کر بُت سے مدد کی التجا کی اور اس زور کا حملہ کیا کہ مسلمان اس کی تاب نہ لا سکے اور غروبِ آفتاب سے پہلے ہندو پھر ان اہم جگہوں پر قابض ہو گئے۔ (اصل کتاب صفحہ ۲۱۸)

تقریباً یہی بیان ڈاکٹر ناظم کی کتاب[۱] میں ملتا ہے۔ اس بیان کا آخری حصہ یعنی ہندوؤں کا مسلمانوں کو پیچھے ڈھکیلنا اور قلعہ کی دیواروں پر قبضہ کر لینا ڈاکٹر ناظم اور شمس العلماء دونوں کے یہاں ابن الاثیر کی سند پر دیا گیا ہے لیکن الکامل میں اس واقعہ کا کہیں ذکر نہیں ملتا، اگر خود شمس العلماء نے الکامل کو ملاحظہ فرمایا ہوتا تو وہ اس غلطی کا شکار نہ ہوتے جو ڈاکٹر ناظم کی تقلید میں ان سے سرزد ہوئی ہے ہم یہاں شمس العلماء کی غلطی واضح کرنے کے لئے الکامل کی اصل عبارت درج کرتے ہیں۔

---

[۱] ناظم کی محمود آف غزنہ صفحہ ۱۱۷۔

محیذ فی اشتد القتال وعظم الخطب وتقدم جماعت الھنود الی موسومنات فعفروا الخدود وسألوہ النصر وادرکھم اللیل فکف بعضھم عن بعض۔"

اس عبارت میں صرف اتنا بیان کیا گیا ہے کہ گھمسان کی لڑائی ہوئی اور ہندوؤں نے بہت زاری اور نیازمندی کے ساتھ سومنات سے فتح و نصرت کی درخواست کی اور جب رات کی تاریکی چھا گئی تو جنگی کارروائی رُک گئی۔

اس عبارت کا غلط مفہوم ڈاکٹر ناظم کی کتاب میں جگہ پاتا ہے اور ہمارے شمس العلماء ان کی تقلید میں اس غلط مفہوم کو اپنی کتاب میں ڈاکٹر ناظم کا نام لئے بغیر درج کر لیتے ہیں۔ اگر انھوں نے ڈاکٹر ناظم کا حوالہ دیا ہوتا تو اس غلطی کی ذمہ داری سے بچ جاتے۔

(ب) سلطان محمود کا دوسرے شہروں کے کُتُب خانوں سے کتابیں غزنین میں لانا ڈاکٹر ناظم[1] ابن جوزی اور ابن الاثیر کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ جب کبھی محمود کوئی شہر فتح کرتا تھا تو وہاں کے کُتُب خانوں کے نوادر غزنین کے کتُب خانہ میں اضافہ کرنے کے لئے لے جاتا تھا۔ تقریباً یہی بیان شمس العلماء کی کتاب (صفحہ ۲۴۲) میں ملتا ہے صرف اتنا فرق ہے کہ ڈاکٹر ناظم "غزنین کے جمع کردہ علمی ذخیرہ" کا ذکر کرتے ہیں۔ اور شمس العلماء کو شاہی اکیڈمی لکھنا زیادہ پسند ہے۔ شمس العلماء کی سند محض ابن الاثیر کی کامل ہے جو انھوں نے بذاتِ خود ملاحظہ نہیں فرمائی ورنہ ان کے بیان میں یہ تعمیم نہیں ہوتی۔ چونکہ ڈاکٹر ناظم کے سامنے الکامل موجود ہے اس لئے انھوں نے مندرجۂ بالا بیان کی توضیح الگ دو جگہ کر دی ہے۔ لیکن شمس العلماء جن کی حیثیت ناقل محض کی سی ہے بغیر

---

[1] ناظم کی محمود آف غزنہ صفحہ ۱۵۸۔

تحقیق و تفتیش کے ڈاکٹر ناظم کا بیان نقل کر لیتے ہیں اصل واقعہ صرف اتنا ہے کہ جب سلطان محمود نے رے فتح کیا تو وہاں کے شاندار کتُب خانے کی کتابیں جن کا تعلق فلسفہ اعتزال اور نجوم سے تھا جلادیں۔ ان کے سوا اور بہت سی کتابیں غزنین پہنچائی گئیں الکامل کی اصل عبارت ملاحظہ ہو۔

و لما ملک محمود الذی ..... نفی المعتزلۃ الی خراسان و احرق کتب و النجوم و اخذ من الکتب ما سوی ذالک مائۃ حمل" (نویں جلد صفحہ ۱۵۴)

ڈاکٹر ناظم فتح رے کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ معتزلہ[۱] اور باطنیوں کے مکانوں کی تلاشی لی گئی اور ملحدانہ عقائد سے متعلق تمام کتابیں نذر آتش کر دی گئیں اور وہ کتابیں جو سلطان کے دیندارانہ عقائد کے مطابق تھیں غزنین بھیج دی گئیں۔

ایک اور جگہ ڈاکٹر ناظم لکھتے ہیں کہ "جب[۲] شہر رے مسخر کیا گیا تو محمود کے حکم سے وہ تمام کتابیں جلادی گئیں جن کا تعلق قرمطی عقائد سے تھا یا جن سے الحاد کی بو آتی تھی۔ اس طرح ایک بیش بہا علمی ذخیرہ جو کئی سالوں میں بنی بویہ کی فیاضانہ حکمت عملی اور علمی ذوق سے جمع ہو چکا تھا ایک دیندار مجاہد کے جوش کی تسکین کی خاطر نذر آتش کر دیا گیا"۔

ڈاکٹر ناظم کے ان بیانات سے صاف ظاہر ہے کہ اُن کے پیشِ نظر الکامل کا پورا بیان موجود ہے۔ لیکن شمس العلماء کا بیان ڈاکٹر ناظم کے نامکمل بیان کی محض نقل ہے اپنے ہم عصر علماء سے خوشہ چینی کرنا اور پھر ان کا اعتراف نہ کرنا ایک عالم کی شان کے مناسب نہیں"۔

بعض ایسی غلطیاں جن کی طرف پہلے سے اشارہ نہیں کیا گیا۔

---

[۱] ناظم کی محمود آف غزنہ صفحہ ۸۳ [۲] ایضاً صفحہ ۱۶۰۔

شمس العلماء اپنی معلومات کو پیش کرنے میں بڑے غیر محتاط واقع ہوئے ہیں۔ ایک[ا] جگہ عرب علماء کے بارے میں لکھتے ہیں کہ " انھوں نے خاص طور پر فارسی کا اچھا خاصہ علم حاصل کر لیا تھا، بعض عربی ادب فارسی زبان کے ذریعے سے سکھاتے تھے اس قسم کی ایک مثال موسی اُسواری کی ہے جو عام مجلسوں میں آیات قرآنی کا مطلب فارسی زبان میں سمجھاتا تھا۔"

شمس العلماء نے بیک جنبش قلم موسی اُسواری کو عرب بنا دیا حالانکہ اگر انھوں نے لفظ اُسواری پر غور کیا ہوتا تو انھیں اُس کے ایرانی ہونے میں کوئی شُبہ نہ رہتا۔ موسی بن سیار الاسواری تو ان ایرانی علماء کا نمونہ ہیں جو ایرانی اور عربی ثقافت کے پورے ماہر تھے، اسواری کا یہ حال تھا کہ وہ ایک ہی مجلس میں عربوں کے سامنے عربی میں مطلب سمجھاتا تھا اور ایرانیوں کے سامنے فارسی میں (ضحی الاسلام جلد اوّل صفحہ ۱۷۹)

عبداللہ طاہر بن حسین ۔۔ شمس العلماء یہاں بیان یہ کرنا چاہتے ہیں کہ طاہر بن حسین کو مامون نے خراسان کا گورنر بنا کر بھیجا لیکن اس کا پورا نام صفحہ ۸۹ پر عبداللہ طاہر بن حسین لکھتے ہیں حالانکہ عبداللہ طاہر کا بیٹا ہے اور اپنے بھائی طلحہ بن[۲] طاہر کی وفات کے بعد خراسان کا گورنر مقرر کیا جاتا ہے۔

سامانی حکومت کا آغاز و انجام۔ صفحہ ۱۱۵ پر شمس العلماء لکھتے ہیں کہ "۳۹۵ھ ہجری میں سامانیوں کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا، اس حکومت کا آغاز ۲۶۱ھ ہجری میں ہوا تھا جبکہ خلیفہ معتضد باللہ نے اسد بن سامان کے بیٹوں کو ایران اور وسط ایشیاء کے علاقوں کا گورنر مقرر کیا۔"

اتنے سے مختصر بیان میں شمس العلماء اپنی لاپروائی سے دو غلطیوں کے مرتکب ہوئے ہیں:۔ (۱) اسد بن سامان کے بیٹوں کو خلیفہ معتضد نے مقرر نہیں کیا بلکہ وہ مامون کے عہد خلافت میں مقرر کئے گئے اور

[ا] شمس العلماء کی کتاب صفحہ ۳۳ [۲] زین الاخبار صفحہ ۶،

تیسری صدی ہجری کے اوائل کا واقعہ ہے نہ کہ ۲۶۱ھ ہجری کا۔ (۲) معتضد ۲۶۱ھ ہجری میں خلیفہ نہیں ہوتا بلکہ وہ ۲۷۹ھ ہجری میں سریر خلافت پر جلوہ افروز ہوتا ہے۔

سلطان محمود کا خطاب یمین الدولہ ولی امیر المومنین۔ شمس العلماء تذکرۂ دولت شاہ اور اپنے گمنام تذکرہ سلاطین آل[۵۰] غزنین کی سند پر رقمطراز ہیں کہ امام ابو منصور ثعالبی نیشاپوری کی سفارش پر خلیفہ القادر باللہ نے سلطان محمود کو یمین الدولہ ولی امیر المومنین کا خطاب عطا کیا اور یہ خطاب ہند میں اس کی شاندار فتوحات کے صلے میں دیا گیا تھا لیکن محمود کی ذہانت لفظ ولی کو گوارا نہ کر سکی جس کے معنی دوست کے بھی ہیں اور غلام کے بھی، چنانچہ اُس نے اپنے سفیر بغداد کی معرفت ایک لاکھ دینار خلیفہ کی خدمت میں بھیجے اور ولی کو "والی" میں مبدّل کرالیا۔

یہ سچ ہے کہ دولت شاہ نے اس روایت کو نقل کیا ہے لیکن شمس العلماء کا بحیثیت ایک محقق کے یہ فرض تھا کہ وہ اسے نقد و درایت کی کسوٹی پر پرکھتے، انھیں چاہیئے تھا کہ تاریخ کی کتابوں کی طرف رجوع کر کے دیکھتے کہ اس گپ میں سچّائی کس قدر ہے، یمین الدولہ و امین الملۃ ولی امیر المومنین کا خطاب محمود کو ۳۸۹ھ میں ہی مل جاتا ہے، چنانچہ ملاحظہ ہو۔

(ناتمام)

---

[۵۱] شمس العلماء کی کتاب صفحہ ۲۱۵

اقبال کی وطن دوستی

اقبال اپنی شاعری کے آخری دور میں بھی عارف ہندی، گوتم بدھ اور برتری ہری کا ذکر ادب تحسین اور احترام کے ساتھ کرتے ہیں، 'شعاع اُمید' میں وہ مسلمان اور برہمن دونوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنا چاہتے ہیں، جاوید نامہ میں وہ میر جعفر اور میر صادق کو دین، وطن اور آدمیت کے لئے ننگ کا موجب قرار دیتے ہیں...... اس وسیع النظری اور کشادہ دلی کے باوجود یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ زندگی کے آخری دور میں اقبال نے ابنائے وطن کی جنگ آزادی میں کسی ہمدردی یا دلچسپی کا اظہار نہیں کیا بلکہ اُن کا تعلق آل پارٹیز مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ سے رہا جن کے سالانہ اجلاسوں کی صدارت بھی انھوں نے منظور کی، اس دور میں اقبال مسلمانوں کے لئے حقوق طلبی کی مہم میں سرگرم رہے اور انھیں ملک کی ان تحریکوں سے قطعاً کوئی تعلق نہ تھا جو آزادیٔ وطن کے حصول کے لئے آزاد خیال رہنماؤں کے نزدیک بہت ضروری تھیں.....

اقبال کے عقیدت مندوں اور قدردانوں کو یہ بات قطعاً گوارا نہیں کہ اس بلند پایہ شاعر کی زندگی کے بعض ایسے پہلوؤں کی طرف اشارا کیا جائے جن کی وجہ سے ان کے نزدیک اس کی عظمت میں کوئی کمی محسوس ہوتی ہو، گویا ان کے خیال میں اقبال ایک ایسا انسان ہے جو تمام بشری کمزوریوں سے منزہ ہے اور اس کا نظام فکر ایسا جامع اور مکمّل ہے جس میں کسی قسم کے نقص یا خامی کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ دوسری طرف ایک ایسا گروہ بھی موجود ہے جو اقبال کی شاعرانہ عظمت تک کا منکر ہے۔ اس افراط

اور تفریط کے درمیان اعتدال کا تقاضا یہ ہے کہ اقبال کی شاعرانہ عظمت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ ان ناخوش گوار باتوں کو بھی تسلیم کر لیا جائے جو اقبال کی شخصیت یا ان کے کلام میں پائی جاتی ہیں اور جو بعض حضرات کے خیال میں محل نظر ہیں۔ آج غالب کی شاعرانہ عظمت سے کس انصاف پسند کو انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے زبردست، سے زبردست مدّاح کے لئے بھی یہ بہت دشوار ہے کہ نواب شمس الدین کے سلسلے میں مخبری کی ذمّہ داری سے اُسے بچا سکے، ہندوستانی فرہنگ نگاروں کے ساتھ ان کے ناروا اور بے جا سلوک کی حمایت کر سکے یا آئین اکبری کی اشاعت پر اس کی نکتہ چینی کو درست بتا سکے۔ اگر یہ یا اس قسم کی دوسری خامیاں غالب کی شاعرانہ عظمت کے متعلق ہمارے تصور پر اثر انداز نہیں ہو سکتیں تو اقبال کی عظمت و بزرگی کے خیال کو کیونکر دور کر سکتی ہیں۔ ۱۹۱۸ء میں پنجاب کے لفٹنٹ گورنر سر مائیکل اوڈوائر کے ایما پر گورنمنٹ ہاؤس میں اقبال اپنی نظم "پنجاب کا جواب" سناتے ہیں جس کا ایک شعر ملاحظہ ہو:-

جو کچھ کہ ہے عطائے شہِ محترم سے ہے
آبادیٔ دیار ترے دم قدم سے ہے

اور اس دعا پر نظم ختم کرتے ہیں:-

قائم رہے حکومت آئیں اسی طرح
دبتا رہے چکور سے شاہیں اسی طرح

۱۹۲۷ء میں مرحوم سر محمد شفیع کے ساتھ مل کر اقبال لاہور میں ایک الگ لیگ قائم کرتے ہیں جس کے سکریٹری وہ خود تھے، لاہور اسٹیشن پر اقبال سائمن کمیشن کا سواگت کرتے ہیں، حالانکہ لبرل پارٹی کے رہنما بھی اس کمیشن سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے۔ یہ چیزیں اس قدر واضح اور آشکارا ہیں کہ لاکھ کوشش کیجئے ان پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا، لیکن اس کے ساتھ

ساتھ اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ ان چیزوں سے شاعر اور مفکّر کی حیثیت سے اقبال کی عظمت میں کوئی کمی پیدا نہیں ہوتی۔

اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی اقبال کی وطن دوستی ہے، جیسا کہ خواجہ غلام السیدین صاحب نے بیان کیا ہے۔ اقبال اپنی شاعری کے آخری دور میں بھی عارف ہندی، گوتم بدھ اور برتری ہری کا ذکر ادب تحسین اور احترام کے ساتھ کرتے ہیں، شعاع اُمید میں وہ مسلمان اور برہمن دونوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنا چاہتے ہیں۔ جاوید نامہ میں وہ میر جعفر اور میر صادق کو دین، وطن، اور آدمیت کے لئے ننگ کا موجب قرار دیتے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اگر اقبال نے گوتم بدھ کو اولوالعزم انبیاء کی صف میں پیش کیا ہے تو یہ ان کی اس وسیع النظری کی بدولت ہے جو مذہب، نسل اور وطن کی حدود سے بالاتر ہو کر انسانیت کی صحیح قدروں کو متعین کرنے میں ایک صاحب دل کی رہنمائی کرتی ہے، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ گوتم بدھ کے ذکر کے بعد وہ ایران کے جلیل القدر پیغمبر جناب زرتشت کی زندگی کے ایک اہم واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس وسیع النظری اور کشادہ دلی کے باوجود یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ زندگی کے آخری دور میں اقبال نے ابنائے وطن کی جنگ آزادی میں کسی ہمدردی یا دلچسپی کا اظہار نہیں کیا بلکہ ان کا تعلق آل پارٹیز مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ سے رہا جن کے سالانہ اجلاسوں کی صدارت بھی انھوں نے منظور کی اس دور میں اقبال مسلمانوں کے لئے حقوق طلبی کی مہم میں سرگرم رہے اور انھیں ملک کی ان تحریکوں سے قطعاً کوئی تعلق نہ تھا جو آزادیٔ وطن کے حصول کے لئے آزاد خیال رہنماؤں کے نزدیک بہت ضروری تھیں۔

یہی وہ زمانہ ہے جب اقبال نے ہندوستان کے اندر اسلامی ہند کا

نعرہ بلند کیا، آج کا پاکستان شاعر کے متخیلہ "اسلامی ہند" سے خواہ کتنا مختلف کیوں نہ ہو اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پاکستان اسی نعرے کی صدائے بازگشت ہے، یہ سچ ہے کہ اقبال میر جعفر اور میر صادق جیسے غدّارانِ ملّت سے سخت ناراض ہیں لیکن یہاں ہم اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ ان دونوں نے مسلمان حکمرانوں سے غدّاری کی تھی اور شاید یہی وجہ اقبال کے عتاب اور ناراضی کی ہے میر جعفر اور میر صادق کی مذمت کرنے کے بعد اقبال میر جعفر کی روح کو اب بھی سرگرم عمل پاتے ہیں اگرچہ وہ خود جہاں سے رخصت ہو چکا ہے:-

مرد جعفر زندہ روح او ہنوز	کے شب ہندوستاں آید بروز
آشیاں اندر تنِ دیگر نہد	تا ز قید یک بدن وا می رہد
گاہ پیشِ دیریاں اندر نیاز	گاہ او با کلیسا ساز باز
در زمانِ ما وطنِ معبود او	پیش ازیں چیزے دگر مسجودِ او
باطنش چوں دیریاں زنار بند	ظاہر او از غمِ دین درد مند
ایں مسلمانے کہن ملت کش است	جعفر اندر ہر بدن ملت کش است
ملّت او از وجود او لئیم	از نفاقش وحدتِ قومی دو نیم

وہ کون سا گروہ ہے جس کی طرف اقبال یہاں اشارہ کر رہے ہیں، یہ کہیں مسلمان وطن دوستوں کا گروہ تو نہیں؟ یہ کون ہے جو اہل دیر کا طوق نیاز اپنی گردن میں ڈالے ہوئے ہے، یہ کون سا مسلمان ہے جو بقول اقبال کے وطن کو معبود ٹھہراتا ہے، یہ کون ہے جو بظاہر دین کے غم سے فگار ہے، لیکن باطن میں اہل دیر کی طرح زنار بدوش ہے، یہ کون مسلمان ہے جو ملّت کش ہے، جس کے نفاق کی بدولت قوم کا شیرازہ بکھر چکا ہے اور جس کے وجود نے ملّت کو بدبختی کے گڑھے

میں ڈھکیل دیا ہے، اس سوال کا جواب ایک اور صرف ایک ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ یہاں اقبال کے سامنے علماء اور مسلم وطن پروروں کا وہ گروہ ہے جو ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کے ساتھ اشتراک عمل کا حامی ہے اور جو آزادئی وطن کی جنگ میں جرأت اور ایثار کا ثبوت بھی دے چکا ہے۔ لیکن اقبال کے نزدیک ان کی یہ بہادری اپنے اندر حیدر کرار کی شان نہیں رکھتی بلکہ عہد جاہلیت کے عرب شاعر عنترہ کی یاد دلاتی ہے جس کا نام شجاعت کے لئے ضرب المثل ہے۔

اقبال کے اس واضح اور صریح بیان کے بعد ہمارے لئے یہ تسلیم کرنا ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ اقبال اپنی زندگی کے آخری دور میں بھی حب وطن کے جذبے سے سرشار تھے۔

اقبال بجا طور پر فرماتے ہیں کہ وہ ایک بہتر معاشرتی نظام کی تلاش میں ایک ایسے نظام معاشرت کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے جس کا سب سے بڑا مقصد نسل، رنگ اور ذات پات کے خطرناک امتیازات کو مٹانا ہے۔ لیکن یہاں یہ اہم بات ہمارے پیش نظر رہنی چاہئے کہ اس نظام معاشرت کے پیرو کہاں تک اس کے صحیح تقاضوں کو پورا کرتے ہیں، ہم اکثر بلند آہنگی سے اسلام کے شاندار اصول کا صور پھونکتے ہیں، لیکن اس حقیقت کو یکسر فراموش کر جاتے ہیں کہ یہ شاندار اصول، عالم گیر سچائیاں ہیں اور ہماری صحیح قدر و قیمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہم کس حد تک ان شاندار اصولوں کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہوئے ہیں، اقبال کا ایک ممدوح اورنگ زیب ہے جو حکمرانی کے تمام اوصاف سے متصف ہے اور جس کی دینداری کا ہر کس و ناکس کو اعتراف ہے لیکن ہمیں اس اعتراف کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی تسلیم کرنی پڑے گی کہ اس کے ذہنی دائرے میں وہ وسعت نہ

تھی جو اس جیسے عظیم الشان اور اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے بے نظیر شہنشاہ میں ہونی چاہئے تھی، وہ اپنے بھائی دارا کو محض اس بناء پر ملحد کہتا ہے کہ اس کے مذہبی خیالات میں ایک ہمہ گیری اور وسعت ہے وہ محض صوفیوں کا حلقہ بگوش ہی نہیں بلکہ ویدانت کا بھی قائل ہے، اور تصوف اور ویدانت کے دو دریاؤں کا سنگم تیار کرتا ہے۔ داراشکوہ شیخ محمود شبستری صاحب گلشن راز کی تقلید میں، اسلام مجازی سے بیزاری ظاہر کرتا ہے، اور کفر حقیقی کو خوش آمدید کہتا ہے یہ وہی بزرگ ہیں جن کی مثنوی سے متاثر ہو کر اقبال جدید گلشن راز کی داغ بیل ڈالتے ہیں اور جس کی شان میں وہ یہ کہتے ہیں:۔

زعہد شیخ تا ایں روزگارے ۔۔۔ نزد مردے بجاں ما شرارے

اس کے باوجود یہ دیکھ کر ہمیں سخت تعجّب ہوتا ہے کہ اقبال اورنگ زیب کے ہم نوا ہو کر داراشکوہ پر الحاد کا الزام لگاتے ہیں اور اورنگ زیب و دارا کی جنگ کو کفر و دین کی کارزار قرار دیتے ہیں حالانکہ بیچارہ دارا اپنے کو حنفی مذہب اور قادری مشرب بتاتا ہے اور اس کی تصنیفات سفینۃ الاولیاءؒ اور سکینۃ الاولیاءؒ اس کے اس دعوے کی شاہد ہیں۔ اقبال کا یہ شعر ملاحظہ ہو:۔

تخم الحادے کہ اکبر پرورید ۔۔۔ باز اندر فطرت دارا دمید

اورنگ زیب ان کی نظر میں کفر و دین کی پیکار میں اسلامی ترکش کا آخری تیر ہے۔

درمیانِ کارزار کفر و دیں ۔۔۔ ترکش ما را خدنگ آخریں

کور ذوقان داستانہا ساختند ۔۔۔ وسعت ادراک او نشناختند

اقبال کے یہاں ایک عجیب قسم کا تضاد پایا جاتا ہے داراشکوہ تو بعض عقائد کی بناء پر ان کی نظر میں ملحد ٹھہرتا ہے، لیکن حلاّج جیسے محض

الحاد و زندقہ کے الزام میں موت کے گھاٹ اُتار دیا جاتا ہے اُن کے ایوان فکر میں خودی کا شارح اور مفسر ہے بلکہ مرگ آباد عالم میں قیامت برپا کرنے میں اقبال کا پیش رو ہے چنانچہ اس کی زبان سے کہلواتے ہیں :-

آنچہ من کردم تو ہم کردی بترس　　　　محشرے بر مردہ آوردی بترس

بعینہ یہی تضاد اقبال کے یہاں حضرت مولانائے روم اور بلبل شیراز خواجہ حافظ کے سلسلے میں پایا جاتا ہے مرشد رومی کے خوانِ کرم سے زلّہ ربائی کا اظہار وہ بار بار والہانہ شیفتگی اور عقیدت کے ساتھ کرتے ہیں۔ لیکن بلبل شیراز ان کی نظر میں ایک ساحر ہے جو اپنی خوشنوائی اور عشوہ آفرینی سے لوگوں کو گمراہ کرتا ہے۔ وہ مئخواروں کی ملت کا فقیہ اور بے چاروں کی اُمّت کا امام ہے۔ اس کا ساغر احرار کے سزاوار نہیں اور اس کی محفل ابرار کے شایان نہیں، خواجہ حافظ پر اس درجہ عتاب اس لئے ہے کہ وہ تسلیم و رضا اور صبر و قناعت کی تلقین کرتے ہیں۔ کیا یہی چیزیں صوفیائے کرام کے یہاں قدر مشترک کی حیثیت نہیں رکھتیں اور کیا "حکیم پاک زاد" کے کلام میں جابجا ان کا ذکر نہیں ملتا، پھر حافظ پر یہ لعن طعن کیوں؟ حافظ اور اقبال کے سلسلے میں ایک بھولے ہوئے واقعہ کا ذکر دلچسپ رہے گا۔ تحریک خلافت کے زمانے میں امرتسر کے نامور شاعر جناب محمد حسین عرشی نے چند فارسی اشعار میں اقبال کو مخاطب کرتے ہوئے ان سے رونق ہنگامہ احرار بننے کی درخواست کی، اس کے جواب میں اقبال نے عرشی صاحب کو یقین دلایا کہ ان کا پیمانہ ہرگز نہیں ٹوٹا بلکہ بدستور سلامت ہے اور "رندانِ پختہ کار کے شیوہ"، کی توضیح اقبال نے خواجہ حافظ کے اس شعر سے کی ؎

دانا چو دید بازئی ایں چرخ حقہ باز　　　　ہنگامہ باز چید و در گفت گو ببست

مندرجہ بالا سطور میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے ہمارا مقصود اقبال کی تنقیص نہیں بلکہ اس بے جا وکالت کے خلاف احتجاج ہے جو آئے دن اقبال کے بعض قدر شناسوں کی جانب سے دیکھنے میں آتی ہے۔ اگر ٹیگور ہندو دھرم اور تہذیب کے سرچشموں سے سیراب ہو کر اخلاقی قدروں کو جانچتے ہیں اور مرحوم چترنجن داس کے تیار کردہ میثاق بنگال کے خلاف محض اس لئے آواز اٹھاتے ہیں کہ اس میں مسلمانوں کے مطالبات کو تسلیم کر لیا گیا تھا اور پھر بھی ان کی عظمت میں کوئی فرق نہیں پڑتا تو کوئی وجہ نہیں کہ اقبال عہدِ حاضر کی وطنیت کے مخالف ہونے کی پاداش میں معتوب ٹھہرائے جائیں۔ اور ہم انھیں اس الزام سے بچانے کے لئے وطن دوست ثابت کرنے کی کوشش کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کی باتوں کی بناء پر اقبال کی عظیم المرتبت شخصیت یا ان کی شاعرانہ عظمت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ حقیقت بھی فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ انسان کا کمال اس بات میں ہے کہ اس میں کم سے کم خامیاں پائی جائیں، ورنہ ایسا کامل انسان تو کہاں مل سکتا ہے۔ جو تمام خامیوں سے پاک ہو، بقول ایک عرب شاعر کے:۔

ومن ذا الذی ترضیٰ سجایاہ کُلّھا
کفی المرءَ نبلاً أن تعد معائبہ

"ایسا کون شخص ہے جس کی تمام عادتیں لوگوں کو پسند ہوں، ایک آدمی کی شرافت کے لئے یہ بات کافی ہے کہ اس کے عیوب گنتی کے ہوں۔"

حیاتِ شبلی پر ایک نظر

علامہ سید سلیمان ندوی مولانا شبلی کے معنوی فرزند اور حقیقی جانشین ہیں، شبلی کی طرح ان کی علمی فتوحات کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے، شبلی ایک مورخ، ادیب، ناقد اور محقق تھے۔ سید صاحب بھی ان تمام میدانوں کے شہسوار ہیں بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ایک محقق کی حیثیت سے بعض باتوں میں سید صاحب اپنے استاد سے بھی بڑھ کر ہیں، اس تقدم کا سب سے بڑا سبب شبلی ایسے محسن استاد کی دست گیری ہے جو سید صاحب کو عنفوان شباب میں ہی میسّر آگئی اور جس نے ان کے جوہر کو پوری طرح چمکایا، اس کے علاوہ علمی کام کے لیے جو سہولتیں سید صاحب کو نصیب ہوئیں وہ ان کے استاد کو میسّر نہ تھیں، مشرق اور مغرب میں جس سرعت کے ساتھ اسلامی علوم و فنون کے ذخیرے علماء کے استفادہ کے لئے پچھلے تیس سال میں منصۂ ظہور پر لائے گئے وہ بھی ایک حد تک سید صاحب کی علمی تحقیقات کے دائرے کی وسعت کے ضامن ہیں، بادی النظر میں جو فرق استاد اور شاگرد کے درمیان نظر آتا ہے وہ ذوق و میلان کا فرق ہے شبلی ایک حسّاس دل رکھتے تھے اور ان کے احساسات کے اظہار کا بہترین ذریعہ ان کی شاعری تھی، جہاں تک فارسی زبان کی چاشنی کا تعلق ہے شاید ہی عصر حاضر کے ہندوستان کا کوئی دوسرا شاعر شبلی کے مقابلے میں پیش کیا جاسکے اور یہ طفیل ہے ان کے شائستہ مذاق اور فارسی شعرا کے کلام کے گہرے مطالعہ کا، اسی طرح ان کی سیاسی نظمیں جو انھوں نے اُردو میں لکھیں اگرچہ ان کی حیثیت مقامی اور محدود ہے تاہم وہ ایک قادر الکلام فنکار کے کمال کی شاہد ہیں، سید صاحب نے بھی اُردو، فارسی اور عربی میں طبع آزمائی

کی ہے لیکن ان کی نظموں میں کوئی خاص بات نہیں، ایک دوسرا نمایاں فرق جو انھیں استاد سے ممیز کرتا ہے وہ سید صاحب کا روحانیت اور تقدس کی طرف بڑھتا ہوا میلان ہے، بعض حلقوں میں روحانیت پر جو حد سے زیادہ زور دیا جا رہا ہے شبلی کو وہ قطعاً پسند نہ تھا، وہ اپنے دور کے ایک ممتاز متکلم تھے اور سید صاحب کی رائے میں ان کی اکثر تصنیفات علم کلام کی کتابیں ہیں بلکہ سیرت النبیؐ کی تالیف شبلی کے نزدیک علم کلام کی سب سے بڑی ضرورت تھی[۱]، اگر غور سے دیکھا جائے تو سید صاحب کا بڑا کارنامہ یعنی سیرۃ النبیؐ کی تکمیل ایک متکلمانہ فرض کی ادائگی ہے، اسی طرح ارض القرآن حیات مالک، سیرت عائشہ صدیقہ اور بے شمار مقالوں کا شمار بھی اسی دائرہ میں ہے تاہم سید صاحب اپنے روحانی احساس کی تسکین کے لیے تھانہ بھون کی طرف دست عقیدت بڑھاتے ہیں اور "جامع المجددین" کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو کر اپنے بعض خیالات سے رجوع کر لیتے ہیں مثلاً سیرۃ النبیؐ کی تیسری جلد میں سید صاحب نے بڑے مدلل طریق پر معراج کو روحانی ثابت کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نئی زندگی کے بعد وہ اپنی پرانی رائے ترک کر کے جمہور کے ہم نوا بن گئے، اسی روحانیت کے زیر اثر سید صاحب متکلمین کی خامیاں ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "علم کلام صرف معترضوں کی زبان کو بند کرنا سکھاتا ہے لیکن بند دلوں کو کھولنا اس کا کام نہیں" تاہم سید صاحب کے نزدیک علم کلام کو بیکار اور ہیچ سمجھنا غلطی ہے اور متکلمین کی مثال اسلامی سلطنت کے مجاہد سپاہیوں کی ہے جو دین کو معترضوں کے خطرے اور دشمنوں کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لئے اپنے علم و فن کی بساط بھر کوشش کرتے ہیں، سید صاحب کے رجوع کی ایک اور مثال جانداروں کی

---

[۱] دیباچہ صفحہ ۵۱،

تصویر کی ہے، غالباً ۱۹۲۰ء یا ۱۹۲۱ء میں تصویر کھنچوانے کے جواز میں انھوں نے رسالۂ معارف میں دو مضمون لکھے تھے لیکن اب آپ کے نزدیک کسی جاندار کی تصویر کی اشاعت جائز نہیں چنانچہ یہی وجہ ہے کہ حیات شبلی میں شبلی کی تصویر کو جگہ نہیں دی گئی، اس سلسلہ میں شاید اس لطیفہ کا ذکر کرنا دلچسپی کا باعث ہوگا جسے سید صاحب نے دوسرے مقالے کے آخر میں درج کیا تھا، امرت سر کے مرحوم رئیس بابو نظام الدین تاجر چرم مسلمانوں کے تعلیمی کاموں اور بالخصوص ندوۃ العلماء کی سرگرمیوں میں بڑی دلچسپی کا اظہار کیا کرتے تھے، اس تصویر کے متعلق جو ان کے مکان میں آویزاں تھی کسی شخص کے استفسار کے جواب میں بابو صاحب نے کہا کہ یہ تصویر نہیں ہے بلکہ تصویر کے جواز کا فتویٰ ہے اس لیے کہ جو بزرگ اس تصویر کی رونق کا باعث تھے ان میں سید رشید رضا مصری شبلی، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور مولانا ابوالکلام آزاد کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

شبلی کے ارشد تلامذہ ہونے کی حیثیت سے اپنے استاد کے سوانح حیات لکھنے کے لئے سید صاحب سب سے زیادہ مستحق ہیں اور استاد کی بھی یہی خواہش تھی، انھیں افتخار عالم مارہروی کے "آلودہ ہاتھوں[۵۱]" سے حیات شبلی کا لکھا جانا قطعاً گوارا نہ تھا، سید صاحب ہمیں یقین دلانا چاہتے ہیں کہ شبلی کا یہ انکار براہ ترفع و استکبار نہ تھا لیکن اس تاویل کو قبول کرنا ذرا مشکل کام ہے، اس لیے کہ جب سید صاحب نے پونہ سے مارہروی صاحب کی سفارش کی تو مولانا شبلی نے جواب میں لکھا:

"افتخار عالم صاحب[۵۲] میری لائف کیا لکھیں گے کبھی تم اور دنیا کے کاموں سے فارغ ہونا تو تم ہی لکھنا" خدا کی قدرت دیکھئے کہ شبلی کی پیشین گوئی

---

۵۱ دیباچہ صفحہ ۲۴ ۵۲ ایضاً صفحہ ۲۵

حرف بہ حرف سچی ثابت ہوئی اور سید صاحب نے حیات شبلی اس وقت لکھی جبکہ وہ دوسرے کاموں سے فارغ ہو چکے تھے۔

جب شبلی ۱۳ ۱۹۱۳ء میں اپنی امیدوں کے مرکز ندوہ سے الگ ہونے پر مجبور ہو گئے تو ان کے سامنے صرف ایک میدان تھا اور وہ میدان تصنیفی انجمن کا تھا چنانچہ وہ اپنے ایک دوست کو جو آج ان کے مخالفین کے زمرے میں شریک ہیں لکھتے ہیں :۔ "ہندوستان میں اور ہر کام کے لئے انجمنیں ہیں لیکن تصنیفی انجمن کا میدان خالی ہے اور یہ سب سے بڑا اہم کام ہے ، ایک لائق مصنف ہزاروں آدمیوں کے دل پر حکمرانی کرتا ہے" شبلی کا یہ قول کس قدر سچا ہے ، خود شبلی اور ان کے بعد ان کے قابل ترین شاگرد سید سلیمان صاحب ندوی علمی حلقوں میں جس عزت و احترام کے مستحق سمجھے جاتے ہیں وہ سب پر عیاں ہے ، ۱۹۲۰ء میں جبکہ سید صاحب بمشکل پینتیس برس کے ہوں گے علماء کے زمرہ میں سے وفد خلافت کی رکنیت کے لئے انھیں منتخب کیا گیا ، اس امتیاز کا بڑا سبب یہ تھا کہ بہت چھوٹی عمر میں سید صاحب علمی حلقوں میں اپنی فضیلت علم کا لوہا منوا چکے تھے یہی وہ موقع ہے جب اکبر الہ آبادی نے کہا تھا

وہ ندوی سے اب ہو گئے لندنی	سلیمان کی بات کیسی بنی
مگر چائے والوں سے گاڑھی چھنی	رہے بادہ نوشوں سے بیشک کھچے
خدا غیر سے ان کو کر دے غنی	محمد علی کی رفاقت میں ہیں

ابھی سید صاحب کی تعلیم ہی کا زمانہ تھا کہ شبلی نے نوجوان شاگرد کی صلاحیتوں کا اندازہ کر لیا تھا چنانچہ نومبر ۱۹۰۴ء میں سید صاحب شبلی کی رائے میں ایک جوہر قابل تھے (حیات شبلی صفحہ ۴۰۰) ندوۃ العلماء کے مختلف اجلاسوں میں سید صاحب نے جس انداز میں بغیر کسی تیاری

۵ا حیات شبلی صفحہ ۶۹۱

کے عربی زبان میں تقریریں کیں ان کی بدولت وہ علمی حلقوں میں کافی روشناس ہوگئے، اس کے علاوہ رہبر کامل کی دست گیری نے انھیں کہیں سے کہیں پہنچا دیا، وہ کئی بار رسالہ الندوہ کے ایڈیٹر مقرر ہوئے، دارالعلوم ندوہ میں انھیں جدید عربی کا معلّم مقرر کیا گیا، عربی زبان میں نئے الفاظ کا لغت مرتب کرنے کے لئے انھیں چنا گیا۔ چنانچہ انھوں نے لغات جدیدہ کے نام سے ایک کتاب مرتب کی، شبلی کی زندگی کا آخری کارنامہ سیرۃ النبیؐ ہے جس کی ناتمامی کی حسرت وہ اپنے ساتھ قبر میں لے گئے، اس کی تالیف کے دوران میں بطور عربی مددگار کے سیّد صاحب کا انتخاب عمل میں آیا، شبلی کا دمِ واپسیں تھا جب انھوں نے سیّد صاحب سے سیرت کی تکمیل کے لئے کہا چنانچہ سیّد صاحب سالہا سال سے اس کی تکمیل میں مصروف ہیں۔

اس مختصر سے بیان سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ استاد کی زندگی میں ہی سیّد صاحب اپنے لیے ایک امتیازی حیثیت حاصل کر چکے تھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کے علمی کمالات کا زمانہ اپنے استاد کی وفات کے بعد سے شروع ہوتا ہے، ان کا سب سے پہلا بڑا علمی کارنامہ ارض القرآن ہے جس کی پہلی جلد ۱۹۱۷ء میں شائع ہوئی، اس کتاب کا شائع ہونا تھا کہ ہر طرف سے سیّد صاحب پر تحسین و آفرین کی بارش ہونے لگی، مرحوم شرر نے تو جوشِ تعریف میں یہاں تک لکھ دیا کہ علمی تحقیق میں سیّد صاحب اپنے استاد سے بھی بڑھ گئے ہیں، یہ پہلا موقع تھا کہ میرے کان سیّد صاحب کے نام سے آشنا ہوئے، جبکہ امرت سر کے اخبار وکیل میں ارض القرآن پر ایک تبصرہ شائع ہوا تھا، اس کتاب کی تالیف کے سلسلے میں بعض عربی کتابوں کے سمجھنے کے لئے سیّد صاحب نے عبرانی زبان میں کچھ درک حاصل کیا، ارض القرآن کی دو جلدوں کی اشاعت کے بعد سیّد صاحب

کی علمی فتوحات کا سلسلہ برابر جاری ہے، ان متعدد مقالوں کے علاوہ جو سید صاحب نے دارالمصنفین کے رسالہ معارف میں لکھے ہیں وہ مستقل کتابوں کی تصنیف میں مصروف رہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے اُستاد مرحوم کی وصیت کی تعمیل بھی کرتے رہے چنانچہ سیرۃ النبیؐ کی پہلی دو جلدوں کو چھوڑ کر جو بہت حد تک شبلی کی لکھی ہوئی ہیں باقی چار جلدیں سید صاحب کی ذاتی کوشش اور محنت کا نتیجہ ہیں، اگر سچ پوچھئے تو اب اس کی حیثیت ایک اچھی خاصی انسائیکلو پیڈیا کی سی ہے، میں پہلے عرض کر آیا ہوں کہ شبلی کو سیرت کی تکمیل کی حسرت رہ گئی، ان کی زبردست خواہش تھی کہ عجم کی مدح اور عباسیوں کی داستان سرائی کے بعد وہ دربار رسالت کا ایک ایسا مرقع دنیا کے سامنے پیش کریں جس کی مثال صدیوں تک نہ مل سکے لیکن سخت افسوس ہے کہ موت کے آہنی پنجے نے انھیں اس کی مُہلت نہ دی، نہ معلوم شبلی کی روح اس کارنامہ سے مطمئن ہے یا نہیں لیکن یہ امر واقع ہے کہ بعض اہل علم کے نزدیک دوسری جلد کے بعد سیرۃ النبیؐ سیرت کی کتاب نہیں رہی بلکہ علم الکلام کی ایک کتاب بن کر رہ گئی ہے، تیسرے حصّے کو ملاحظہ کیجئے، یہ پورے کا پورا معجزہ کے امکان اور چھوٹے بڑے معجزات کی نذر کر دیا گیا ہے، یقیناً شبلی کی کاوش کا مصرف کچھ اور ہوتا خاص طور پر جبکہ وہ کلام جدید میں معجزات پر بحث بھی کر چکے تھے، مسئلہ کے اس پہلو سے الگ ہو کر دیکھیں تو تیسری جلد میں معجزات کی بحث بڑی دلچسپ ہے ع

در کفی جام شریعت در کفی سندان عشق

ایک طرف انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کی تسکین اور تشفی پیش نظر ہے تو دوسری طرف علمائے کرام کے چیں بہ جبیں ہونے کا خوف دامن گیر ہے، اس کش مکش کا نتیجہ ظاہر ہے، فلسفۂ جدیدہ کے سلسلے میں فلسفی

مولوی عبد الباری ندوی سے مدد لی گئی ہے لیکن ان دونوں سے زیادہ دلچسپ باب وہ ہے جس میں سید صاحب نے قرآن اور معجزہ کے مسئلہ پر بڑی دل کش اور اطمینان بخش بحث کی ہے، اب اس کے بعد بڑے بڑے معجزات کی باری آتی ہے مثلاً شق القمر اور معراج، سید صاحب نے مدلّل طریقے پر معراج کا روحانی ہونا بیان کیا ہے لیکن تھانہ بھون کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے کے بعد وہ اپنی رائے سے رجوع کر چکے ہیں، چوتھی جلد میں منصب نبوّت اور عقائد سے بحث کی گئی ہے، پانچویں جلد میں رسولؐ مقبول کی عبادات و معاملات کو نہایت خوبی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور چھٹی جلد ہمارے آقائے نامدار کے اخلاق کی پُرلطف تصویر سے آراستہ ہے۔

سیرۃ النبیؐ کی تکمیل کے ساتھ ساتھ سید صاحب نے ہمارے علمی سرمایہ میں اور گرانقدر اضافے بھی کیے، امام مالک اور حضرت عائشہ رضؓ صدّیقہ کے سوانح حیات مرتب کئے، بمبئی کی اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن نے عربوں کی جہازرانی پر ان کے فاضلانہ مقالے کتابی صورت میں شائع کیے، صوبجات متحدہ کی ہندوستانی اکیڈیمی کی سرپرستی میں عرب و ہند کے تعلّقات پر سید صاحب نے اپنی محققانہ تالیف شائع کی، یہ کتاب موضوع کی نوعیت کے اعتبار سے بہت مفید معلومات کی حامل ہے، سید صاحب پہلے محقق ہیں جنہوں نے اُردو زبان میں اس موضوع کے مختلف گوشوں پر بیش قیمت معلومات کو بڑی تحقیق اور قابلیت کے ساتھ پیش کیا ہے، اس کتاب میں بعض حد درجہ ضعیف اور کمزور چیزیں بھی آگئی ہیں مثلاً حضرت شہر بانو کا ہندستانی ہونا یا کوروں اور پانڈوں کا آپس میں عربی زبان میں بات چیت کرنا، ان تصانیف سے قطع نظر خیام پر سید صاحب کی تالیف ایک ایسا شاندار کارنامہ ہے جس پر

اُردو زبان بجا طور پر فخر کرسکتی ہے، اس پر سید صاحب نے مستشرقین کی تحقیقات کے ساتھ ساتھ اپنی ذاتی تحقیق و کاوش کے نتیجے اہل نظر کے سامنے پیش کئے ہیں اور خیام کا مرتبہ ایک فلسفی اور ریاضی کی حیثیت سے متعین کرنے کی کوشش کی ہے، اس کتاب میں سید صاحب نے قوت تخیل سے بہت کم کام لیتے ہوئے تحقیق کے دوران میں پھونک پھونک کر قدم رکھا ہے، خود سید صاحب کو اس کتاب پر ناز ہے میری ناقص رائے میں سید صاحب کی یہ بہترین تصنیف ہے، بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مشرق و مغرب کی کسی زبان میں خیام پر اتنی جامع اور محققانہ کتاب نہیں لکھی گئی، شاید بعض لوگ یہ کہہ اٹھیں کہ مرحوم پروفیسر شیرانی نے رباعی کے سلسلہ میں سید صاحب کے بعض نتائج فکر سے اختلاف کیا ہے، یہ اعتراض بالکل بجا ہے، رباعی کے بارے میں سید صاحب کے اکثر و بیشتر بیانات محل نظر ہیں تاہم اس خامی کے باوجود خیام اُردو ادب میں ایک گرانقدر اضافہ ہے۔

سید صاحب کے علمی کمالات اس بات کے بہترین ضامن ہیں کہ شبلی جیسے نادرۂ روزگار کی سوانح عمری لکھنے کی صلاحیت ان میں بدرجۂ اتم موجود ہے وہ ان تمام وادیوں کی سیر کر چکے ہیں جن کی شبلی نے برسوں سیاحی کی، اسلامی تاریخ اور علم کلام میں ان کے علمی تبحر سے کون انکار کرسکتا ہے، شبلی کی زندگی میں ہی افتخار عالم مارہروی نے چاہا کہ ان کے سوانح حیات مرتب کریں، لیکن شبلی اس پر راضی نہ ہوئے، ان کی وفات کے بعد خود ان کے شاگردوں میں سے مولوی عبدالسلام صاحب ندوی نے کوشش کی لیکن ان کے مرتب کردہ مجموعہ میں زندگی کی روح نہ تھی اس لئے شبلی کے ایک اور عقیدت مند شاگرد اقبال احمد صاحب سہیل نے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے

کی کوشش کی لیکن یہ کوشش بھی ناتمام رہی، آخر سید صاحب آگے بڑھے اور چند سال روز و شب کی محنت کے بعد وہ حسن و خوبی کا ایک صحیفہ تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

حیات شبلی کے ماخذ علمی تبحر کے علاوہ سید صاحب کو اپنے دس گیارہ سال کے تعلقات کی بناء پر بھی شبلی کے سوانح نگار بننے کا استحقاق حاصل ہے، اپنے اُستاد کے محاسن اور معائب دیکھنے کا انھیں پورا موقع ملا ہے اس لیے قدرتی طور پر ان سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ شبلی کی ایک صحیح، سچی اور مکمل تصویر پیش کریں گے، ان کا دعویٰ ہے کہ لفظ و معنی کی رنگ آمیزی سے انھوں نے سچی اور اصلی تصویر تیار کی ہے، سید صاحب نے تحقیق و جستجو میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا، ذاتی معلومات، شبلی کے اعزہ و اقربا سے استفسار اور ان کے بعض دوستوں اور شاگردوں کے بیانات سے کافی فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ علی گڈھ گزٹ اور الندوہ کے پرانے پرچے اور ندوۃ العلماء اور ایجوکیشنل کانفرنس کی رودادیں بھی اس سلسلہ میں مفید ثابت ہوئی ہیں، شبلی کے اُردو اور فارسی کلام کے مجموعوں سے بھی بعض مواقع پر استفادہ کیا گیا ہے، سب سے بڑا ماخذ مکاتیب شبلی کی دو جلدیں ہیں جنھیں خود سید صاحب نے مرتب کیا ہے، یہ خطوط شبلی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بہت کافی روشنی ڈالتے ہیں اور چونکہ سید صاحب کا بڑا ذریعہ معلومات یہی خطوط ہیں اس لئے سید صاحب کا ارشاد ہے کہ ایک لحاظ سے حیات شبلی مولانا شبلی کی خود نوشتہ سوانح عمری ہے۔

حیات شبلی کے یہی ماخذ ہیں جن سے سید صاحب نے مواد حاصل کر کے ایک بلند عمارت تیار کر دی ہے، اعتماد اور قدر و قیمت کے اعتبار سے ان ماخذوں کا درجہ مختلف ہے، جہاں تک مکاتیب

شبلی کا تعلق ہے ان کے اندراجات اس وقت تک مورد شک و اعتراض نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ دوسرے ذرائع سے حاصل کیئے ہوئے بیانات سے اختلاف کی کوئی صورت نمودار نہیں ہوتی اسی طرح اعزہ واحباب کے ذریعہ فراہم کردہ معلومات پر بھی شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ کیونکہ ان کا تعلق نجی یا خاندانی معاملات سے ہے لیکن جب دو یا دو سے زیادہ بلند مرتبہ شخصیتیں معرض بحث میں ہوں اس وقت اس قسم کی روایتیں قبول کرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، مثال کے طور پر شبلی کے سرسید احمد سے اختلافات کی داستان لیجئے، اس سلسلہ میں اقبال احمد سہیل ہوں یا سجّاد حیدر مرحوم ان کی زبانی شہادت پر ایمان لانا ذرا مشکل کام ہے، سرسید احمد دعا کی تاثیر کے قائل نہ تھے، اعظم گڈھ کے ایک ہندو پوسٹ ماسٹر نے ان کے خیالات کی تردید بڑے مدلّل طریق پر کی لیکن سرسیّد کے حلقہ میں شبلی پر اس رسالہ کے مصنّف ہونے کا شبہ کیا گیا، اس شاذ روایت کے تنہا راوی اقبال احمد صاحب سہیل ہیں، اور کسی دوسرے ماخذ سے اس کی تائید یا توثیق نہیں ہوتی، سجّاد حیدر یلدرم کی سند پر سید صاحب نے شبلی سے عدم قابلیت کے بہانے سے کالج کے بعض درجے چھینے جانے کا ذکر کیا ہے، یہ اور اس قسم کی کئی اور روایات ہیں جن کا شمار شاذ کے زمرے میں ہے، ان زبانی روایتوں کے قبول کرنے میں احتیاط اس لئے ضروری ہے کہ بعض اوقات بڑے بڑے ثقہ راویوں کے بیانات میں اس درجہ تضاد پایا جاتا ہے کہ اچھے اچھے لوگ ان کے قبول یا انکار کرنے میں ہچکچاتے ہیں؛ مثال کے طور پر شبلی اور مفتی عبداللہ ٹونکی کا واقعہ ذہنی کشمکش کا آئینہ دار ہے، مفتی صاحب نے کئی بار شبلی سے درس بخاری بند

کر دینے پر اپنی مجبوری بیان کی لیکن بعد میں مفتی صاحب صاف انکار کر گئے [۱]۔ اسی طرح دوسرا واقعہ مولوی عبدالکریم کی چند روزہ معطلی کا ہے، مولانا عبدالباری فرنگی محلی اس معاملہ میں مولانا شبلی کے ہم نوا تھے لیکن جب اخبارات میں اس پر لے دے ہوئی تو مولانا عبدالباری نے اس فیصلہ سے اپنی بیزاری ظاہر کی یہاں تک کہ شبلی کو ان کے بیان کی تردید کرنا پڑی، اب جب اتنے بڑے بڑے مقدسین ایک ہی واقعہ کے سلسلہ میں اس درجہ متضاد بیانات شائع کریں تو بیچارے سادہ دل لوگ کس کی بات پر ایمان لائیں اور کس کے بیان کو ٹھکرائیں، مولانا شبلی کی تحریروں اور اشعار کی حیثیت بھی ایک فریق کے بیان کی سی رہ جاتی ہے جب نزاعی امور زیر بحث ہوں، مختلف میدانوں میں شبلی نے نبرد آزمائی کی ہے اور بعض اوقات ان کے حریف بڑے سخت کمان تھے جنھوں نے شبلی کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا، اندریں حالات ہمیں معاملہ کے مالہٗ و ما علیہ پر پوری طرح غور کرنے کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیئے، حیات شبلی کی تالیف کے دوران میں منشی محمد امین زبیری نے سید صاحب کی کافی حد تک امداد کی لیکن بعض صورتوں میں سید صاحب کے جادۂ عدل سے انحراف نے ان ہی منشی صاحب کو سید صاحب کے بعض بیانات کی تردید کرنے پر مجبور کر دیا۔

حیات شبلی کا درجہ بطور سوانحعمری کے اُردو زبان کی شاید سب سے پہلی محققانہ سوانحعمری حیات سعدی ہے، اس کے بعد مولانا حالی نے یادگار غالب لکھی لیکن ان دونوں کتابوں کے متعلق حالی کا یہ کہنا تھا کہ

---

[۱] حیات شبلی صفحہ ۶۶۵، شبلی کے اصلی الفاظ یہ ہیں:- "اب اگر مولانا موصوف (مفتی عبداللہ ٹونکی) ان واقعات سے منکر ہوں تو خدا اے عالم الغیب کے سوا اور کون اس کا فیصلہ کرنے والا ہے؟"

انھوں نے کہیں پھوڑوں کو ٹھیس لگنے نہیں دی اور ان بزرگوں کے معائب اس لیے بیان نہیں کیے کہ لوگ شاید اس قسم کی تلخ مگر سچّی باتیں سننے کے لئے تیار نہیں، حیات جاوید کے دیباچہ میں حالی نے صراحتہً لکھا ہے کہ سرسید کے بارے میں وہ اس قسم کی احتیاط روا نہ رکھیں گے اور رکھی بھی کیوں جاتی جبکہ خود سرسید تنقید کے حامیوں میں سے تھے! اور ان کی تنقید کی زد سے بڑے بڑے بزرگ نہیں بچ سکے جس محنت، جانفشانی اور قابلیت کے ساتھ حالی نے حیات جاوید لکھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے نکتہ چینوں کی رائے میں بھی وہ "اردو کی بہترین سوانحعمری" ہے حیات جاوید اس وقت شائع ہوئی جب شبلی علی گڈھ اسکول سے قطع تعلق کر چکے تھے اور بعض اسباب کی بنا پر سرسید اور ان کے دبستان خیال کے کھُلّم کھُلّا مخالف ہو چکے تھے، ظاہر ہے کہ ان حالات میں انھیں مولانا حالی کی حد سے بڑھی ہوئی عقیدتمندی کیونکر گوارا ہو سکتی تھی چنانچہ انھوں نے اپنے خطوط میں اس کو "مدلّل مدّاحی" اور "کتاب المناقب" کہہ کر پکارا ہی حیات جاوید کے وہ اس پہلو سے کہ اس میں سرسید کی خامیاں اور کمزوریاں اچھی طرح بیان نہیں کی گئیں اس درجہ ناخوش تھے کہ جہاں کہیں انھیں موقع ملا انھوں نے اس پر نکتہ چینی کی، مناقب عمر بن عبدالعزیز پر ریویو[۱] ہو یا مُلّا عبدالباقی نہاوندی کی مآثر رحیمی پر تبصرہ[۲] انھیں اس بات کی شکایت

---

[۱] مقالات شبلی جلد چہارم صفحہ ۵ و ۶

[۲] ایضاً ایضاً صفحہ ۸۱ .... "لیکن اس طریقہ کو ہم آج کل کے پُر فریب طریقے سے زیادہ پسند کرتے ہیں جس میں راست نویسی اور تنقید کا بہت کچھ دعویٰ کرکے بھی سوانحعمری کے بجائے مناقب کی کتاب لکھی جاتی ہے ...... بہتر سے بہتر سوانحعمری جو ہماری زبان میں لکھی گئی ہے اس طریقے کی عمدہ مثال ہے"

ہے کہ ہمارے سوانح نگار معائب بیان کرنے میں بخل سے کام لیتے ہیں اور اگر کہیں ایک دو معمولی کمزوریوں کا ذکر کر بھی دیتے ہیں تو وہ اس لیے تاکہ ان کے ہیرو کی خوبیاں اور اجاگر ہوں، اس سلسلہ میں وہ اُردو کی بہترین سے بہترین سوانحعمری کی طرف اشارہ کرتے ہیں، ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ روی سخن حیات جاوید کی طرف ہے۔

آیئے دیکھیں کہ حیات شبلی بھی کہیں مولانا شبلی کی نکتہ چینی کا نشانہ تو نہیں بنتی لیکن بیشتر اس کے کہ مسئلہ کے اس پہلو پر غور کیا جائے اس کتاب کا تعارف اور اس کے محاسن کا تذکرہ بہت ضروری ہے، بقول سیّد سلیمان صاحب حیات شبلی محض ایک شخص کی سوانحعمری نہیں بلکہ مسلمانوں کے پچاس سالہ علمی، قومی، ادبی، تعلیمی اور سیاسی واقعات کی تاریخ ہے، اسی قسم کا دعویٰ حیات جاوید کے متعلق بھی بلا خوف تردید کیا جا سکتا ہے اس لیے کہ حیات جاوید ایک فرد واحد کی سرگزشت نہیں بلکہ مملکت ہند میں ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد مسلمانوں کی قومی سیاسی ادبی اور تعلیمی زندگی کی تاریخ ہے، سر سیّد کی حیثیت قافلہ سالار کی تھی اور باقی بزرگ جن میں شبلی بھی شامل ہیں اس سردار قوم کے ممتاز ساتھی تھے ایک حد تک شبلی اور سر سید میں مماثلت پائی جاتی ہے، شبلی کی شخصیت بھی مختلف حیثیتوں کی حامل ہے، وہ بیک وقت مورخ، ادیب، شاعر، ناقد، متکلم، ماہر تعلیم اور سیاست داں تھے اور ان کی خداداد قابلیت کسی ایک گوشہ تک ہی محدود نہ تھی، اگرچہ سر سیّد کی طرح انھوں نے عملی سیاست میں کوئی حصہ نہیں لیا اور نہ ہی وہ کانگرس کے باقاعدہ رکن کبھی بنے تاہم انھوں نے اپنی قوت تحریر اور شاعرانہ قابلیت کے جوہر مسلمانوں کے لئے صحیح قسم کی سیاست کی راہ متعین کرنے کے سلسلہ میں دکھائے مسلمانوں کی تعلیم سے خواہ وہ جدید ہو یا قدیم انھیں

ایک خاص دل چسپی تھی اور یہی وجہ تھی کہ تعلیمی اسکیموں کے بنانے ، درسی نصاب کی اصلاح کرنے اور عربی وفارسی کی اہمیت ثابت کرنے میں انھوں نے نمایاں حصہ لیا، سیاسی حالات کے بدلنے سے جو صورت حال پیدا ہو گئی تھی اس کے پیش نظر ان کی دور بین نگاہ قومی مقصد کے متعین کرنے میں بہت مفید ثابت ہوئی، ان کی تصانیف نے مسلمانوں کو نہ صرف ان کی پرانی عظمت یاد دلائی بلکہ بعض مستعد نوجوانوں کے دلوں میں تحقیق اور تلاش کی امنگ بھی پیدا کر دی، ان کی شاعرانہ نوا سنجیوں نے ایک غلغلہ بلند کر دیا، ان کی قوت تنقید کی بدولت شعر العجم جیسی کتاب کا اُردو میں اضافہ ہوا۔ قومی انجمنوں خاص طور پر مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور ندوۃ العلماء کے اجلاسوں میں ان کی تقریر کی ساحری نے ہزاروں دلوں کو مسحور کیا، غرض قومی زندگی کے ہر شعبے میں شبلی کا معتدبہ حصہ تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کے سوانح نگار کو ان کے عہد کی سیاسی، قومی، علمی اور ادبی تاریخ بیان کرنے کی ضرورت پڑی اگر ہم اس حقیقت کو پیش نظر رکھیں تو لامحالہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ حیات شبلی اُردو زبان میں ایک گرانقدر اضافہ ہے، چونکہ شبلی بلاد مشرق یعنی پورب کے رہنے والے تھے اس مناسبت سے سید صاحب نے وہاں کے علماء و فضلاء کی مفید اور دلچسپ داستان بڑی محنت اور عرق ریزی کے ساتھ مرتب کی ہے اس مفصل داستان کے مفید ہونے میں کوئی کلام نہیں لیکن اس کی تفصیل اور درازی شائد بعض طبائع پر گراں گزرے سید صاحب نے حتی المقدور کوشش کی ہے کہ ایک عقیدتمند شاگرد کی حیثیت سے اپنے استاد کی ہنگامہ خیز زندگی کا ایک زندہ اور جاندار مرقع تیار کریں اسی لیے بعض اوقات انھیں جزئی تفصیلات میں جانا پڑا ہے تاکہ ایک مسئلہ کے تمام پہلو قارئین کے سامنے پیش کئے

جا سکیں، شبلی کے خاندانی حالات، ان کی تعلیم کی کیفیت، مولوی محمد فاروق چریا کوٹی جیسے اُستاد سے استفادہ، ان کے ابتدائی مشاغل اور رجحانات ان کی چند روزہ وکالت اور کچہری میں ملازمت پر نہایت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ علی گڈھ میں ان کے علمی کارناموں اور مدرسہ ندوۃ العلماء میں ان کی تعلیمی اصلاحوں کو بڑی خوبی سے بیان کیا گیا ہے جن حالات نے مولانا شبلی کو ریاست حیدر آباد میں ملازمت اختیار کرنے پر مجبور کیا ان کا مفصل ذکر کتاب میں موجود ہے، آخر میں ان کے اخلاق و عادات کا تفصیلی تذکرہ درج کتاب ہے، خود سید صاحب کو کتاب کی طوالت کا احساس ہے چنانچہ کتاب کے دلکش خاتمہ میں لکھتے ہیں:۔

"ناظرین! آپ نے نو سو صفحوں تک میری رفاقت کی اس اثناء میں آپ کے اس شریک سفر اور رفیق نظر نے ایک مجسمۂ علم و فن اور پیکر خدمت دین و ملّت کی زندگی کا مرقّع جیسا کہ اس نے دیکھا یا دیکھنے والوں نے بتایا کھینچ کر آپ کے سامنے پیش کیا، اس مرقع میں کہیں کہیں بشری کمزوری کی چھائیاں بھی ہوں گی لیکن مجموعی طور سے حسن و جمال کا ایک غیر معمولی منظر بھی تصوّر کی آنکھوں کے سامنے ہوگا، آیئے ہم اور آپ اس کی دُعا کے لئے ہاتھ اٹھائیں اور زبان سے کہیں

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَہٗ وَ ارْحَمْہُ

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را"

اس حُسن و جمال کے پیکر میں سید صاحب کی نظر بعض بشری کمزوریوں پر بھی پڑتی ہے، آیئے، دیکھیں کہ وہ کون سی بشری کمزوریاں ہیں جن کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ اسی نکتہ پر اس فیصلہ کا انحصار ہے

کہ حیات شبلی کہاں تک مدلل مداحی اور کتاب المناقب ہے، کیا یہاں بھی اسی بات کا اعادہ نہیں کیا گیا جسے شبلی سخت ناپسند کرتے ہیں یعنی ہیرو کے دو چار معائب محض اس لئے بیان کئے جائیں تاکہ اس کے محاسن اور اجاگر ہوں؟ شبلی کی جن خامیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے ان میں سرفہرست روحانیت کی کمی ہے، سید صاحب کو "اس[۵۱] اظہار میں کوئی پردہ نہیں کہ مولانا میں وہ پابندی و اتقا اور مذہبی تورع و تقدس جو علمائے دین کا خاصہ ہے نہیں تھا" حالانکہ وہ ایک دوسرے مقام پر نہایت صراحت کے ساتھ لکھتے ہیں[۵۲]:- "خود فرائض و سنن کے سخت پابند تھے اور دوسروں سے نہایت سختی کے ساتھ ان کی پابندی کراتے تھے...... دوسرے فرائض کا بھی نہایت شدت سے اہتمام کرتے تھے" ندوہ میں جس سادہ طریق پر شبلی زندگی گزارتے تھے اس کی تصویر سید صاحب کے قلم نے یوں کھینچی ہے[۵۳]:- مولانا کا پورا اثاثہ یہیں تھا، یہی خواب گاہ یہی ملاقات کا کمرہ یہی دارالمطالعہ اور یہی کھانے کا کمرہ، یہی مہمان خانہ سب تھا، ایک طرف پلنگ پر بستر تھا، باقی دری تھی جس پر وہ خود اور آنے جانے والے بیٹھتے تھے، مجھے بارہا حیرت ہوتی کہ وہ ہستی جس کے آوازہ سے سارا ہندستان معمور ہے وہ کیونکر ایک چھوٹے سے کمرہ میں زندگی گزار رہا ہے اور اس خوبی سے کہ خود باغ و بہار، جو پاس بیٹھے وہ بھی شگفتہ ہو کر جائے، اور ان کا اثاثہ کیا تھا بستر اور کپڑوں کا ایک بکس، چائے کا مختصر سامان، لکھنے پڑھنے کی ایک میز اور دو کرسیاں، باہر کچھ مونڈھے اور بس، غرض ان کی زندگی گویا حدیث نبوی کن فی الدنیا کانّک غریبٌ اَوْ کعابرِ سَبِیل (دنیا میں تم

---

[۵۱] حیات شبلی صفحہ ۶۲۸ [۵۲] ایضاً صفحہ ۸۱۴
[۵۳] ایضاً صفحہ ۳۹ - ۷۳۸

ایسے رہو گویا مسافر ہو یا راہ سے گزر رہے ہو) کے مطابق تھی" سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ایسا شخص جو فرائض اور سنن کا پابند ہو اور جس کی سادہ زندگی حدیث نبوی کے مطابق ہو روحانیت سے عاری کیونکر ہو سکتا ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ سیّد صاحب کو شبلی کی تصنیفات میں بھی روحانیت کی کمی نظر آتی ہے اور تو اور شبلی کا شاہکار الفاروق بھی اس اعتراض سے بچ نہیں سکا، چنانچہ سیّد صاحب فرماتے ہیں کہ[۵۱] "الفاروق کی نسبت یہ کہنا سچ ہے کہ اس میں حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کی روحانی زندگی کا خاکہ پوری طرح نہیں ابھارا گیا ہے"

۱۹۱۳ء میں ندوہ سے الگ ہونے کے بعد شبلی نے مولوی حمید الدین کے نام ایک خط میں یہ خواہش ظاہر کی کہ ان دونوں کو مل کر اعظم گڈھ یا سرائے میر کے مدرسہ پر اپنی تمام کوشش مرکوز کر دینی چاہیئے تاکہ وہ درس گاہ گورو کل کی طرح ہو، سید صاحب نے اس پر جو رائے ظاہر کی ہے اس میں پھر قارئین وہی روحانیت کی کمی کی طرف ایک باریک اشارہ پائیں گے چنانچہ سیّد صاحب لکھتے ہیں:[۵۲] ......" اس کی حقیقی کامیابی کے لئے خود بانی کی زندگی اور نقطۂ نظر میں جو اصلی تبدیلی چاہیئے تھی وہ ہنوز پوری طرح پیدا نہیں ہوئی تھی، اس کے لئے وقت درکار تھا، اس کے لیے گورو کل پر جذبۂ رشک سے ہٹ کر خود صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور اپنے بزرگان دین اور ائمہ ہدیٰ کی نظیریں سامنے رہنی چاہیئے تھیں، مولانا نے اشاعت و تبلیغ اسلام کے کاموں میں جتنی کوششیں بھی فرمائیں ان کی تہہ میں یہ کمی ہمیشہ محسوس ہوتی رہتی" ایک طرف مولانا شبلی کو فرض و سنّت کا پابند بتایا جاتا ہے اور دوسری طرف ان میں روحانیت کی کمی کو بار بار بیان کیا جا رہا ہے، آخر سید صاحب

---

[۵۱] حیات شبلی دیباچہ صفحہ ۴۲ [۵۲] ایضاً صفحہ ۵۷۵،

کے بیانات میں اس درجہ تضاد کیوں پایا جاتا ہے، اس تضاد کی نشوونما تھانہ بھون کی مقدس سرزمین میں ہوتی ہے، مولانا اشرف علی تھانوی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے کے بعد سید صاحب کے نقطۂ نظر میں ایک غیر معمولی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے، وہ اب ہر چیز کو روحانیت کے پیمانہ سے ناپنے کے لئے بیتاب ہیں اور جہاں ان کو اپنے پیر و مرشد کے مسلک سے ذرا سا انحراف بھی نظر آتا ہے ان کا اعتراض اس پر موجود ہے خواہ یہ انحراف ان کے استاد شبلی میں ہی کیوں نہ پایا جائے شبلی کی زندگی میں بھی بعض معترض روحانیت کی اس کمی پر زور دیا کرتے تھے لیکن شبلی کے نزدیک اس اصرار کی حقیقت محض ریاکاری تھی چنانچہ ایک صاحب کو لکھتے ہیں:[1] "آج کل کے ریاکاروں نے دوسروں سے بدگمان کرنے کے لئے بہت سے الفاظ تراشے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ فلاں شخص میں روحانیت نہیں، فلاں شخص عالم ہے لیکن دیندار نہیں لیکن ان ہی دینداروں کو مہینوں دیکھا ہے کہ نماز فجر کبھی نصیب نہیں ہوئی، باوجود اس کے ان کی دینداری اور روحانیت میں ذرہ بھر فرق نہیں آتا" شبلی کے یہ الفاظ جس طرح ان کے اپنے زمانے کے لئے درست تھے اسی طرح آج بھی درست ہیں، کیا سید صاحب بتا سکتے ہیں کہ شبلی کے رفقائے کار میں سے کتنے جنید و ذوالنون تھے، واقعہ یہ ہے کہ شبلی کے خلاف یہ تمام ہنگامہ آرائی ان حضرات کی طرف سے تھی جو مسلک آبا پر سختی کے ساتھ گامزن تھے اور زمانے کے تقاضوں سے بے خبری کے باعث اس مسلک میں کسی قسم کی تبدیلی کے لیے تیار نہ تھے، سید صاحب کے نزدیک شبلی کی سیرت کی سب سے بڑی خامی روحانیت اور تقدس کی کمی تھی لیکن ان کی یہ رائے اپنے محسن استاد

---

[1] حیات شبلی دیباچہ صفحہ ۱۴

کے بارے میں تھانہ بھون کا فیض ہے ورنہ اس سے پہلے وہ شبلی کو روحانیت سے اس درجہ بیگانہ نہیں پاتے تھے، جب سیرۃ النبیؐ کی پہلی جلد شائع ہوئی تو سرورق پر مولانا شبلی کے نام کے پہلے حجتّ الملّت والدینؒ[1] کے معزز لقب کا اضافہ کیا تھا، حجتّ الاسلام کے لقب سے امام غزالی ممتاز ہیں، شبلی کی وفات پر جو مضمون ان کے ارشد تلامذہ کے قلم سے شائع ہوا اس کا ایک ٹکڑا ہمارے نقطۂ نظر کا موید ہے، جس مبالغہ آمیز انداز میں سید صاحب نے شبلی کی تعریف کی ہے اس کے ساتھ شاید ہی کسی انصاف پسند کو اتفاق ہو سکتا ہے:-

"ہندستان کی سیر حاصل زمین نے فقہ و حدیث میں صغانی، علی متقی شیخ عبدالحق، کلام و اسرار شریعت میں بحر العلوم اور شاہ ولی اللہ ادب و معانی میں عبدالمقتدر، ملک العلماء اور ملا محمود، فلسفہ و منطق میں ملاّ نظام الدّین اور ملاّ محب اللہ ادب و شاعری میں مسعود سلمان، خسرو اور فیضی، تاریخ میں برنی، ابوالفضل آزاد بلگرامی کو پیدا کیا لیکن اس کی آغوش کا آخری فرزند (شبلی) وہ تھا جو عبدالحق بھی تھا اور شاہ ولی اللہ بھی، ملاّ محمود بھی تھا اور فیضی بھی، محب اللہ بھی تھا اور آزاد بھی اور کم از کم وہ یگانہ انفراداً ان میں سے اکثر کے برابر اور مجموعاً ان میں سے اکثر سے بہتر تھا"

سید صاحب کا یہ بیان پڑھ کر آدمی ششدر رہ جاتا ہے، بھلا

---

[1] ۱۹۴۸ء میں سید صاحب اپنے استاد محترم کو الاستاذ المورخ الامام کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو امام ابن تیمیہ کی الرّد علی المنطقیین کا عربی مقدمہ) لیکن ۱۹۱۶ء میں وہ اپنے استاد کو "دعد تجدید و اصلاح میں ہندوستان کے مجدّد اعظم" کے معزز لقب سے یاد کرتے ہیں (معارف دسمبر ۱۹۱۶ء)

حدیث اور اسرار شریعت میں شبلی کو شیخ عبدالحق اور شاہ ولی اللہ سے کیا نسبت، صغانی کے علم و فضل کی بہترین شاہد اس کی عربی لغت پر دو ضخیم کتابیں العباب اور مجمع البحرین ہیں، مسعود سعد سلمان اور امیر خسرو اقلیم سخن کے تاجدار ہیں، ان کے مقابلہ میں شبلی کا نام لینا انصاف کا خون کرنا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب اپنے ممدوح کی تعریف کرتے وقت مبالغہ طرازی سے اجتناب نہیں کرتے، ۱۹۱۹ء میں "نظر بندان اسلام" کے عنوان سے انھوں نے ایک سلسلہ مضامین معارف میں لکھا، ضروری تھا کہ اس مضمون میں مولانا ابوالکلام آزاد کا تذکرہ بھی کیا جاتا، مولانا آزاد کے علمی تبحر، اصابت رائے اور بلندیٔ فکر کے قائل ان کے معتقد ہی نہیں بلکہ نکتہ چیں بھی ہیں لیکن جس انداز میں سید صاحب نے ان کی تعریف کی ہے اسے دیکھ کر تعجب ہوتا ہے سید صاحب کا شاعرانہ مبالغہ ملاحظہ ہو فرماتے ہیں[۵۱] "ان سطروں کے لکھتے وقت ہم کو یہ دھوکہ ہو رہا ہے کہ کیا میں خود ابن تیمیہ اور ابن قیم یا شمس الائمہ سرخسی یا امیۃ بن عبدالعزیز اندلسی کے حالات تو نہیں لکھ رہا ہوں۔" امام ابن تیمیہ کس پایہ کے بزرگ تھے اس کا اندازہ مولانا ابوالکلام کے تذکرہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ ابن تیمیہ کے متعلق بعض غلط فہمیوں کا ازالہ اور ان کے علمی کمالات کا تعارف ایک بڑی حد تک مولانا ابوالکلام کے زور قلم کا نتیجہ ہے کوئی تعجب نہیں اگر علامہ شبلی بھی مولانا آزاد کے زیر اثر امام ابن تیمیہ کے کمالات کے قایل ہوئے ہوں، شبلی کی اس رائے کے بعد کہ "مجھے[۵۲] اس شخص (ابن تیمیہ) کے سامنے رازی و غزالی سب ہیچ نظر آتے ہیں" سید صاحب کا مندرجۂ بالا بیان مبالغہ و اغراق کی بہت اچھی مثال ہے)

---

۵۱ معارف مارچ ۱۹۱۹ء ۵۲ حیات شبلی صفحہ ۸۳۰

روحانیت کی کمی کے علاوہ شبلی کی جن خامیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے
ان کا تعلق شبلی کی سیرت سے زیادہ ان کی تصانیف اور آراء سے ہے
مثلاً الغزالی، سوانح مولانا روم، علم الکلام اور الکلام میں سید صاحب
کو دو کمیاں محسوس ہوتی ہیں (۱) جدید علوم کے متعلق مولانا شبلی کی معلومات
ثانوی اور سرسری تھیں (۲) کتاب و سنت کے بجائے متکلمین اور حکمائے
اسلام کی کتابوں کی طرف رجوع کیا گیا، پہلی کمی کے بارے میں سید صاحب
کا ارشاد بجا ہے لیکن جن مباحث پر علم الکلام اور الکلام حاوی ہیں ان کی
تلاش اگر متکلمین اور حکمائے اسلام کی تصنیفات میں نہ کی جاتی تو کہاں کی
جا سکتی تھی، الفاروق میں سید صاحب کے نزدیک ایک خامی تو یہ
ہے کہ "اس میں حضرت عمرؓ کی روحانی زندگی کا خاکہ پوری طرح نہیں
اُبھارا گیا ہے" دوم "اس میں بعض اغلاط کا وجود اور بعض جوابی
نظریوں کی کمزوری بھی مصنف کی بشریت کی حامل ہے"[۵۱] اسی طرح،
دیباچے کے صفحہ ۴۸ کے حاشیہ میں الغزالی میں احیاء العلوم کے ایک
غلط حوالے کی طرف سید صاحب اشارہ کرتے ہیں،
سرسید کی مدح میں شبلی نے ایک قصیدہ عربی میں لکھا تھا جس
میں سید صاحب کے خیال میں "فن[۵۲] کی بعض کمزوریاں" ہیں، شبلی
نے تین چار صفحوں کا ایک مضمون "خلافت" پر علی گڑھ کالج میگزین میں
لکھا جس میں انھوں نے یہ بتانا چاہا کہ ترکوں کا دعوائے خلافت قابل
تسلیم نہیں، سید صاحب کی رائے میں شبلی کا یہ مضمون آورد تھا آمد
نہ تھا،[۵۳] ۱۹۰۸ء میں شبلی نے الندوہ میں ایک مضمون لکھا کہ "مسلمانوں[۵۴]
کو غیر مذہب حکومت کا محکوم ہو کر کیونکر رہنا چاہیے" اس مضمون کو
سید صاحب اس امداد کی قیمت بتاتے ہیں جو حکومت نے دار العلوم ندوہ[۵۵]

۵۱؎ حیات شبلی دیباچہ ص ۲۱ و ۲۲، ۵۲؎ ایضاً دیباچہ ص ۳۲، ۵۳؎ ایضاً ص ۳۲، ۵۴؎ ایضاً ص ۶۳

کو دینی منظور کر لی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی لکھتے ہیں کہ شبلی نے ردالمحتار کی عبارت کا غلط مفہوم لیا ہے، الکلام میں ایک جگہ شبلی نے لکھا ہے کہ اسلام کا ایک بڑا فرقہ معتزلہ مادہ کو قدیم مانتا ہے، اس کے متعلق سید صاحب کا ارشاد ہے کہ "یہ مولانا کا سہو قلم ہے معتزلہ مادہ کو قدیم نہیں حادث مانتے ہیں۔"

قارئین کرام بشری کمزوریوں کی فہرست ملاحظہ کر کے خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اس قسم کی خامیاں شبلی ایسے جلیل القدر انسان کے لئے کہاں تک موجب منقصت ہو سکتی ہیں، شبلی کی علمی و ادبی عظمت سے بھلا کسے انکار ہو سکتا ہے لیکن جس پیرایہ میں سید صاحب نے اپنے استاد کی برتری اور فوقیت ان کے عظیم المرتبت معاصرین پر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اسے ایک غیر جانبدار اور انصاف پسند شخص کیونکر تسلیم کر سکتا ہے جس قافلہ کے شبلی ایک نامور رکن تھے اس کے سالار یقیناً سر سید احمد تھے لیکن حیات شبلی کے اوراق میں شبلی کو سر سید کا حریف اور مقابل بتایا گیا ہے اور ان کے مابین اختلافات کی ایک لمبی چوڑی فہرست پیش کی گئی ہے، سید صاحب کا قیاس ہے کہ سر سید کی وفات پر شبلی کا مرثیہ نہ لکھنا انہی اختلافات کی وجہ سے تھا، حالانکہ جب تک سر سید زندہ رہے مولانا شبلی ان کے دامن عاطفت کے ساتھ وابستہ رہے کیوں نہ رہتے جبکہ وہ سر سید کی جلالت قدر کے قائل تھے یہ سچ ہے کہ انھوں نے سر سید کے انتقال پر کوئی مرثیہ نہیں لکھا لیکن جس درد انگیز پیرایہ میں انھوں نے اپنے جذبات کا اظہار ایک عربی خط میں کیا ہے وہ کئی مرثیوں سے بڑھ کر ہے، یہ خط نواب علی حسن خاں کے نام لکھا گیا تھا:۔ تضعضعت ارکان الملۃ اعنی انتقل

لـه حیات شبلی دیباچہ صفحہ ۱۲ و ۲۲

السید احمد خان بہادر الی جوار رحمۃ ربہ

و ذالک یوم الاحد ۲۷ مارچ و تفرق شملنا انی لا اقدر

علی ان اشتغل بشئی الا بعد برھۃ من الزمان[1] (قومی

عمارت کے ستون ہل گئے یعنی سید احمد خاں بہادر اپنے پروردگار کے

جوار رحمت میں چلے گئے اور یہ سانحہ یک شنبہ ۲۷ مارچ کو پیش آیا اور

ہماری قوم کا شیرازہ بکھر گیا، میں کچھ دنوں تک کوئی کام نہیں کر سکتا)

ایک مرحوم بزرگ کو اس سے بڑھ کر کیا خراج تحسین ادا کیا جا سکتا ہے

شبلی کی اس تحریر پر مدرسہ ڈابھیل کے مدرس مولوی محمد یوسف بنوری نے

بڑی سخت نکتہ چینی کی ہے اور سرسیّد کے ساتھ ساتھ شبلی کو بھی طعن و اعتراض

کا نشانہ بنایا ہے۔ سیّد صاحب یہ فرض کرنے میں حق بجانب نہیں ہیں

کہ محض اختلاف خیال کی بناء پر سرسیّد اور شبلی کے تعلقات کشیدہ تھے،

آج خود سیّد صاحب کو اپنے استاد کی متعدد باتوں سے اختلاف ہے

تو کیا اس کے یہ معنی ہوں گے کہ سیّد صاحب کے دل میں شبلی کا واجبی

احترام نہیں رہا، واقعہ یہ ہے کہ سیّد صاحب نے ان اختلافات کے

بیان کرنے میں غیر جانبداری سے کام نہیں لیا بلکہ استاد کی برتری ثابت کرنے

کی کوشش میں انصاف کا سر رشتہ ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے اور

اپنے دعوے کے ثبوت میں انھوں نے شاذ روایات تک کا سہارا

ڈھونڈھا ہے، قدرتی طور پر یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ آیا

... صاحب پہلے سے ہی سرسیّد احمد کے بارے میں ایسے خیالات

رکھتے ہیں، یا یہ تبدیلی بھی تقدس اور روحانیت کی بدولت ان میں پیدا

ہو گئی ہے، شبلی کی وفات کے بعد جو مضمون انھوں نے لکھا تھا اس

سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ وہ آج سے تیس تیس برس پہلے

---

[1] حیات شبلی صفحہ ۲۳۱-۳۲ [2] مشکلات القرآن کا مقدمہ صفحہ ۳۲ و ۳۳

سرسید کے متعلق اتنی گری ہوئی رائے نہیں رکھتے تھے ، اس مضمون کا یہ حصہ ملاحظہ ہو :-

"ہندوستان[۵۱] کا دور اصلاح جن افراد پر مشتمل تھا ان کا سر عسکر یقیناً وہی تھا جس کے بوڑھے غمزوں میں صد کرامات پنہاں تھی اور جس کی ریش سپید کی درازی سحر کی چھٹکی ہوئی چاندنی تھی ، سرسید احمد خاں ، نواب محسن الملک ، مولوی چراغ علی صاحب ..... مولانا الطاف حسین حالی اور سب سے آخر خاتمۃ المصلحین حجت الملت والدین شمس العلماء مولانا شبلی اس دور کے ارکان عظام تھے ۔"

حیات شبلی کی ایک خصوصیت جسے ہر پڑھنے والا محسوس کرتا ہے وہ شبلی کی اولیات کا شمار ہے سید صاحب نے حتی المقدور کوشش کی ہے کہ تمام اولیات کا سہرا ان کے استاد کے سر رہے اور اگر کوئی حریف اس اعزاز میں شبلی کا شریک ہو سکتا ہے تو اسے نیم عالم کہہ کر اس استحقاق سے محروم کر دیا جائے ، سرسید مولوی چراغ علی اور مولوی کرامت علی جونپوری کے کارہائے نمایاں اسلام کی حمایت اور مخالفوں کی تردید میں ایسے ہیں کہ انھیں بآسانی فراموش نہیں کیا جا سکتا خاص طور پر سرسید کی خطبات احمدیہ جو صوبجات شمال مغربی کے گورنر کی کتاب کا جواب ہے اپنی صمیمیت اور خلوص کی بناء پر اردو زبان میں بے نظیر ہے لیکن سید صاحب ان بزرگوں کے کارناموں کی قدر و قیمت اس طریق پر کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں :۔ "[۵۲] چونکہ وہ باقاعدہ عالم نہ تھے اور نہ علمائے حق کی صحبتوں سے مستفید تھے ، انھوں نے اپنے کاموں میں جگہ جگہ غلطیاں کیں اور ایسی تاویلوں کے شکار ہوئے جو

---

[۵۱] معارف دسمبر ۱۹۱۶ء [۵۲] حیات شبلی دیباچہ صفحہ ۱۶

حقیقت سے یہ مراحل دور تھیں" خدا جانے سید صاحب کے پاس وہ
کون سا معیار ہے جس کے ذریعہ وہ لوگوں کی قابلیت جانچتے ہیں، اگر
ایک عالم کی تصنیفات اس کے علم کی شاہد نہیں ہیں تو نہ معلوم اس کے
سوا کون سی کسوٹی ہے جس پر کسی شخص کی قابلیت کے جوہر کو پرکھا جا سکتا ہے
سر سید اور مولوی چراغ علی کے علمی کارنامے ان کی قابلیت کے بہترین
شاہد ہیں لیکن سید صاحب کے نزدیک یہ بزرگ نیم عالم تھے اور کسی
پیر طریقت کے فیضان سے محروم، تقریباً اسی قسم کا سلوک سید صاحب
نے پروفیسر محمود خاں شیرانی کے ساتھ روا رکھا ہے، ان کی وفات پر
ایک نوٹ کے دوران میں فرماتے ہیں کہ شیرانی صاحب کی فارسی تعلیم
متوسط تھی تو ہم اس خوش قسمت کا نام جاننا چاہتے ہیں جس کی تعلیم
سید صاحب کے نزدیک اعلیٰ ہو، اس سے بھی زیادہ سخت سید صاحب
کی رائے مولوی عبدالرزاق کانپوری کی علمیت کے بارے میں ہے۔
مرحوم کے انتقال پر اپنے تاثرات قلم بند کرتے ہوئے سید صاحب ان
کی عربی دانی کی کیفیت اس طرح بیان کرتے ہیں[۵۱] کہ مرحوم عربی کتابوں میں
جہاں کہیں برامکہ کا لفظ دیکھتے تھے اسے نوٹ کر کے اس کا مفہوم دریافت
کر لیا کرتے تھے، سید صاحب یہاں تک فرماتے ہیں کہ البرامکہ میں تمام
عربی اشعار کا اردو ترجمہ حکیم عبدالحی صاحب گل رعنا کا کیا ہوا ہے، اس
قسم کا سخت بیان اور وہ بھی مولوی عبدالرزاق کے انتقال کے بعد
نہایت ہی غیر منصفانہ ہے، سید صاحب نے ایک جگہ اپنے استاد کی
زبانی روایت کیا ہے کہ سر سید نے اشارات کے ایک مشکل مقام کی
جسے وہ خود نہیں سمجھ سکتے تھے، شبلی سے توضیح چاہی تو شبلی کی زبان سے
بے اختیار یہ جملہ نکل گیا کہ آپ اسے سمجھ بھی نہیں سکتے تھے، شاید یہ واقعہ سر سید

---

۵۱ معارف مارچ ۴۸ء صفحہ ۲۳ ۵۲ حیات شبلی صفحہ ۱۲۶

کے نیم عالم ہونے کے ثبوت میں نقل کیا گیا ہو لیکن سچ تو یہ ہے کہ اگر یہ روایت صحیح بھی ہو جب بھی سر سید کی نیم علمی پر دال نہیں۔ اس لئے کہ خود شبلی کا بیان ہے کہ باوجود فلسفہ کے مطالعہ کے وہ امام غزالی کی تہافۃ الفلاسفہ کو نہ سمجھ سکے اور جب انھوں نے اپنے استاد مولوی محمد فاروق چریاکوٹی سے اسے سمجھنا چاہا تو وہ بھی کترا گئے، مولانا شبلی کے اپنے الفاظ یہ ہیں:- "میں[۱] نے فلسفہ بڑی محنت اور تدقیق سے پڑھا اور مدتوں اس میں منہمک رہا، باوجود اس کے میری سمجھ میں وہ کتاب نہیں آئی، مولوی فاروق صاحب سے پڑھنا چاہا وہ بھی کترا گئے، میں نے چند دفعہ الغزالی کے کئی کئی صفحے لکھ کر اسی خیال سے چھوڑ دیے کہ ان کتابوں پر ریویو نہ ہو سکا تو کیا فائدہ۔"

شبلی کی اوّلیات گنانے میں سید صاحب عدل کو قائم نہیں رکھ سکے، وہ ان کے نزدیک عہد جدید کے معلم اوّل ہیں، مستشرقین اور عیسائیوں کے مقابلہ میں جو "شیر دل اسلام کی صف سے سب سے پہلے نکلا وہ مولانا شبلی ہی تھے"۔ فارسی زبان میں نئی شاعری کی بنیاد شبلی نے ڈالی، آج کل اسلام کے سیاسی اور اقتصادی نظام پر جو کچھ لکھا جا رہا ہے اس کا مسالہ کہاں سے ہاتھ آ رہا ہے؟ الفاروق سے علماء میں وہ پہلے شخص تھے جس نے وقت کی سیاسی باتوں میں دلچسپی لی، ہندوستان میں وہ عالم گیر اتحاد کے داعی اول تھے، سیاسی مسائل سے حضرات علماء کو جو دلچسپی ہے وہ شبلی کی پکار کا نتیجہ ہے ہندوستان میں صدر الصدوری[۲] یا شیخ الاسلامی یا امارت شرعیہ کی جو تحریکیں بعد کو اٹھیں وہ بھی شبلی کی صدائے بازگشت ہیں۔

ناظرین خود ملاحظہ کر سکتے ہیں کہ مندرجہ بالا سب باتیں شبلی کی اولیات میں محسوب نہیں ہو سکتیں لیکن یہ سچ ہے کہ شبلی کو جامعیت کا شرف حاصل ہے۔

---

[۱] حیات شبلی صفحہ ۳۶۹ و ۳۷۰ [۲] ایضاً صفحہ ۳ ۵۵

ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ سید صاحب اپنی تحریروں میں بعض اوقات شاعرانہ مبالغہ سے کام لیتے ہیں، اس قسم کی مبالغہ طرازی کی کئی مثالیں حیاتِ شبلی میں موجود ہیں۔

"مصر کے عیسائی[۵۱] مورخ جرجی زیدان نے "تمدن اسلامی" کے نام سے چار پانچ جلدوں میں اسلامی تمدن کی تاریخ لکھی ہے۔ اس کی تیسری جلد اسلامی علوم و فنون کی تاریخ پر ہے، بدگمانی نہیں کرتا مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہی رسائل اس کے سامنے تھے اور ان ہی کو دیکھ کر اسی رنگ سے (واقعات کے حوالوں کی مدد سے جو رسائل کے حاشیوں پر لکھے ہوئے تھے) اس نے یہ مرقع تیار کیا ہے۔"

عام اردو داں طبقہ شاید سید صاحب کا یہ بیان پڑھ کر آمنّا و صدّقنا پکار اٹھے لیکن ہر وہ شخص جس نے رسائل شبلی اور تاریخ التمدن الاسلامی دونوں کو ایک سرسری نظر سے بھی دیکھا ہو اس بیان کی تصدیق کیونکر کر سکتا ہے، رسائل شبلی مختلف مضامین کا مجموعہ ہے جن میں سے صرف بعض کا تعلق اسلامی علوم و فنون سے ہے لیکن جرجی زیدان نے ایک پوری جلد اس کے لیے وقف کر دی ہے، رسائل شبلی کے ماخذ نادر مخطوطات نہیں تھے جہاں تک بیچارے جرجی زیدان کی رسائی نہ ہو سکتی، محض اس بناء پر کہ تاریخ تمدن اسلامی لکھتے وقت رسائل شبلی کا ایک نسخہ اس کے پیش نظر تھا یہ گمان کرنا کہ ان ہی رسائل کو دیکھ کر اسی رنگ سے اس نے یہ مرقع تیار کیا ہی درست معلوم نہیں ہوتا، واقعہ یہ ہے کہ اسلامی علوم و فنون کی تاریخ مرتب کرنا کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں اس کام کو قرار واقعی انجام دینے کے لئے کئی اہل علم کا تعاون ضروری ہے خود شبلی کو اس بات کا اعتراف ہے جرجی زیدان کی علمی کم مایگی کا تذکرہ کرتے ہوئے کس حسرت سے لکھتے ہیں:

---

۵۱ حیات شبلی صفحہ ۲۳۰۔

۵۰
أَمَّا تاريخ العلوم الاسلاميه و التقريظ عليها فقد فقدنا اليوم في ملتنا من يقوم بهذا العباء"

سیرت کی مقبولیت میں کسے کلام ہو سکتا ہے لیکن سید صاحب کے خامۂ سحر نگار سے اس مقبولیت کی داستان سننے کے لائق ہے، دیباچہ کے صفحہ ۵۲ پر فرماتے ہیں:۔

"وہ زبان جس میں ان کے اعلان سے پہلے صرف میلاد نامہ کی قسم کے رسالوں اور ایک آدھ کتاب تواریخ حبیب الٰہ کی سی پرانی طرز کی سیرت کے سوا کوئی ایک کتاب بھی موجود نہ تھی صرف پیروی کی برکت سے پچیس برس کے اندر سیرت پاک کے موضوع پر چھوٹی بڑی ہزاروں کتابوں کے دفتر سے معمور ہو گئی، اس کوشش میں مقدس علماء بھی شریک ہو گئے، نئے تعلیم یافتہ اہل قلم بھی، گم کردہ راہ مدعی اسلام فرقے بھی"

اس بیان کی مبالغہ طرازی واضح ہے، سیرت النبیؐ سے پہلے اردو زبان بجا طور پر تذکرۃ المصطفٰے اور رحمۃؐ للعالمین جیسی کتابوں پر فخر کر سکتی تھی پھر اس سلسلہ میں سر سید احمد کی خطبات احمدیہ کو کیونکر فراموش کیا جا سکتا ہے جو سر ولیم میور کی "حیات محمد" کا کامیاب اور معقول جواب تھی اور جو اپنے خلوص اور صمیمیت کے اعتبار سے ایک خاص امتیاز کی مستحق ہے، مندرجۂ بالا بیان کی دوسری شق پر ذرا غور کریں تو اس کی مبالغہ آمیزی خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے، وہ کون سی ہزاروں کتابیں ہیں جو سیرت النبیؐ کے بعد اردو میں لکھی گئیں، چند مشہور اور اہم کتابوں کے نام ضرور گنائے جا سکتے ہیں۔

اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک مولانا ابوالکلام آزاد الندوہ کے اسسٹنٹ ایڈیٹر رہے، سید صاحب کے بیان کے مطابق ۱۹۰۵ء

---

۵۱ الانتقاد صفحہ ۷۶

میں وہ شبلی سے بمبئی میں ملے اور یہ ملاقات[۵۱] ایسی تاریخی ثابت ہوئی جس نے ابوالکلام کو مولانا ابوالکلام بنا دیا" شبلی کی خلوت و جلوت کی علمی صحبتوں میں شریک رہنے اور اپنی مستثنیٰ فطری صلاحیتوں کی بدولت مولانا ابوالکلام کا قیام شبلی کی صحبت میں بہت مختصر تھا تاہم یہ محل تعجب نہیں کہ شبلی ایسے عالم اور محقق کا اثر نوجوان ابوالکلام پر پڑا ہو لیکن سید صاحب کا یہ ارشاد قبول کرنے میں ذرا ہچکچاہٹ سی محسوس ہوتی ہے کہ اتحاد اسلامی اور وطنی سیاست میں کانگرس کی ہمراہی بھی شبلی کا فیضِ صحبت ہے، اس معاملہ میں ہمیں شبلی کے ایک ناقد کا ہم خیال ہو کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ سیاست میں نوجوان ابوالکلام نے شبلی کو متاثر کیا اور یہ غالباً ان ہی کی زبردست شخصیت کا اثر تھا کہ شبلی نے "جادۂ سید" سے کامل انحراف اختیار کیا، پھر شبلی کی زندگی میں ایسے لمحے بھی آئے جبکہ خارزار سیاست میں استقلال نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور ان سے بعض ایسی باتیں سرزد ہوئیں جو بقول سید صاحب "آورد" تھیں، آمد نہ تھیں، ان کے برعکس مولانا ابوالکلام آزاد نے زمانے کی تمام ناسازگاریوں کے باوجود جس شاندار استقامت اور استقلال کا ثبوت دیا ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کو قرآن حکیم سے جو عشق ہے وہ سب پر عیاں ہے، سید صاحب اس عشق کو مولانا حمید الدین فراہی کی چند روزہ صحبت کا نتیجہ بتاتے ہیں،[۵۲] یہ ایک ایسا ایک طرفہ بیان ہے جس کی تائید و توثیق مولانا آزاد نے کبھی نہیں کی۔

حیات شبلی میں غلط تاویل کی بھی کئی مثالیں پائی جاتی ہیں، اس دور میں جبکہ شبلی ایک غالی حنفی تھے انھوں نے حنفیت کی تائید میں

---

۵۱ حیات شبلی صفحہ ۴۴۴ ۵۲ ایضاً صفحہ ۴۴

ایک رسالہ ظل الغمام فی مسئلۃ القراءت خلف الامام کے نام سے اردو زبان میں لکھا تھا، حیات شبلی[۱] میں اس کتاب کا مقدمہ نقل کرکے سید صاحب مندرجہ ذیل نتائج اخذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

(۱) علی گڈھ جانے سے پہلے ہی مولانا کے قلم میں اردو انشاپردازی کا کتنا زور تھا۔

(۲) دماغ اور تحریر کا سلجھاؤ سرسید کی ملاقات اور ادبی تاثر سے پہلے بھی کس قدر تھا۔

(۳) اس سے ان کا وہ تاثر ظاہر ہوتا ہے جو اس نازک زمانے میں باہمی فرقہ آرائیوں سے ان کے دل کو پہنچا تھا۔

شبلی کا زور انشاپردازی مسلم، دماغ اور تحریر کا سلجھاؤ بھی تسلیم لیکن تیسری شق ایسی ہے جسے کسی صورت میں بھی قبول نہیں کیا جاسکتا، علی گڈھ پہنچنے سے پہلے شبلی کی دماغی صلاحیتوں کے اظہار کا سب سے بڑا میدان احناف اور اہل حدیث کی باہمی کش مکش تھی، شبلی اس میدان کے مرد تھے اور حریفوں کو نیچا دکھانا ان کا محبوب مشغلہ تھا ایک ایسے مناظرے کے دلدادہ کے لئے یہ کہنا کہ باہمی فرقہ آرائیوں سے ان کے دل کو دکھ پہنچتا تھا انصاف سے بعید ہے، فرقوں کی اس کش مکش میں شبلی کی انتہا پسندی کا اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انھیں مولانا عبدالحی فرنگی محلی کی معتدل روش تک ناپسند تھی چنانچہ رسالہ اسکات المعتدی میں انھوں نے مولانا عبدالحی کی تحقیق کی تردید کی اب ذرا پہلی دو شقوں پر بھی ایک نظر ڈالیے، فرض کیجئے کہ شبلی علی گڈھ میں سرسید کے زیر اثر نہیں آتے اور صرف مولانا فاروق چریاکوٹی کے دامن سے وابستہ رہے ہوتے تو ان کی خداداد قابلیت کا مصرف کیا ہو سکتا تھا؟ وہ

---

[۱] حیات شبلی صفحہ ۱۰۴

محض ایک مولوی ہوتے، شبلی نہ ہوتے۔

خطوط شبلی میں مولانا کے سوانح نگار کے لئے تھوڑا بہت مواد موجود ہے اور چونکہ ان ہی خطوط کی بناء پر بعض مضامین مثلاً "شبلی اور بمبئی" اور "شبلی کی داستان معاشقہ" لکھے گئے ہیں اس لیے سید صاحب کا فرض تھا کہ وہ اس سلسلہ میں بعض غلط فہمیوں کا پردہ چاک کرتے اور بتاتے کہ مضمون نگاروں نے کس کس چیز میں شبلی کے ساتھ بے انصافی کی ہے، بجائے اس کے کہ وہ اس معاملہ پر پوری روشنی ڈالتے انھوں نے اسے نظر انداز کر دینے میں مصلحت سمجھی چنانچہ شبلی کے اس شعر کی تاویل مَا لَا یَرْضَاهُ قائلہٗ کے مطابق بڑے دلچسپ طریق پر کرتے ہیں:۔

آں شہدائے دوست کہ در ندوہ بہ بمبئی بازم

کہ دم از صحبت آں دشمن ایماں زدہ ام

سید صاحب فرماتے ہیں:۔

"وہ لوگ[1] جن کی سخن فہمی صرف حرفی ہے وہ غلطی سے اس دشمن ایمان کی تلاش بمبئی میں کرتے ہیں حالانکہ وہ علی گڑھ میں تھا۔"

اس تاویل کو پڑھ کر آدمی دم بخود رہ جاتا ہے، اتنی صریح اور واضح بات کی یہ دور از کار تاویل کہاں تک بجا ہے اس کا فیصلہ ناظرین کرام خود کر سکتے ہیں۔

حیات شبلی میں بعض واقعات کی غلطیاں بھی ہیں جنھیں نظر و قلم کے سہو پر محمول کیا جا سکتا ہے، مثلاً کتاب کے صفحہ ایک پر سید صاحب رقمطراز ہیں کہ

"دوسری صدی کا خاتمہ تھا کہ غزنی میں ترکوں کی ایک نوجوان تازہ دم قوم نے جو ابھی ابھی اسلام کے نام سے آشنا ہوئی تھی اپنی سلطنت کی

---

[1] حیات شبلی صفحہ ۷۵۲

طرح ڈالی، اس کا پہلا بانی الپتگین اور اس کا جانشین سبکتگین ہوا۔"

تیسری صدی کے خاتمہ کے بجائے چوتھی صدی ہجری کا وسط چاہیے جب کہ الپتگین غزنی میں حکومت کرتا ہے، اس کے بعد اس کا بیٹا ابو اسحٰق جانشین ہوتا ہے نہ کہ سبکتگین اور جیسا کہ ڈاکٹر ناظم نے اپنی کتاب محمود[۵۱] آف غزنہ میں بتایا تین جانشینوں کے بعد سبکتگین کی باری آتی ہے۔

مولانا ابو الکلام آزاد کے تذکرہ کے ضمن میں سید صاحب لکھتے ہیں[۵۲]:-

"اس کے بعد المرءۃ المسلمہ کے نام سے مصر کے قاسم امین بے اور فرید وجدی نے مسلمان عورتوں کی بے پردگی اور پردہ پر جو کچھ لکھا تھا اس پر مفصل تبصرہ لکھا جو الندوہ کے کئی نمبروں میں چھپا ہے۔"

قاسم امین بے نے آزادی نسواں کی حمایت میں دو کتابیں لکھیں تحریر المرءۃ (عورت کو آزاد کرانا) اور المرءۃ الجدیدۃ، ان کے جواب میں فرید وجدی نے المرءۃ المسلمہ لکھی جس کا اردو ترجمہ مولانا ابو الکلام نے کیا اور جسے کتابی صورت میں اخبار وکیل امرتسر نے شائع کیا، یہی وہ ترجمہ ہے جسے ہمارے ایک عزیز دوست نے حال ہی میں مولانا موصوف کی اجازت کے بغیر "مسلمان عورت" کے نام سے دوبارہ شائع کیا ہے، ترجمہ جس خوبی سے کیا گیا ہے اس سے اصل کا شبہ ہوتا ہے۔

اوکسفورڈ یونی ورسٹی کے پروفیسر مارگولیتھ کو کیمبرج یونی ورسٹی کا پروفیسر[۵۳] بتایا گیا ہے، یہ غالباً سہو قلم ہے، اسی طرح مشہور معتزلی عالم ابو الہذیل علاف کو ہذیل[۵۴] علاف لکھا گیا ہے، اسے بھی سہو قلم ہی سمجھنا چاہیے۔

حیات شبلی کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالنے کے بعد اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ یہ کہاں تک مدلل مداحی اور کتاب المناقب ہے، شبلی کے اوصاف و

---

۵۱ محمود آف غزنہ صفحہ ۲۶ و ۲۷ ۵۲ حیات شبلی صفحہ ۴۴۴

۵۳ حیات شبلی صفحہ ۳۰ ۵۴ حیات شبلی صفحہ ۴۴

محاسن کو بڑی تفصیل اور جامعیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور کہیں کہیں ان کی دو چار کمزوریوں کی طرف اشارہ بھی موجود ہے۔ اس لئے حیات شبلی کے کتاب المناقب ہونے میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں، آخر یہ کیا ضرور ہے کہ محاسن اور معائب کا توازن قائم رکھ کر ہیرو کی داستان کو کتاب المحاسن والمساوی بنا دیا جائے۔ حیات شبلی میں مدلل مداحی سے بھی کافی کام لیا گیا ہے اور بہت سے نزاعی اور اختلافی امور میں پوری قوت دلائل کے ساتھ شبلی کے طرز عمل کو حق بجانب ٹھہرایا گیا ہے لیکن اس بحث میں سیّد صاحب کی حیثیت بعض اوقات محض ایک طرفدار کی سی رہ جاتی ہے اور وہ ایک کامیاب مناظر کی طرح مسئلہ کے صرف ان پہلوؤں پر زیادہ زور دیتے ہیں جو ان کے مفید مطلب ہیں، اس قسم کے طرز عمل کا ردّعمل ہمیشہ سخت ہوتا ہے، اگر بعض عظیم المرتبت شخصیتوں کے متعلق سید صاحب نے یہ طریق بحث اختیار نہ کیا ہوتا تو شبلی نامہ اور ذکر شبلی جیسی کتابیں کبھی نہ لکھی جاتیں خاص طور پر جبکہ ذکر شبلی کے مصنف نے حیات شبلی کی تالیف کے دوران میں بھی سیّد صاحب کی امداد کی تھی جیسے کہ وہ خود شبلی کی زندگی میں ان کی مختلف طریقوں سے مدد کرتے رہے تھے۔

کتاب کے سرورق پر حیات شبلی کو علامہ شبلی کے سوانح حیات اور علمی وعملی کارنامے بتایا گیا ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شبلی کے علمی اور عملی کارناموں کا تذکرہ بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے اور کہیں کہیں ان کی تعریف وتحسین کے ساتھ تنقید کا فرض بھی ادا کیا گیا ہے۔ شبلی کے مقالات اور تصنیفات کی مقبولیت اور شہرت کو سید صاحب نے بڑی خوبی اور قابلیت کے ساتھ بیان کیا ہے تاہم یہ امر واقع ہے کہ شبلی کے علمی کمالات پر بحث بہت حد تک تشنہ ہے، یہ سچ ہے کہ کہیں کہیں شبلی کی خوبیاں

بحیثیت ایک ادیب، شاعر ناقد اور مورّخ کے بیان کی گئی ہیں لیکن یہ پیرایہ بیان موضوع کی اہمیت کے پیش نظر ناکافی ہے، علم الکلام اور الکلام پر جس انداز میں تنقید کی گئی ہے، اسی طریق پر شبلی کی دوسری تصنیفات کے محاسن اور نقائص پر تفصیل کے ساتھ نظر ڈالنے کی ضرورت تھی، شبلی کی بعض کتابیں ایسی ہیں جن کے جواب میں دوسروں نے مستقل کتابیں لکھی ہیں یا ان پر بڑی مفصل تنقیدیں شائع کی ہیں حیات شبلی میں ان چیزوں پر بحث ہونا چاہئے تھی، شبلی اُردو زبان کے بلند پایہ ادیب ہیں، اس لئے ضروری تھا کہ اُردو ادب میں ان کا درجہ بتایا جاتا، شعر العجم کا چوتھا حصہ ادبی تنقید کا بہت اچھا نمونہ ہے، موازنۂ انیس و دبیر میں ادبی نکتوں کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، شبلی بحیثیت ناقد ایک مستقل موضوع ہونا چاہئے تھا شبلی نے اسلامی تاریخ کا مطالعہ بڑی گہری نظر سے کیا تھا اسی لئے ان کا مرتبہ بحیثیت مورخ ان کے نکتہ چینوں کی نظر میں بھی بہت بلند ہے، الفاروق ان کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر خود شبلی کو ناز ہے لیکن سیّد صاحب کو شکایت ہے کہ اس میں حضرت عمرؓ کی روحانی زندگی کو پوری طرح پیش نہیں کیا گیا، شبلی ہمہ تن شاعری کی طرف متوجہ نہیں ہوئے، لیکن اس کے باوجود ان کی تاریخی اور دوسری نظمیں ان کے شاعرانہ کمال کی آئینہ دار ہیں، ہندوستان میں انھوں نے نئی فارسی شاعری کی بنیاد ڈالی ہو یا نہیں لیکن ان کے کمال کی یہ کیا کم دلیل ہے کہ حالی جیسا بالغ نظر ناقد ان کے فارسی اشعار میں وہی گرمی اور کیف پاتا ہے جو حافظ کے کلام کی ایک بڑی خصوصیت ہے حیات شبلی میں یہ کمی محسوس ہوتی ہے کہ شبلی کے علمی کمالات پر کماحقہ بحث نہیں کی گئی اور بحیثیت ادیب شاعر، ناقد اور مورخ کے ان کے کارناموں پر جامعیت اور تفصیل کے ساتھ روشنی نہیں ڈالی گئی۔

شبلی کی کامیابی کے اسباب | حیات شبلی کی رائے میں سیرت کی کتاب

ایسی ہونی چاہئیے کہ اس سے صاحب سیرت کا پایہ اونچا[ل۱] نظر آئے،
بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ حیات شبلی کے اوراق شبلی کی عظمت اور بزرگی کے شاہد عادل ہیں اور سید صاحب نے یہ کتاب لکھ کر اپنے مرحوم استاد کی شاگردی کا حق ادا کر دیا ہے اور اردو دانوں کی علمی اور ادبی ضیافت کا خوشگوار فرض مع تمام تکلفات کے بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دیا ہے، کتاب کی حسن ترتیب، مصنف کا عالمانہ اسلوب بیان، شواہد و اسناد کی فراوانی، معلومات کی کثرت اور شبلی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل تبصرہ کتاب کے گوناگوں حُسن اور سید صاحب کی کامیابی کے بہترین ضامن ہیں، اس کتاب کی کامیابی کا شاید سب سے بڑا سبب سید صاحب کی شاگردانہ عقیدتمندی ہے جس نے ان سے اُستاد کے متعلق اتنی ضخیم کتاب لکھوا دی اور اس ضخامت کے باوجود اس میں زندگی کی روح بھی موجود ہے، ایک اور سبب مصنف کا علمی تجربہ ہے جس کا ثبوت کتاب کے صفحات پر جا بجا ملتا ہے، حیات شبلی کے بعض حاشیے علمی اور تاریخی اعتبار سے بہت مفید اور قیمتی ہیں۔

حیات شبلی میں سید صاحب کا ذکر اس کتاب کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ سید صاحب نے اپنے سوانح نگار کے لئے معتدبہ مواد فراہم کر دیا ہے چنانچہ کتاب میں جا بجا وہ اپنا ذکر خاکسار یا راقم کے طور پر کرتے ہیں ۱۹۰۱ء میں ندوۃ العلماء کے مدرسہ میں داخل ہوتے ہیں اور ۱۹۰۲ء میں پہلی مرتبہ شبلی کی زیارت کرتے ہیں، ۱۹۰۶ء سے ۱۹۰۸ء، ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۰ء تک، اور اگست ۱۹۱۱ء سے مئی ۱۹۱۲ء تک الندوہ کے ایڈیٹر رہتے ہیں، ۱۹۰۶ء میں علوم قدیمہ و جدیدہ کے موازنہ پر ایک بسیط مضمون لکھ کر شائع کرتے ہیں، ۱۹۰۸ء میں جدید عربی کی تعلیم کے

ل۱ حیات شبلی صفحہ ۱۰۷

ہیں ان کا انتخاب عمل میں آتا ہے، ۱۹۱۲ء میں لغات جدیدہ پیش کرتے ہیں، اس سے پہلے دیر دس الادب کے نام سے دو ابتدائی رسالے تیار کر چکے ہیں، صیغۂ تصحیح تاریخ اسلام کے سکریٹری چنے جاتے ہیں، نواب محسن الملک اور شبلی کی شان میں عربی قصیدے لکھتے ہیں، ندوۃ العلما کے سالانہ جلسوں پر ان کی عربی تقریروں پر ہر طرف سے احسنت و آفرین کی صدائیں بلند ہوتی ہیں، جرجی زیدان کی تردید میں لکھے ہوئے رسالہ الانتقاد میں بنو امیہ کی علمی سرپرستی والا حصہ سید صاحب کے زور قلم کا نتیجہ ہے، فارسی میں سید صاحب نے صرف ایک قصیدہ لکھا ہے لیکن اسے کتاب میں شامل کرنے کے لئے یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ "اپنی کم سوادی کو رسوائے عام کرنا چاہتا ہوں" اسی طرح اردو زبان میں اپنے استاد کی تقلید میں مسلم لیگ کے بارے میں لکھی ہوئی دو نظمیں کتاب کی زینت بڑھانے کے لئے شامل کر دیتے ہیں، غرض اسی طرح دوسرے کئی مقامات پر سید صاحب رونق افروز ہیں۔

سید صاحب کا اسلوب بیان سید صاحب اپنی سنجیدہ نگاری اور عالمانہ انداز بیان کے لئے مشہور ہیں، ان کی کوئی تصنیف بھی اٹھا کر ہاتھ میں لیجیے، اس میں ایک ادیب کی سحر نگاری کے بجائے ایک عالم یا محقق کا علمی انداز آپ ملاحظہ کریں گے لیکن اس بیان سے یہ نہ سمجھا جائے کہ سید صاحب کے یہاں ادبی گل کاری کے نمونے مفقود ہیں، شبلی کے انداز بیان میں جو شگفتگی پائی جاتی ہے وہ ان کے نفاست پسند ذوق کی مرہون منت ہے، اسی بنا پر سر سید احمد کہا کرتے تھے کہ اگر ایک ہی موضوع پر دس آدمی بھی لکھیں تو مولوی شبلی کی تحریر نرالی ہوگی، اپنے استاد کی شگفتگی سید صاحب کے حصہ میں نہیں آئی لیکن اس کی تلافی بہت حد تک ان کے محققانہ اور عالمانہ طرز بیان نے کر دی ہے۔ سیرت النبیؐ کی تیسری جلد میں جو باب

سید صاحب نے "فلسفۂ قدیمہ اور معجزات" پر لکھا ہے وہ ہمارے دعوے کی بیّن دلیل ہے، ایک زمانہ تک اخبار الہلال میں بطور اسسٹنٹ ایڈیٹر کے کام کرنے کی وجہ سے سیّد صاحب مولانا ابوالکلام آزاد کے اسلوب بیان سے بھی متاثر ہوئے، چنانچہ ان کا دعویٰ ہے کہ الہلال کے بعض مشہور مضمون ان کے قلم کا ثمرہ ہیں، اس الہلالی رنگ کا اثر مدّتوں ان پر رہا بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس اثر سے وہ کلیتاً آزاد نہیں ہو سکے، مشہور جادو نگار مہدی افادی کو ایک مرتبہ سختی کے ساتھ لعنت کبریٰ کے استعمال پر انھیں ٹوکنا پڑا تھا، ارض القرآن کی پہلی جلد کا آغاز عربی خطبہ سے ہوتا ہے اور اس کے بعد کے ابتدائی جملے الہلال کی یاد تازہ کر دیتے ہیں:۔

"اس زمین کے اکثر حصے کی مادی شوری و بے حاصلی حکمت الٰہی کا مقتضا تھی کہ سلاطین عالم کے دست حرص و ہوس سے اس ارض مقدس کی عصمت مصون رہے تاکہ خود فطرت اللہ صرف اپنے حروف و خطوط سے اس کی گلکاری کر سکے اور خدا کی فطرت کا خزانہ جو اس کھنڈر میں دفن تھا پیغمبر مذہب فطری کے وجود تک محفوظ رہے"۔

ان جملوں کا انداز خطیبانہ یقیناً ہے لیکن ان میں نہ شبلی کے سرتاپا بلاغت طرز کا کوئی نشان ہے۔ اور نہ مولانا ابوالکلام آزاد کی پختگی اور صنعت گری کا کوئی اثر موجود ہے، ارض القرآن تو خیر ان کے عہد شباب کی تصنیف ہے اس لیے اس میں خطیبانہ رنگ کا پایا جانا کوئی بڑی بات نہیں، لیکن حیات شبلی کو لیجیے جو ارض القرآن سے تقریباً تیس سال کے بعد لکھی گئی ہے اس کے دیباچے کی چند سطریں پڑھ کر شبہ ہونے لگتا ہے کہ کہیں ہمارے ہاتھ میں مولانا آزاد کی کوئی تحریر تو نہیں ہے:۔

"پیش نظر کتاب ایک ہستی کے اوراق سوانح ہیں جس نے تیس برس (۱۸۸۴ء سے ۱۹۱۴ء) تک ہندستان اور ہندستان سے باہر کی اسلامی دنیا

کو اپنے قلم کی روانی سے سیراب، اپنی شعلہ نفسیوں سے گرم اور اپنی نوا سنجیوں سے پرشور رکھا

سالہا گوش جہاں زمزمہ زا خواہد بود
زیں نواہا کہ دریں گنبد گرداں زدہ است

سید صاحب کی معلومات کی وسعت، دلائل کی منطقی ترتیب، قدرت بیان اور متانت و سنجیدگی نے حیات شبلی کو باغ و بہار کی طرح شگفتہ و شاداب بنا دیا ہے، ان کے بعض چھوٹے چھوٹے جملے دلآویزی اور تاثیر کے اعتبار سے بلاغت کے بڑے اچھے نمونے ہیں مثلاً مفتی عنایت احمد کے بارے میں جنہیں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد بغاوت کے الزام میں انڈمان بھیجا گیا تھا سید صاحب لکھتے ہیں[۵۱]:۔

"مگر کیا عجیب بات ہے کہ دریائے شور کے ساحل پر بھی یہ چشمۂ شیریں اسی طرح ابلتا رہا۔"

دار العلوم ندوہ میں تفسیر کے کمرہ کی تعمیر میں شبلی اور ان کے ہونہار شاگردوں نے جس ذوق و شوق سے حصہ لیا سید صاحب اس کی کیفیت بیان کرتے وقت فرماتے ہیں[۵۲]:۔

"اس عمارت کی ہر اینٹ ان کی امید و آرزو کی ایک لوح تھی، اس خوش منظر قطعہ میں بھری ہوئی امیدوں کے ساتھ کبھی تنہا جاتے، کبھی دوسروں کو لے جاتے۔"

قسطنطنیہ میں اسلامی شوکت کے نظارہ سے جو کیفیت شبلی کے دل پر طاری ہوئی تھی اس کیفیت کی تصویر سید صاحب کے قلم نے اس طرح کھینچی ہے[۵۳]:۔

"وہ (شبلی) خود ایک غلام ملک کے باشندے تھے اور اپنے ہم وطن

---

۵۱ حیات شبلی صفحہ ۳۰۰ ۵۲ ایضاً صفحہ ۴۹۲ ۵۳ ایضاً صفحہ ۲۰۵

مسلمانوں کی پست حوصلگی، بزدلی، خود غرضی اور تملق پیشگی کے مناظر دیکھ چکے تھے، ایک آزاد سرزمین پر قدم رکھتے ہی دنیا بالکل بدلی ہوئی نظر آئی اور اپنی زبوں حالی کا احساس اور قومی ہوگیا تاہم جب اسلامی جاہ و جلال اور عظمت و جبروت کی داستانیں کتابوں میں پڑھی تھیں اس کے بچے کھچے آثار کو بچشم خود دیکھ کر روح مضطرب کو جو سرمایۂ نشاط حاصل ہوتا اور دل بیتاب سے جوش سرور کی جو موجیں اٹھتیں اس کا اظہار لفظوں کی قدرت سے باہر ہے۔ ہر جمعہ کو رسم سلاملق کا دلفروز سماں اور عید کے موقع پر موکب سلطانی کا پرشکوہ منظر اس درجہ روح پرور تھا کہ مولانا پر تھوڑی دیر کے لئے ایک بے خودی سی چھا جاتی۔ مولانا نے ایک مختصر سی مثنوی میں موکب سلطانی کے دلکش نظارے کی مصوری کی ہے جس کا ہر لفظ خوشی و مسرت کا چھلکتا ساغر ہے۔ اپنے کیف و وارفتگی کو ان دو شعروں میں ادا کیا ہے:-

بگذر ازیں حرف و مکرر مپرس — خواب خوشی دیدم و دیگر مپرس

تن مے بود خرابم ہنوز — دیدۂ من باز و بخوابم ہنوز"

شبلی کی طرح سید صاحب کے یہاں بھی طنز اور تعریض موجود ہے اور بعض مواقع پر ان کا قلم تیر و نشتر کا کام دیتا ہے، جن حضرات نے ان کے شندرات پڑھے ہیں ان کے ملاحظہ سے طنز کی کئی مثالیں گزری ہوں گی۔ جب عنایت اللہ خاں مشرقی کی کتاب تذکرہ شائع ہوئی تو اس کے خلاف کئی مضامین لکھے گئے لیکن جس چیز نے مشرقی صاحب کو سب سے زیادہ مضطرب کیا شاید وہ سید صاحب کے شندرات تھے، حیات شبلی میں بھی طنز کی بعض اچھی مثالیں موجود ہیں، سید صاحب کا قیاس ہے کہ شبلی مولانا عبد الحی فرنگی محلی کے حلقۂ تلامذہ میں اس لیے شریک نہیں ہو سکے کہ مولانا عبد الحی میں نقد و اجتہاد کی کمی تھی، اس مطلب کو سید صاحب اس طرح ادا کرتے ہیں:[۵۱]

---

[۵۱] حیات شبلی صفحہ ۹۷

"علامہ مرحوم کچھ تو فطری جودت طبع اور کچھ فیض فاروقی کی بدولت نقد و اجتہاد کے خوگر تھے اور جہاں جاتے ان کی نظر پہلے اسی جوہر کی تلاش کرتی، اس لیے زانوئے ادب تہہ کرنے سے پہلے ہی گھٹنوں سے قدم اٹھ گئے۔"

سید صاحب کے بیان کے مطابق شبلی نے سرسید کے مجبور کرنے پر رسالہ تہذیب الاخلاق کے لئے المعتزل والاعتزال کے نام سے ایک تاریخی مضمون شروع کیا جو یکم محرم ۱۳۱۳ھ (مطابق جولائی ۱۸۹۵ء) کے پرچہ میں چھپا اور اس کو بھی نا تمام چھوڑ دیا، بعد میں اس نا تمام مضمون کو مولوی وحید الدین سلیم نے تمام کیا لیکن یہ مضمون سید صاحب کی رائے میں کچھ اچھا نہ تھا، اس ناپسندیدگی کا اظہار ملاحظہ ہو[۵۱]:-

جس کو مولوی وحید الدین سلیم نے ۱۳ ار شوال ۱۳۱۳ ہجری کے پرچہ میں مشاہیر معتزلہ کے عنوان سے جس طرح ان سے بنا پورا کیا۔"

مولوی اسلم جیراج پوری کی تاریخ الامت کو سید صاحب ایک عربی کتاب کا ترجمہ بتاتے ہیں:

"آخر اس[۵۲] (جرجی زیدان) کے بجائے شیخ محمد خضری مقرر ہوئے جن کے تاریخی لیکچر چھپ چکے ہیں اور اردو میں تاریخ الامت کے نام سے روشناس ہیں۔"

سید صاحب کی تحریر میں محض عربی الفاظ کا عنصر ہی نہیں پایا جاتا بلکہ عربی گریمر کی پابندی تک ملتی ہے مثلاً فرق باطلہ، سنت سنیہ، حیات مبارکہ یا قیات صالحات کاموں، خاتمۂ دوران جدۂ ماجدہ، شوق افاضہ، استشارہ احقاق حق و ازہاق باطل وغیرہ، ایک جگہ انگریزی لفظ کریڈٹ بھی استعمال کیا گیا ہے چنانچہ سید صاحب فرماتے ہیں[۵۳]:-

"اس لیے اس اخبار کی پسندیدگی کا کریڈٹ مولانا کے حصے میں آتا رہا۔"

---

۵۱ حیات شبلی صفحہ ۳۰۷ ۵۲ ایضاً صفحہ ۵۷۸ ۵۳ ایضاً صفحہ ۶۱۱

حیات شبلی آٹھ سو صفحوں سے زیادہ پر مشتمل ہے اس کے باوجود اس کے ساتھ نہ غلط نامہ شامل کیا گیا ہے اور نہ انڈکس،

شبلی کی تجہیز و تکفین کا ذکر کرنے کے بعد سید صاحب اس مؤثر انداز میں اپنے استاد کو خطاب کرتے ہیں[۵۱]:-

"استاد بزرگوار جا جا اور سایۂ رحمت میں آرام کر، دنیا تجھ کو بہت ڈھونڈھے گی لیکن نہ پائے گی، لیکن تیرے علمی فیوض و برکات کا منظر ہمیشہ نظر آتا رہے گا،

بعد از وفات تربت ما در زمین مجو

در سینہ ہائے مردم عارف مزار ماست"

اس بیان کی تصدیق وہ ہزاروں دل کریں گے جن پر آج بھی شبلی حکمرانی کر رہے ہیں۔

---

۵۱ حیات شبلی صفحہ ۷۲۳ و ۷۲۴

اقبال اور عربی شعرا

اقبال ہمیشہ عجمیت کے مخالف اور عربیت کے دلدادہ رہے، اسرار خودی کے پہلے ایڈیشن میں انھوں نے ادبی نقطۂ نظر سے حافظ پر بڑی نکتہ چینی کی تھی جس کی وجہ سے ہندوستان کے صوفیانہ حلقوں میں غصہ اور ناپسندیدگی کی لہر دوڑ گئی اور خواجہ حسن نظامی اور مولوی ظفر علی خاں کے درمیان اختلاف خیال نے نہایت ہی ناخوش گوار صورت اختیار کرلی۔ اقبال کے نقطۂ نظر کے خلاف اور موافق بہت کچھ لکھا گیا، اگرچہ شاعر اپنی رائے پر سختی سے قائم رہا تاہم اس نے جمہور کی رضامندی کی خاطر حافظ والا حصہ دوسرے ایڈیشن سے خارج کر دیا، اور اس خلا کو پُر کرنے والے اشعار میں ادب کی صحیح قدر و قیمت جانچنے کا معیار پیش کیا۔ اقبال گلشن عجم میں زندگی کی بو نہیں پاتے اس لئے ایک ادیب یا شاعر کو ان کا مشورہ یہ ہے کہ وہ عجم کے چمن زار کی گل چینی ترک کرکے عرب کی زندگی بخش فضا سے فیضان حاصل کرے اور اپنا دل عرب کی سلمیٰ کے سپرد کر دے تاکہ شام کرد سے حجازی صبح نمودار ہو:۔

فکر صالح در ادب می بایدت — رجعتی سوئے عرب می بایدت
دل بہ سلمائے عرب باید سپرد — تا دمد صبح حجاز از شام کرد
از چمن زار عجم گل چیدہ ای — نو بہارِ ہند و ایراں دیدہ ای
اندکی از گرمی صحرا بخور — بادۂ دیرینہ از خرما بخور

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ عجمیت سے اس درجہ بیزاری کے باوجود وہ فارسی شعرا کے حلقہ اثر سے اپنے کو آزاد نہ کر سکے۔ برادر عزیز ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے مضمون "اقبال کے مرغوب فارسی شعرا"

میں بڑی تحقیق اور قابلیت سے اقبال کے کلام پر فارسی شعراء کا اثر دکھانے کی کوشش کی ہے۔ مرشد روم تو خیر زمینوں اور آسمانوں پر اُن کے رہبر ہیں۔ پیر رومی کے علاوہ بیسیوں فارسی شاعر ہیں جن کے کلام سے اقبال نے استفادہ کیا ہے، اس کے مقابلے میں اقبال کے یہاں بانگ درا میں عربی شعرا کا اثر بہت کم ہے۔ یورپ جاتے ہوئے وہ "تہذیب حجازی کے مزار" سسلی کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے چونکہ سسلی ایک مدت تک اسلامی تہذیب کا گہوارہ رہا ہے اس لئے اقبال اسے دیکھ کر اپنے دیدۂ خونبار کو دل کھول کر رونے کی دعوت دیتے ہیں، اس مقدس سرزمین کی مرثیہ خوانی کرتے وقت انھیں سعدی اور داغ یاد آجاتے ہیں۔ سعدی نے خلافتِ بغداد کے زوال پر خون کے آنسو بہائے ہیں۔ دہلی کی ویرانی پر داغ کا شہر آشوب کافی مشہور ہے، اگرچہ احساس کی صداقت شدتِ غم اور قوت تاثیر میں مولانا حالی کے مرثیۂ دہلی کی برابری نہیں کر سکتا جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سُنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

اسی سلسلے میں غرناطہ کی یاد بھی اقبال کے دل میں چٹکی لیتی ہے اور بے اختیار ان کی زبان پر ابن بدرون کا نام آجاتا ہے جس کے دل ناشاد نے بقول اقبال دولتِ غرناطہ کی بربادی پر فریاد کی تھی۔ ابن بدرون تنہا عربی شاعر ہے جس کا ذکر بانگِ درا میں ملتا ہے آئیے دیکھیں کہ یہ ابن بدرون کون تھا اور اس کا وہ کون سا ادبی شاہکار ہے جس نے اقبال کو اس درجہ متاثر کیا۔ ابن بدرون کے متعلق ہماری معلومات بہت محدود ہیں۔ وہ چھٹی صدی عیسوی کے ادبا میں سے ہے معجم المطبوعات میں اس کا پورا نام یوں دیا ہے:۔ الشیخ الامام الکاتب الوزیر ابو مروان

عبد الملک بن عبد اللہ بن بدرون الحضرمی الاشبیلی السبتی، اس مختصر سے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اصل میں یمنی تھا جیسا کہ اس کی نسبت حضرمی سے ظاہر ہے لیکن اس کا تعلق زیادہ تر اشبیلیہ اور سبتہ کے شہروں سے رہا ہے اس لئے وہ اشبیلی اور سبتی بھی کہلاتا ہے اپنے زمانے کا مشہور ادیب تھا اور غالباً انشا پردازی کی بدولت منصب وزارت پر بھی فائز رہا۔ وہ ۶۰۸ھ تک زندہ تھا، اس کی شہرت کا تمام تر مدار اس شرح پر ہے جو اس نے عبدون کے شاندار قصیدے پر لکھی ہے۔ سب سے پہلے ہالینڈ کے نامور مستشرق ڈوزی نے ۱۸۴۶ء میں اس شرح کو شائع کیا۔ بعد میں یہ کتاب مصر میں بھی حلیۂ طبع سے آراستہ ہوئی ابن عبدون کا اصلی قصیدہ عبدالواحد مراکشی کی عربی کتاب "المعجب فی تلخیص اخبار المغرب" میں دیا ہے جس کی اشاعت کا شرف بھی ڈوزی کو حاصل ہے۔ اس کتاب کا قلمی نسخہ ڈوزی کو لائیڈن کے کتاب خانے سے ملا جسے اس مستشرق نے پوری تحقیق اور محنت سے ۱۸۴۷ء میں لائیڈن سے شائع کیا۔ ابن عبدون کے دل ہلا دینے والے قصیدے کا شان نزول یہ ہے کہ افطسی خاندان کے حکمران جن کا صدر مقام بطلیوس تھا علم و فن کے بڑے قدردان تھے۔ عبد اللہ ابن افطسی جو مظفر کے لقب سے سرفراز تھا۔ نحو، لغت، شعر، تاریخ اور دوسرے فنون میں کافی دست گاہ رکھتا تھا۔ اس کا بیٹا عمر جس نے اپنے لئے المتوکل علی اللہ کا لقب اختیار کیا ایک طرف بہادری اور شہسواری کے لئے شہرہ آفاق تھا تو دوسری طرف نثر اور نظم میں بلند درجہ کا مالک تھا۔ یہ خاندان ۴۸۵ھ تک برسرِ حکومت رہا جب کہ مرابطین کے امیر یوسف بن تاشفین کے آدمیوں کے ہاتھوں عمر اور اس کے بیٹے فضل اور عباس بڑی بیدردی سے قتل کر دئے گئے۔ ابن عبدون جس کا اصلی نام عبدالمجید ہے اور

طالع قیس و گیسوئے لیلیٰ اس کی تاریکیوں سے دوش بدوش

یہ خیال ایک عرب شاعر کے یہاں اس طرح پایا جاتا ہے۔

صدغ الحبیب وحالی کلاھما کاللیالی

(محبوب کی زلفیں اور میری حالت دونوں راتوں کی طرح سیاہ و تاریک ہیں)، تلخیص المفتاح کے مطالعے کے دوران میں معانی و بیان کے شائقین کے ملاحظہ سے یہ شعر ضرور گذرا ہوگا۔

اسرار خودی میں جہاں اقبال شعر و ادب کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لئے ایک معیار پیش کرتے ہیں وہاں وہ عربیت کی طرف لوٹنے کی ترغیب دلاتے ہوئے مرشد حسام الحق ضیاء الدین کا یہ قول بھی نقل کرتے ہیں:۔ اَمْسَیْتُ کُردیّاً و اَصْبَحْتُ عَربیّاً (شام کے وقت میں کرد تھا اور صبح کے وقت ایک عرب تھا) رموز بیخودی کا یہ شعر:۔

رونق از ما محفلِ ایام را او رسل را ختم و ما اقوام را

بوصیری کے اس شعر کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا ہے چنانچہ ذیلی حاشیہ میں اقبال نے اسے نقل بھی کیا ہے۔

لما دعی اللہ داعینا لطاعتہ باکرم الرسل کنّا اکرم الامم

(جب خدا تعالےٰ نے پیغمبر اسلام کو جو ہمیں اس کی طاعت کی طرف بُلاتے ہیں۔ اشرف رسل کہہ کر بلایا ہے تو ہم اشرف امم ٹھہرے)

رموز بیخودی کے آخر میں اقبال رحمتہ اللعالمین کے حضور میں دعا مانگتے ہوئے کہتے ہیں:

اے بصیری را ردا بخشندۂ بربط سلمیٰ مرا بخشندۂ

بوصیری ساتویں صدی ہجری میں مصر میں انتقال کرتے ہیں۔ ان کا اصلی وطن ابوصیر جس کی وجہ سے وہ بوصیری کہلاتے ہیں۔ ایک دفعہ بیماری کی حالت میں جبکہ فالج نے انھیں اپاہج بنا رکھا تھا انھوں نے

جسے المراکشی الکاتب الفاضل ذوالوزارتین" کہہ کر پکارتا ہے۔ برسوں اس خاندان کے ساتھ وابستہ رہا، اس وابستگی کا لازمی نتیجہ وہ شاندار قصیدہ ہے جس کے طفیل اس نے بقائے دوام کے دربار میں ایک خاص جگہ حاصل کرلی ہے۔ المراکشی اس قصیدے کے محاسن کی بہت تعریف کرتا ہے۔ اس کا سوز و گداز اور رقت آمیز اسلوب ہر دردمند دل کے لئے تاثیر اور اضطراب کا پیغام ہے۔ قصیدہ البشامہ کے نام سے اور اس کی شرح طوق الحمامہ کے نام سے مشہور ہے۔ ابن بدرون کے علاوہ بعض دوسرے علماء نے بھی اس کی شرح لکھی ہے۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ابن عبدون نے پانچویں صدی ہجری کے آخری ربع میں قصیدہ کہا اور چھٹی صدی ہجری کے دوسرے نصف یا ساتویں صدی کے شروع میں ابن بدرون نے اس کی شرح تیار کی اور نویں صدی ہجری کے اختتام کے قریب دولت غرناطہ کی تباہی عیسائی حملہ آوروں کے ہاتھوں وقوع پذیر ہوئی۔

ایک جگہ شانِ حیدری کا مرحب و عنترہ کی بہادری سے مقابلہ کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں:۔

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریفِ پنجہ فگن نئے
وہی فطرت اسداللّہی وہی مرحبی وہی عنتری

لیکن مرحب و عنترہ کے ذکر سے محض اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ شاعر بعض عرب بہادروں کے کارناموں سے واقف ہے۔

اس بات کا پتہ چلانا ذرا مشکل ہے کہ کہاں کہاں اقبال اور عرب شعراء کے خیالات میں توارد پایا جاتا ہے۔ بانگ درا میں مجھے صرف ایک شعر ایسا ملا ہے جس کے بارے میں اس قسم کے شبہ کی گنجائش ہو سکتی ہے، ایک جگہ اقبال کہتے ہیں:۔

سرور عالمؐ کی شان میں ایک قصیدہ کہا جس کے طفیل آں حضرتؐ نے ایک چادر عنایت کی جس کی تاثیر سے بوصیری کو کامل شفا ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قصیدہ البردہ کے نام سے مشہور ہے اور مسلمان اسے روحانی برکت کا سرچشمہ جان کر بڑے ذوق و شوق سے اس کے اشعار پڑھتے ہیں۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اُن متعدد شرحوں سے ہو سکتا ہے جو اس پر لکھی گئی ہیں، کئی شاعروں نے بوصیری کی تقلید میں قصیدے لکھے ہیں دورِ حاضر میں مصر کے ملک الشعراء احمد شوقی کا قصیدہ نہج البردہ اس تقلید کی بین مثال ہے۔ نہج البردہ کی شرح جامع ازھر کے سابق شیخ سلیم البشری نے لکھی ہے۔

عہدِ جاہلیت کے حکیم شاعر زہیر کا بیٹا کعب بھی زبردست شاعر تھا کعب کا بھائی بجیر حلقہ بگوش اسلام ہو چکا تھا۔ تاہم کعب رسول مقبول کی مخالفت میں ایک مدت تک سرگرداں رہا۔ آخر کار جب اطاعت کے بغیر کوئی چارہ نہ رہا تو اپنا چہرہ ڈھانپے پیغمبر اسلام کی بارگاہ میں پہنچا اور آپ کی شان میں وہ قصیدہ پڑھا جو عام طور پر بانت سُعاد (سعاد چلی گئی) کے نام سے مشہور ہے اور جس پر کئی شرحیں اور حاشیے لکھے گئے ہیں۔ رسول مقبول کی تعریف کرتے ہوئے اس نے آپ کو شمشیر ہندی سے تشبیہہ دی تھی۔

"سیفٌ مِن سیوف الھند مسلول"

(ہندی تلواروں میں سے بے نیام شمشیر ہیں) پیغمبر صلعم نے فوراً سیوف الھند کی اصلاح سیوف اللہ کے الفاظ سے کی، اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں:۔

پیش پیغمبر چو کعب پاک زاد	ہدیۂ آورد از بانت سعاد
در ثنایش گوہرِ شب تاب گفت	سیف مسلول از سیوف الہند گفت

آن مقامش برتر از چرخ بلند نامدش نسبت با قلیمی پسند
گفت سیفٌ من سیوف اللہ گوی حق پرستی جز براہ حق مپوی

اس کے صلے میں رسول مقبول نے کعب کو ایک چادر عنایت کی جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ امیر معاویہ نے اسے کعب سے خرید لیا اور بعد میں وہ اموی خلفاء کے پاس بطور تبرک رہی۔

پیام مشرق گوئٹے کے دیوان کا جواب ہے اس لئے اس کتاب میں عربی شعراء کا اثر تلاش کرنا تحصیل حاصل ہے۔ البتہ زبورِ عجم میں اقبال ایک غزل میں اس شعر کے پہلے مصرعے کو بڑی خوبی سے کھپاتے ہیں جو عام طور پر بنو اُمیہ کے دوسرے خلیفہ یزید کی طرف منسوب ہے۔

انا المسموم ما عندی بتریاقٍ ولا راقی
ادر کأساً وناولھا الا یا ایُّھا السّاقی

اس شعر کا دوسرا مصرعہ الفاظ کی ترتیب کے اُلٹ پھیر کے ساتھ خواجہ حافظ کے دیوان کی پہلی غزل کا مصرعہ ہے

الا یا ایّھا الساقی أدر کأساً وناولھا

یزید جیسے شخص سے مصرعہ مستعار لینے پر بعض لوگوں کی طرف سے حافظ پر اعتراض کیا گیا ہے۔ لیکن دوسروں نے شاعر کی حمایت اس بنا پر کی کہ اگر ایک کتّا منہ میں لعل لئے جا رہا ہو تو کون ہے جو لعل چھیننے کے لئے اس کتّے کے پیچھے نہ دوڑے گا، اس قسم کے بیہودہ اعتراض سے بے نیاز رہ کر اقبال زبورِ عجم میں کہتے ہیں:

دل گیتی انا المسموم فریادش خرد نالاں کہ ما عندی بتریاق ولا راقی

ایرانِ جدید کے سب سے بڑے محقق ایرانی عالم میرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی نے رسالہ یادگار میں یزید کی طرف اس شعر کے انتساب کو غلط ٹھہرایا ہے۔ بہرحال اس شعر کا حقیقی مالک یزید ہو یا کوئی اور اس

کی دل کشی و دلآویزی حافظ اور اقبال ایسے بلند پایہ شعراء کے التفات و توجہ کی مستحق ٹھہرتی ہے۔

جاوید نامے میں اقبال پیغمبر اسلام کے اوصاف و محاسن آپ کے سب سے بڑے دشمن ابو جہل کی زبانی بڑے مؤثر پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ ابو جہل رسول مقبولؐ کی کامیابی اور اپنی ذلت و ناکامی پر نوحہ کرتے ہوئے عہدِ جاہلیت کے شاعر زہیر سے فریاد کرتا ہے کہ وہ اس کی امداد کے لئے اپنی قبر سے باہر نکلے:۔

برنیائی اے زہیر از خاکِ گور؟ چشمِ خاصانِ عرب گردیدہ کور
بشکن افسونِ نوائے جبرئیل! اے تو مارا اندریں صحرا دلیل

زہیر اپنے حکیمانہ خیالات کے لئے شہرت رکھتا ہے، اس کی بہترین تعریف مقامات الھمدانی کے مصنف نے المقامۃ القریضیہ، (شاعری کا مقامہ) میں ان بلیغ الفاظ میں کی ہے۔ یذیب الشعر والشعر یذیبہ ویدعو القول والسحر یجلیبہ (وہ شعر کو پگھلاتا ہے اور شعر اس کو پگھلاتا ہے۔ وہ شعر کو دعوت دیتا ہے لیکن سحر اس دعوت پر لبیک کہتا ہے) زہیر کے بیٹے کعب کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ مشہور عرب شاعرہ الخنساء بھی اس کے قبیلے سے تعلق رکھتی ہے اسی ابو جہل کے نوحہ میں اقبال امرء القیس کے شعر کا ایک ٹکڑا بطور اقتباس کے نقل کرتے ہیں:۔

مہلتے "اِن کُنتِ اَزمعت الفراق" اے ترا اندر دو چشم ما وثاق

یہ وہی امرء القیس ہے جس کے متعلق اقبال اپنے مضمون "رسالت مآب کا ادبی تبصرہ" میں پیغمبر اسلام کی طرف منسوب قول بطور دلیل کے پیش کرتے ہیں:۔ اشعر الشعراء وقائدھم الی النار (وہ شاعروں میں سب سے بڑا تو ہے ہی لیکن دوزخ کی طرف ان کا رہبر بھی ہے)

اقبال نے اس قول کو بڑی اہمیت دی ہے چنانچہ مرقع چغتائی کے دیباچے میں بھی اُسے دہراتے ہیں جو انھوں نے کابل کی انجمن ادبی کے سامنے کی۔

امرء القیس کا پورا شعر یوں ہے:-

افاطم مَهلاً بعضَ هذا التدلل

وَاِن کنتِ قد أزمَعتِ صرمی فاجملی

(اے فاطمہ یہ ناز ذرا کم کر اور اگر تو نے قطع تعلق ہی کی ٹھان لی ہے تو خوش اسلوبی سے کام لے)

غالباً معلقہ کا جو نسخہ اقبال کے پیش نظر ہے اس میں دوسرا مصرعہ تھوڑے سے تغیر کے ساتھ دیا گیا ہے:- و ان کنتِ ازمَعتِ الفراق فامھلی (اگر تو نے جدائی کا پکا ارادہ کر لیا ہے تو ذرا مہلت دے)

بال جبریل کا ایک حصہ ان نظموں پر مشتمل ہے جو اقبال نے اسپین کے اسلامی آثر سے متاثر ہو کر لکھی ہیں۔ سرزمین اندلس جو صدیوں تک اسلامی تہذیب و تمدن کا مرکز رہ چکی ہے۔ شاعر کے دل پر ایک عجیب وارفتگی کی کیفیت طاری کر دیتی ہے۔ یہ وارفتگی مسجد قرطبہ والی نظم میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے، شاعر کا ذہن قدرتی طور پر عبدالرحمٰن اول کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس کی شاندار کامیابی، استقلال، عالی ہمتی، شجاعت اور تدبر کی بہترین مثال ہے عباسیوں کے خون آلود ہاتھوں سے اموی خاندان کا یہ بلند حوصلہ رکن اپنے وفادار غلام بدر کی معیت میں بچ کر مغرب کی زمین میں پناہ لیتا ہے، جہاں سے وہ اپنا قدم اندلس کی طرف بڑھاتا ہے اور تخت و تاج کا مالک بن کر ایک ایسے خاندان کا بانی ہوتا ہے جس کے ابر فیض سے قرطبہ بغداد سے ہمسری کا دعوٰی کرنے لگتا ہے۔ ایک مرتبہ قرطبہ کے باغ میں کھجور کے اکیلے

درخت کو دیکھ کر جسے شام سے لاکر وہاں لگایا گیا تھا۔ عبدالرحمٰن کے دل میں اپنے وطن اور احباب و اعزا کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور وہ اس درخت کو مخاطب کر کے اپنی غربت کی داستان اس درد انگیز پیرائے میں سناتا ہے

تبدّت لنا وسط الرّصافتہ نخلۃ
تناءت بارض الغرب عن بلد النخل

فقلت شبھی بالتغرب والنوی
وطول اکتنابی عن بنی وعن اھلی

نشأت بأرضٍ انت فیھا غریبۃ
فمثلک فی الاقصی والمنتأی مثلی

سقتک غوادی المزن فی المنتأی الذی
یصح ویستمری المساکین بالویل

اقبال نے اس نظم کا ترجمہ درج کتاب کرتے وقت ذیل کا نوٹ سپرد قلم کیا ہے:۔

"یہ اشعار جو عبدالرحمٰن اول کی تصنیف سے ہیں تاریخ المقری میں درج ہیں۔ مندرجۂ ذیل اردو نظم ان کا آزاد ترجمہ ہے۔ درختِ مذکور مدینۃ الزہرا میں بویا گیا تھا۔"

یہاں یہ یاد رہے کہ مدینۃ الزہرا کی بنیاد عبدالرحمٰن ثالث نے رکھی تھی۔
بال جبریل کی ایک اور نظم کا عنوان "قید خانے میں معتمد کی فریاد" ہے، اس کی تشریح کے لئے ذیل کے نوٹ کا اضافہ کیا گیا ہے:۔

"معتمد اشبیلیہ کا ایک بادشاہ اور عربی شاعر تھا۔ ہسپانیہ کے ایک ادبی حکمران نے اس کو شکست دے کر قید میں ڈال دیا تھا۔ معتمد کی نظمیں انگریزی میں ترجمہ ہو کر "وزڈم آف دی ایسٹ سیریز" میں شائع ہو چکی ہیں۔"

گیارھویں صدی عیسوی کے پہلے نصف میں اموی خاندان کے زوال کے بعد قرطبہ کی حیثیت محض صوبے کے صدر مقام کی رہ گئی اور اشبیلیہ، بطلیوس اور طلیطلہ وغیرہ میں خود مختار حکومتیں قائم ہو گئیں۔ ان میں سب سے زبردست اشبیلیہ کا عبادی خاندان تھا جس کا چشم و چراغ محمد بن عباد المعتمد علی اللہ کے لقب سے تاریخ کے صفحات میں مشہور رہے اسپین کے حکمرانوں میں سے معتمد اپنی فیاضی، مہمان نوازی اور علم دوستی کے لئے شہرۂ آفاق تھا۔ اس کے دربار میں شعرا اور ادبا کا جمگھٹا رہتا تھا۔ ابن عمار اور ابن زیدون ایسے شاعر اس کے دربار کی زینت تھے۔ اس کی بیوی اعتماد بھی بڑی صاحب ذوق تھی۔ چنانچہ اپنے ادبی مذاق ہی کی بدولت قصر شاہی میں اس نے رسائی حاصل کی تھی۔ معتمد کی زندگی اہل جہاں کے لئے عبرت کا مرقع ہے۔ اس کے اقبال کا زمانہ اتنا شاندار تھا کہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں اسے عبدالرحمٰن ثالث، حکم ثانی اور حاجب المنصور کا ہم پلہ بتایا گیا ہے لیکن دوسری طرف ادبار کے دن بھی اس نے بڑی عالی ہمتی اور بلند ظرفی سے گذارے اس کی بلکہ اعتماد اور اس کی بیٹیاں چرخا کات کر اپنا پیٹ پالتی رہیں معتمد پر جو یہ بلا نازل ہوئی وہ اس کے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی تھی۔ جب اس کے عیسائی پڑوسیوں نے اُسے بہت تنگ کرنا شروع کیا تو اس نے مراکش کے امیر یوسف بن تاشفین سے امداد کی درخواست کی۔ مرابطین کے امیر یوسف نے معتمد کے دشمنوں کو بُری طرح مار بھگایا لیکن اشبیلیہ کی شان و شوکت دیکھ کر اس کا دل للچایا اور کچھ مدت کے بعد اشبیلیہ پر قبضہ کر کے معتمد کو بحیثیت قیدی مراکش بھیج دیا، معتمد کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مؤرخین اس کا ذکر احترام اور تحسین کے ساتھ کرتے ہیں، معتمد خود ایک بلند پایہ شاعر تھا اور اس

نے اپنے رنج والم کا بیان بڑی قوت اور دل سوزی کے ساتھ کیا ہے، اس کی اسیری کے زمانے کا ذکر ہے کہ ایک مرتبہ لوگ استسقا کی دعا کے لئے جا رہے تھے لوگوں کا یہ اجتماع دیکھ کر معتمد کے دل میں شاعری کی دبی ہوئی چنگاری چمک اٹھی اور اس نے فی البدیہہ چند اشعار کہے، شاعر عالم تخیل میں اپنے آنسوؤں کا سیلاب پیش کرتا ہے لیکن بارش کے آرزومند اس کے قبول کرنے میں عذر پیش کرتے ہیں کہ اس سیلاب میں خون کی آمیزش ہے۔

بال جبریل میں ابوالعلاء معری کا نام ایک نظم کا زیب عنوان ہے۔ ابوالعلاء عربی زبان کا ممتاز شاعر جو نابینا ہونے کے باوجود عدیم المثال بصیرت اور بے پناہ قوت حافظہ کا مالک تھا۔ پانچویں صدی ہجری میں وفات پاتا ہے۔ اس کا رسالۃ الغفران شاعرانہ تخئیل کی معراج کمال ہے اور بقول ایک ہسپانوی مستشرق کے ڈانٹے اپنی "روایت الٰہیہ" کے سلسلے میں معری کا ممنون ہے جس طرح رسالۃ الغفران میں معری بہشت کی سیر کرتا اور مختلف ہستیوں سے ملتا ہے۔ اسی طرح اس نے اپنے ایک دوسرے رسالہ الملائکہ میں عربی گرامر کے چند نکتے بیان کرنے میں تخیل کی بلند پروازی سے کام لیا ہے، جب ملک الموت اس کی روح قبض کرنے کے لئے آتا ہے تو معری اسے لفظ ملک اور ملائکہ کی بحث میں اُلجھا لیتا ہے اور پھر بڑی پرکاری سے ایک لفظ سے دوسرے لفظ کی طرف پڑھنے والے کی توجہ مبذول کراتا ہے لزومیات اور سقط الزند اس کے دو دیوان ہیں، ایران کا مشہور شاعر، سیاح اور اسمٰعیلی مبلغ ناصر خسرو اپنے سفرنامے میں معری کے وطن مالوف معرۃ النعمان کے تحت جو شام میں واقع ہے ابوالعلاء کا بحیثیت رئیس ذکر کرتا ہے اور اس کی اس کتاب (الفصول والغایات) کی طرف بھی اشارہ کرتا

ہے جیسے اس نے بعض لوگوں کے بیان کے مطابق قرآن کے مقابلے میں تالیف کیا تھا، مشرق اور مغرب کے علماء نے ابوالعلاء کے سوانح اور تصنیفات پر بہت کچھ لکھا ہے۔ خود ہندوستان میں علی گڑھ یونی ورسٹی کے پروفیسر عبدالعزیز میمن نے عربی زبان میں ابوالعلاء کے سوانح حیات اور ادبی کارناموں پر ایک گراں قدر کتاب لکھی ہے، ابوالعلاء گوشت کھانے سے پرہیز کرتا تھا چنانچہ اس مسئلے پر وہ خط وکتابت شائع ہو چکی ہے جو اس کے اور مصر کے اسمٰعیلی عالم المؤید فی الدین ہبتہ اللہ شیرازی کے درمیان ہوئی تھی۔ اقبال کو اس کی گوناگوں زندگی میں سے محض یہ واقعہ متاثر کرتا ہے کہ جب اس کے کسی دوست نے بھنا ہوا تیتر اس کے پاس بھیجا تو اس نے پرندے سے خطاب کر کے کہا کہ کمزوری اور ضعیفی کے جرم کی سزا مرگِ مفاجات کے سوا کیا ہو سکتی ہے۔ ابوالعلا محض تارکِ گوشت ہی نہ تھا بلکہ دوسری دنیاوی لذتیں بھی اس کے لئے اپنے اندر کچھ کشش نہ رکھتی تھیں۔ اس نے عمر بھر شادی نہیں کی بلکہ یہ وصیت کی کہ اس کے مرنے کے بعد قبر پر یہ شعر لکھ دیا جائے۔

هذا جناه ابی علی　　　وما جنیت علی احد

(یہ وہ زیادتی ہے جو میرے باپ نے مجھ پر کی لیکن میں نے کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی)

"پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" اور "مسافر" دو چھوٹی چھوٹی مثنویاں ہیں، ان میں عربی شعراء کا اثر نہ ہونے کے برابر ہے۔ اسی طرح ضربِ کلیم میں بھی یہ اثر تقریباً غائب ہے، البتہ ارمغانِ حجاز، جو اقبال کی وفات کے بعد شائع ہوئی ہمارے موضوع کے سلسلے میں اہم ہے۔ حضورِ حق میں حاضر ہونے کے لئے اقبال مشتاقانہ قدم بڑھاتے ہوئے عمرو بن کلثوم کے معلقہ میں سے یہ شعر اپنے ذاتی اضافے کے ساتھ پڑھتے ہیں:-

صبنتِ الکأسَ عنّی اُمَّ عمرو　　وکان الکأسُ مجراھا الیمینا

اگر این است رسم دوستداری　　بدیوار حرم زن جام و مینا

(شاعر اپنی محبوبہ ام عمرو سے خطاب کرکے کہتا ہے کہ اے ام عمرو تونے جام شراب ہم سے دور رکھا حالانکہ دائیں طرف بیٹھنے والوں کی باری تھی)، یہ عمرو بن کلثوم وہی شاعر ہے جس کی ماں کو شرافت حسب پر اس قدر ناز تھا کہ جب شاہ حیرہ عمرو بن ہند کی ماں نے اس سے خدمت لینا چاہی تو شاعر کی ماں نے اسے اپنی تذلیل سمجھتے ہوئے اپنے قبیلے کی دہائی دی جس پر اس کے بیٹے نے بغیر کسی تامل اور تذبذب کے بادشاہ کو قتل کر دیا اور خود وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا، اسی معلقہ کے دو شعر مولانا شبلی نے شعر العجم کی پانچویں جلد میں نقل کئے ہیں:

اذا بلغ الفطام لنا صبیٌّ　　تخرّ له الجبابرُ ساجدینا

ألا لا یجھلن احدٌ علینا　　فنجھل فوق جھلِ الجاھلینا

(جب ہمارے بچّے کے دودھ چھڑانے کا وقت آتا ہے تو بڑے بڑے طاقتور اس کے سامنے سجدے میں گر پڑتے ہیں، خبردار! کوئی شخص ہمارے ساتھ اکھڑپن سے پیش نہ آئے ورنہ ہم اکھڑوں کے اکھڑ ہیں)

اگرچہ اقبال نے "ارمغانِ حجاز" میں ایک عربی ضرب المثل الجملُ لا یعرف الحقّ الّا بالزّائق (اونٹ اس وقت تک خدا کو نہیں پہچانتا جب تک کہ اس کا پاؤں نہ پھسلے) کا مضمون بھی فارسی میں یوں ادا کیا ہے:

شتر را بچۂ او گفت در دشت　　نمی بینم خدائے چار سو را

پدر گفت اے پسر چوں پا بلغزد　　شتر ہم خویش را بیند ہم او را

تاہم شعر و ادب کے سلسلے میں ان کے وہ اشعار ایک خاص اہمیت

کے حامل ہیں جن میں انھوں نے شعرائے عرب کو خطاب کیا ہے۔ ان اشعار کی مدد سے ایک حد تک یہ عقدہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ اقبال نے عربیت کے اس درجہ دلدادہ ہونے کے باوجود عربی شعراء کے سرچشمے سے کیوں فیض حاصل نہیں کیا لیکن یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ اس بات کی تشریح کرنے سے پیشتر ہم اُن کے مضمون "رسالت مآب کا ادبی تبصرہ" پر ایک سرسری نظر ڈالتے چلیں، اس مختصر سے مضمون میں اقبال نے پیغمبر اسلام کو ایک ادبی مبصر کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے عہد جاہلیت کے شعراء امرا القیس اور عنترہ کے بارے میں آپ کے نقطۂ نظر کی توضیح کی ہے۔ رسول مقبول کی نظر میں امرءالقیس "اشعر الشعراء و قائدھم الی النار" ہے، اس رائے کی توجیہہ اقبال کے نزدیک امرءالقیس کی شاعری کے اہم موضوع میں ملتی ہے، اُس کے یہاں بادۂ ارغوانی شکستہ اور ویران کھنڈروں پر محبوبہ کی یاد میں اشکباری اور اسی قسم کے دوسرے موضوع میں ملتی ہے، اس کے مقابلہ میں عنترہ کا یہ شعر سن کر رسول مقبول شاعر سے شوق ملاقات کا اظہار کرتے ہیں۔

ولقد ابیت علی الطوی و اظلہٗ

حتّٰی انال کریم المأکل

(میں شب و روز گرسنگی کی حالت میں اس لئے گذار رہا ہوں تاکہ میں شریفانہ طریقے سے روزی حاصل کرسکوں)

رسول مقبول کے ان ارشادات سے اقبال نے دو اہم نتیجے مرتب کرنیکی کوشش کی ہے، اول یہ کہ صنائع و بدائع کے محاسن زندگی کے محاسن نہیں، دوم یہ کہ فن زندگی کے تابع ہے شعر اور شعراء سے متعلق رسول مقبول کے کئی اور اقوال بھی ہیں جو ادب کی بڑی بڑی کتابوں میں منقول ہیں۔ اس لئے محض دو اقوال پر انحصار کرنا کافی نہیں۔ اسی عنترہ کے دو شعر اقبال کے

ملاحظہ سے نہیں گذرے۔ ورنہ یقین تھا کہ ان جیسا خودی کا شارح اور مفسر ان کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا۔

لا تسقِنی ماءَ الحیٰوۃِ بذلّۃٍ　　بَل فاسقِنی بالعزِّ کاسَ الحَنظَلِ
ماءُ الحیٰوۃِ بذلّۃٍ کجھنّمٍ　　وجھنّمٌ بالعزِّ اَطیبُ منزلِ

(ذلت کے ساتھ مجھے آبِ حیات کا پینا بھی گوارا نہیں، ہاں اگر عزت کے ساتھ مجھے اندرائن کا پیالہ پینا پڑے تو مجھے کوئی عذر نہ ہوگا۔ اگر آبِ حیات ذلت کے ساتھ ملے تو وہ دوزخ سے کم نہیں لیکن اگر عزت کے ساتھ دوزخ ملے تو وہ بہترین منزل ہے۔

اسی طرح کتاب الحماسہ کے شعراء نے جس انداز میں عزت نفس اور خودداری پر زور دیا ہے اس کے مطالعہ سے اقبال کا متاثر ہونا ضروری تھا لیکن اقبال نے اس مجموعہ کی طرف توجہ نہیں کی، کیوں؟ سطور ذیل میں ہم اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کریں گے۔

اقبال "نواگرانِ ایران" کی جادو طرازی سے اس درجہ مسحور تھے کہ وہ زندگی کے آخری سانس تک اس سحر سے چھٹکارا نہ پا سکے، عربی شعرا کی طرف اُن کی عدم توجہ کا سب سے بڑا سبب یہی ہے۔ عجم کے سبزہ زاروں کی تازگی اور طراوت نے انھیں ہمیشہ اپنی طرف کھینچا اور ان کی سدا بہار شادابی و رنگینی شاعر کے دل و نگاہ کے لئے لطف اندوزی کا سامان بہم پہنچاتی رہی، عجمی ساز کی گرفت اس قدر سخت ہے کہ اقبال دربار رسالت میں پہنچنے کے لئے بیتابانہ بادیہ پیمائی میں مصروف ہیں لیکن راستے میں جو چیز وہ گنگناتے ہیں وہ عراقی اور جامی کے اشعار ہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ آہنگ عرب سے نا آشنا ہونے کے باوجود وہ ساربان کے ساتھ نغمہ سرائی میں بھی شریک ہیں:

گہی شعر عراقی را بخوانم　　گہی جامی زند آتش بجانم

ندانم گرچہ آہنگ عرب را شریک نغمہ ہاے سار بانم

چونکہ اقبال نے اپنی شاعری کے لئے اُردو اور فارسی کے قالب پسند کئے اور عربی زبان کی طرف وہ اپنی طبیعت کو مائل نہ کرسکے۔ اس لئے وہ باربار اس عجمی قالب کے اختیار کرنے پر معذرت خواہ ہیں، اور قارئین کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ان کا نغمہ ہندی ہو تو ہو لیکن ان کی لَے یقیناً حجازی ہے۔ اُن کا ساز عجمی ہو لیکن ان کی نوا عربی ہے۔

مرا ساز اگرچہ ستم رسیدۂ زخمہ ہائے عجم رہا
وہ شہید شوق وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی

بادۂ گرداں عجم وہ، عربی میری شراب
میرے ساغر سے جھجکتے ہیں مے آشام ابھی

در اصل نوا تو ان کی شیرازی ہے لیکن جو روح اس نوا کے پیچھے کارفرما ہے وہ یقیناً عربی ہے جیسا کہ خود انھوں نے پیام مشرق میں اس بات کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

تنم گلی ز خیابان جنت کشمیر دل از حریم حجاز و نوا ز شیراز است

بلاشبہ اقبال عربیت پر بہت زور دیتے ہیں لیکن اس عربیت سے ان کی مراد وہ عربی روح ہے جو اسلام کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے جاہلیت کے تصور زندگی اور اسلام کے تصور زندگی میں بیّن فرق ہے اور اقبال سے بڑھ کر اس فرق کو جاننے والا کون ہو سکتا ہے، عربوں کی مروت (مردمی) میں بعض اچھے اخلاق مثلاً شجاعت، سخاوت اور مہمان نوازی پائے جاتے ہیں لیکن اچھے اخلاق کے ساتھ ساتھ وہ ایک ایسے اخلاقی مرض میں مبتلا تھے جو ہمیشہ ان کے ادبار اور تباہی کا سبب رہا ہے، یہ مرض عربوں کی قبائلی عصبیت ہے جو اسلام کے زیر اثر کچھ تھوڑی دیر کے لئے دب گئی مگر پھر تمام ہولناکیوں کے ساتھ اُبھر آئی۔

عرب شام میں ہوں یا عراق اور اندلس میں۔ اس عصبیت سے انھوں نے اپنے دامن کو داغ دار کرکے ہی چھوڑا اور بڑی حد تک یہی عصبیت ان کی بربادی کی ذمہ دار ہے اس کے برعکس اسلام، ذات پات، خاندان قبیلہ شہر اور ملک کے تمام رشتوں کو کاٹ کر بنی نوع انسان کو اخوت و انسانیت کے رشتے میں منسلک کرتا ہے۔ یہ بین فرق ہے جاہلیت کے اخلاقی ضابطۂ حیات اور اسلام کے تصوراتِ زندگی میں غالباً یہ بھی ایک سبب ہے کہ اقبال صحرائے عرب کی فضا کے زندگی بخش اثرات کے باوجود عربی شعراء کی طرف زیادہ توجہ نہیں کرتے۔

نواخوان عرب سے خطاب کے دوران میں وہ اس کے سُرور، سوز اور مستی کے قائل ہیں لیکن اس کے ساتھ وہ یہ چاہتے ہیں کہ عرب شاعر صورت نگاری کو چھوڑ کر اپنے دل کی گہرائیوں میں ڈوب جائے اور مسلمان کو بھی وہ سوز دے جو اس کے دل کے اندر موجود ہے، اسے وہ بیابان حرم میں گام زنی کی تلقین کرتے ہیں تاکہ وہ اپنے دل کی وسعتوں کا احساس کر سکے، اقبال عرب شاعر کو نہایت واضح اور غیر مبہم طریق پر بتاتے ہیں کہ وہ خود زندگی کی شب تاریک کو نورِ قرآنی کی بدولت روشن سحر میں بدل سکتے ہیں۔

بگو از من نواخوان عرب را — بہائے کم نہادم لعل لب را
از آں نورے کہ از قرآں گرفتم — سحر کردم صد وسی سالہ شب را
نگہہ دار آنچہ در آب و گل تست — سرور و سوز و مستی حاصل تست
تہی دیدم سبوئے این و آں را — می باقی بہ مینائے دل تست
چو من پا در بیابانِ حرم نہ — کہ بینی اندروں پہنائے خود را

اسپین کی اسلامی تاریخ کا ایک ورق

اشبیلیہ کا نامور تاجدار المعتمد علی اللہ

اندلس کے فرمانرواؤں نے اسلامی تاریخ کے تابناک دور میں ظاہری شان و شوکت کے ساتھ ساتھ علوم و فنون کی ایسی سرپرستی اور قدر دانی کی کہ قرطبہ صحیح معنوں میں بغداد کا ہمسر بن گیا۔ ایک طرف اندلس کو اپنے بلند مرتبت اور ذی شان حکمرانوں پر ناز تھا۔ تو دوسری طرف بجا طور پر وہ اپنے اساطین علم کو باعث صد گونہ امتیاز سمجھتا تھا۔ اس کے دامن میں بعض گوہر آبدار ایسے بھی تھے جو دنیاوی ساز و سامان کے ساتھ ساتھ علم و ادب کی نعمت سے بھی مالامال تھے۔ اس قسم کی ایک عمدہ مثال اشبیلیہ کا عظیم المرتبت بادشاہ محمد بن عباد تھا۔ جسے تاریخ دان عام طور پر المعتمد علی اللہ کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ یہ وہی معتمد ہے جس کی ایک نظم کا آزاد ترجمہ علامہ اقبال نے بال جبریل میں کیا ہے۔ جب اموی سلاطین کی مرکزی حکومت کا شیرازہ منتشر ہو گیا تو گیارھویں صدی کے آغاز میں اندلس کی سرزمین میں طوائف الملوکی کا دور شروع ہوا۔ ملک چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹ گیا۔ اور اولوالعزم اور بیدار مغز لوگوں نے جا بجا، "ندا الموجود" کا نعرہ بلند کیا۔ اپنی حوصلہ مندیوں میں معتمد کا دادا قاضی محمد بھی تھا۔ جو اپنی ذاتی قابلیت اور اثر و رسوخ سے اشبیلیہ کا فرمانروا بن گیا۔ بعض مورخوں کا کہنا ہے کہ اس کے آبا و اجداد کا حیرہ کے بادشاہوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن اس کی خاندانی عظمت ثابت کرنے کے لئے قاضی کے ہوا خواہوں نے اس قسم کے رشتے ڈھونڈ نکالے قاضی محمد کے بعد اس کا بیٹا عباد المعتضد کے لقب سے تخت نشین ہوا۔

یہ بڑا عالی ہمت اور حوصلہ مند بادشاہ تھا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ نامور اس کا بیٹا محمد تھا۔ جسے دنیا المعتمد علی اللہ کے لقب سے جانتی ہے۔ کئی لحاظ سے معتمد کی شخصیت بہت اہم ہے۔ اس کے ذاتی محاسن کی مورخوں نے بہت تعریف کی ہے۔ عبدالواحد مراکشی اپنی کتاب المعجب میں معتمد کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"میں کسی ایسی شخصیت کو نہیں جانتا جس سے آدمی متصف ہو سکتا ہے۔ اور اس کا سب سے بڑا حصہ خدا نے معتمد کو عطا نہ فرمایا ہو۔ اگر وقت فتح (اندلس) سے معتمد کی تخت نشینی تک شاہان اندلس کی خوبیاں شمار کی جائیں تو معتمد ان سب میں سے یکتا اور سب سے بڑا ہے۔" ابن خلکان جس نے اپنی وفیات الاعیان میں بڑی شرح و بسط سے معتمد کے حالات اور اشعار نقل کئے ہیں۔ ابن القطاع کی سند پر اس شاندار انداز میں معتمد کی عظمت کا ذکر کرتا ہے۔

بادشاہوں میں سے وہ سب سے زیادہ کشادہ دست تھا اس کا صحن سب سے زیادہ فراخ تھا۔ شان و شوکت میں وہ سب سے بڑھ کر تھا اور یہی وجہ تھی کہ اس کا دربار مرجع خلائق۔ شعراء کا مقام اجتماع۔ امیدوں کا قبلہ اور فضلا کا مرکز تھا۔ یہاں تک کہ اس کے ہمعصر بادشاہوں کی دہلیز پر شعرا اور ادبا کا کبھی اتنا جمگھٹا نہیں ہوا جتنا کہ اس کے آستانہ پر، گوناگوں خوبیوں کی بنا پر اس کی شخصیت اس قدر دل کش ہے کہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں عبدالرحمٰن الناصر الحکم اور حاجب المنصور جیسی جلیل القدر ہستیوں کے پہلو میں اسے جگہ دی گئی ہے وہ محض میدان رزم کا ہی شہسوار نہ تھا بلکہ بزم شعرا کا بھی صدر نشین تھا زندگی کے مختلف مرحلوں میں دو عجیب و غریب شخصیتیں اس کے دوش بدوش جلوہ گر ہیں۔ ایک تو اس کا وزیر ابن عمار جسے سید ابن عیاض کی طرف سے

ملکۂ شعر وسخن عطا ہوا تھا۔ اور دوم اس کی بیوی اعتماد جس کے ساتھ انتہائی شغف کی بنا پر اس نے اپنا لقب المعتمد رکھا۔

ابن عمار اشبیلیہ کے پاس ایک گاؤں شنبوس کے ایک غریب خاندان کا نونہال تھا۔ قدرت نے اپنی فیاضی سے بہت حد تک اس کی تنگ دستی و ناداری کی تلافی کر دی تھی۔ وہ بڑا ذہین اور ادب و شعر کے نکات سمجھنے میں بڑا ماہر تھا۔ کہتے ہیں کہ ابتدائی زمانے میں وہ پرتگال کی بہشت۔ شلب میں بڑی خستہ حالت میں وارد ہوا اور اس کے ساتھ سواری کا ایک جانور تھا جس کی حالت اس کے مالک کے افلاس کی غمازی کر رہی تھی۔ ابن عمار نے صلہ کی خاطر شلب کے ایک تاجر کی تعریف میں قصیدہ کہا۔ اس ممدوح کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اس نے صلہ میں جَو کا بھرا ہوا توبرہ بھیجا۔ ظاہر ہے کہ شاعر کے احساس کو اس حاتم کے کارنامے سے کس قدر صدمہ پہنچا ہوگا۔ نہ معلوم یہ روایت کہاں تک صحیح ہے کہ جب ابن عمار کے دن پھرے اور شلب میں اس کا طوطی بولنے لگا تو اس نے اپنے پرانے فیاض ممدوح کا سُراغ ڈھونڈھ نکالا، اور وہی جَو کا توبرہ جو شاعر نے پوری حفاظت کے ساتھ اپنے پاس رکھ چھوڑا تھا درہموں سے بھر کر تاجر کے پاس روانہ کیا اور ساتھ ہی یہ کہلا بھیجا کہ اگر تم نے توبرہ میں گیہوں بھیجے ہوتے تو میں آج درہم کی جگہ دینار بھیجتا۔ معتمد بھی کم سن ہی تھا کہ اس کے باپ نے اسے شلب کا گورنر بنا دیا یہی وہ وقت ہے جب ابن عمار نے معتمد کے حضور میں رسائی حاصل کی اور اپنی خداداد قابلیت سے معتمد کے مزاج پر پوری طرح حاوی ہو گیا۔ شدہ شدہ جب ان گہرے تعلقات کی خبریں معتضد کے پاس پہنچیں تو اس نے ابن عمار کو اپنے بیٹے سے بہت دور پھینک دیا۔ یہ جدائی ابن عمار پر بڑی شاق گذری۔ چنانچہ وہ اپنے دردِ الم کا اظہار ان اشعار میں کرتا ہے۔

علیّ وَ الاّ ما بکاءُ الغمائم وفی وَ الاّ ما نیاح الحمائم

وعنّی اثار الرعد صرخة طالب لثار وهز البرق صفحة صارم

وما لبست نهر النجوم حدادها لغیری ولا قامت لہٗ فی ماتم

(بادلوں کا رونا اگر مجھ پہ نہیں ہے تو پھر کس پہ ہے؟ کبوتروں کا نالہ وزاری کرنا اگر میرے لئے نہیں ہے تو پھر کس کے لئے ہے؟ مجھ ہی سے تو رعد نے ایک بدلہ لینے والے کی طرح غل مچانا سیکھا ہے۔ اور مجھ ہی سے تو برق نے تلوار کا لہرانا سیکھا ہے۔ روشن ستاروں نے میرے لئے ہی تو یہ سوگ کے کپڑے پہنے ہیں۔ اور ماتم کرنے کو کھڑے ہوئے ہیں نہ کسی اور کے لئے)

معتضد کے مرنے پر ابن عمار کی ہرزہ گردی کا فسانہ ختم ہو گیا اور اس کی اپنی درخواست پر معتمد نے اسے شلب کا والی بنا دیا۔ لیکن یہ صورت حال زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی چونکہ معتمد کو اس کی جدائی گوارہ نہ تھی۔ اس لئے اسے اپنے پاس بلا کر قلمدان وزارت اس کے سپرد کر دیا۔ اپنی کارگزاری کی بدولت ابن عمار نے بڑا نام پایا اور اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی کہا جاتا ہے کہ یہ ابن عمار ہی تھا جس کی چالاکی اور بیدار مغزی نے ایک عرصہ تک الفانسو ششم کو اشبیلیہ، قرطبہ اور ان کے ارد گرد کے علاقوں پر حملہ کرنے سے باز رکھا۔ ابن عمار نے الفانسو کو لوٹانے کی یہ تدبیر سوچی کہ ایک بڑی خوبصورت شطرنج کی بساط اور مہرے بنوائے اور بلطائف الحیل الفانسو کو اپنی شرائط پر شطرنج کھیلنے کے لئے آمادہ کیا۔ الفانسو نے صرف بساط شطرنج پر ہی مات نہ کھائی بلکہ عہد و پیمان کی پاسداری نے اسے بساط سیاست سے بھی پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ چونکہ یہ شکست الفانسو کے لئے بڑے ذہنی اضطراب و کشمکش کا باعث تھی۔ اس لئے اس نے یہ شرط لگائی کہ سال رواں کے علاوہ اور دو سال کا خراج بھی اسے ادا کیا جائے۔ یہ شرط ابن عمار نے فوراً قبول کر لی۔

ابن عمار کا انجام بڑا دردناک تھا کہتے ہیں کہ اپنے انتہائی عروج کے زمانے میں بھی اسے اپنی آنے والی تباہی کا احساس تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ بُرے انجام کے ڈر کی وجہ سے اس سے ایک عجیب وغریب حرکت سرزد ہوئی، لیکن معتمد نے اس کے تمام اوہام وشکوک کو بے بنیاد ٹھہرا کر اسے پورا یقین دلادیا کہ اس کی جان و مال ہر طرح محفوظ ہے اس تمام عہد وپیمان کے باوجود آخر ہوا وہی جس کا ابن عمار کو کھٹکا تھا۔ اگر تاریخ کی شہادت کو شک وشبہ سے پاک سمجھا جائے تو بہت حد تک ابن عمار خود اپنی پریشانیوں کا ذمہ دار تھا۔

اپنی حدود سلطنت کی توسیع کی خاطر معتمد نے ابن عمار کی قیادت میں ایک بہت بڑا لشکر بھیجا تاکہ مرسیہ اور تدمیر کے علاقوں پر بھی اس کا پرچم لہرائے۔ کامیابی ابن عمار کے قدم چوم لیتی ہے اور وہ مرسیہ کے حاکم ابن طاہر کو وہاں سے نکال کر باہر کرتا ہے لیکن یہی فتح مندی ابن عمار کے ادبار و زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوئی، بڑھتے ہوئے جاہ و اقتدار کی وجہ سے اس کی نیت بگڑ گئی۔ اور اس کے دل میں ملینہ فتح کرنے کی امنگ پیدا ہوئی۔ خدا کی قدرت دیکھئے کہ مرسیہ کا ایک سپاہی زادہ ابن رشیق اس کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے۔ اب ابن عمار کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ انتہائی بے چارگی کے عالم میں مارا مارا پھرے۔ آخر اس کی قسمت نے اسے شقورہ کے قلعہ میں ایک زندانی کی زندگی بسر کردینے پر مجبور کردیا۔ معتمد کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے اپنے آدمی ابن عمار کو چھڑالانے کے لئے روانہ کئے۔ ابن عمار کو ایک قید خانہ سے نجات ضرور ملی مگر دوسرا بدتر قید خانہ اس کے لئے تیار تھا۔ قرطبہ اور اشبیلیہ کے شہروں میں بڑی ذلت اور رسوائی کی حالت میں اس کی تشہیر کرائی گئی۔ معتمد کے "القصر المبارک" کے پھاٹک کا جھروکہ اس زندانی کے حصہ میں آیا۔ اس قید کے دوران میں اس نے

بہت سے قصائد لکھے مگر سب بے سود بقول مراکشی، اگر ان قصائد کے توسل سے زمانہ سے مدد مانگی جاتی تو وہ اپنے جور سے باز آجاتا اور اگر ان کے طفیل فلک سے التجا کی جاتی تو وہ اپنی گردش چھوڑ دیتا۔ مگر وہ قصائد ایسے تعویذ تھے جنھوں نے کوئی اثر نہیں کیا، وہ ایسی دعائیں تھیں جو قبول نہیں ہوئیں اور وہ ایسے منتر تھے جو سودمند ثابت نہ ہوئے۔ ابن عمار مدتوں معتمد کی قید میں رہا اور آخر بڑی بے رحمی سے قتل کیا گیا۔

معتمد کی چہیتی بیوی اعتماد جس کی ناز برداری میں اس نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اپنے حسن و جمال سے زیادہ اپنی حاضر جوابی اور بذلہ سنجی کی بدولت قصر شاہی میں ملکہ کی حیثیت سے داخل ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک شام معتمد اشبیلیہ میں وادی الکبیر کے کنارے اپنی خاص گلگشت، خیابان سیمیں میں گوناگوں مناظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اس کی نظر پانی پر پڑی جہاں لہروں کے تموج نے ایک حلقہ در حلقہ زرہ بنا رکھی تھی۔ اس پر اس نے فوراً یہ مصرع کہا ع "صنع الریح من الماء زرد" ہوا نے پانی کی ایک زرہ بنادی ہے، اور اپنے مصاحب ابن عمار سے دوسرا مصرع موزوں کرنے کے لئے کہا ابن عمار ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کنارے پر ایک کپڑے دھونیوالی جوان لڑکی بول اٹھی۔ ای درع لقتال لو جمد (ایک جنگجو کے لئے یہ کیسی اچھی زرہ ہے اگر یہ منجمد ہوتی) اس حاضر جوابی پر تحسین آمیز حیرت کا اظہار کرتے ہوئے معتمد نے پوچھا کیا تم شادی شدہ ہو؟ جواب ملا، جی نہیں، معتمد یہ جواب سن کر خوش ہوا کہ اس کی نظر میں ایسی صاحب کمال ماہ جبین کی حقیقی جگہ شاہی حرم میں تھی، اس لڑکی کا نام اعتماد تھا، مگر وہ اپنے مالک رمیک کے نام سے رمیکیہ کہلاتی تھی۔ قصر سلطانی میں کوئی خاتون اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتی تھی اعتماد کی ہمسر امیر مستکفی کی باکمال بیٹی ولادہ تھی جس کو اس کے چاہنے والے شاعر اور وزیر ابن زیدون کے پرتاثیر اشعار نے

بقائے دوام کے دربار میں ایک مخصوص مقام کا مالک بنا دیا ہے۔ علم و فضل میں اعتماد اس کا جواب نہ تھی۔ مگر حسن و زیبائی اور دوسرے کمالات میں اپنے حریف سے کہیں بڑھ کر تھی۔ معتمد جان و دل سے اعتماد پر مفتون تھا۔ اور اس کی ہر خواہش کو خواہ وہ کتنی طفلانہ ہی کیوں نہ ہو ہر وقت پورا کرنے کے لئے تیار تھا۔ ایک مرتبہ جب اس نے چند عورتوں کو جو اینٹیں بنا رہی تھیں کیچڑ میں لت پت پایا تو اسے ان کی آزادی پر رشک آیا اور اس نے معتمد کے سامنے شکایات کا دفتر کھول دیا۔ معتمد جسے اپنی محبوب بیوی کی آزردہ خاطری ایک لمحہ کے لئے بھی منظور نہ تھی فوراً فرمائش کی تکمیل میں لگ گیا۔ شاہی حکم سے مشک کافور اور عنبر کے ایک بڑے انبار پر بہت مقدار میں گلاب چھڑکا گیا تاکہ نازک اندام ملکہ اپنی مصاحبات کے ساتھ اس معطر کیچڑ میں اپنا شوق پورا کر سکے۔ بہت دن بعد جب ایک بار آسودگان شکوہ طراز کی طرح اعتماد اپنے شوہر نامدار کی بے التفاتیوں اور نامہربانیوں کی شکایت کر رہی تھی تو معتمد نے وہی کیچڑ والا دن یاد دلایا اس پر اعتماد شرمندہ اور محجوب ہو کر رہ گئی۔

اپنی گوناگوں کمالات کی بنا پر اعتماد نے جو ناموری بھی حاصل کی ہو لیکن یہ واقعہ ہے فضلاء اسے کوئی اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے کیونکہ وہ معتمد کے شغل نای و نوش میں انہماک کا ذمہ دار ایک حد تک اعتماد کو ٹھہراتے تھے۔ عیش و طرب کی زندگی میں بے شک اعتماد اپنے خاوند کی شریک تھی لیکن اس کی زبردست سیرت اور کردار کا جوہر اس وقت چمکا جب معتمد تاج و تخت سے محروم ہو کر اغمات کے زندان میں دن کاٹ رہا تھا اور اعتماد جسے مراکشی سیدہ کبریٰ کہہ کر پکارتا ہے اپنی بیٹیوں کے ساتھ نہایت غربت اور افلاس کی زندگی بسر کر رہی تھی۔

معتمد کی شوکت و عظمت کی طرح اس کے زوال کی داستان بھی بڑی

دلچسپ ہے۔ طوائف الملوکی کے دور میں اندلس کے مسلمان فرماں روا اس درجہ کمزور ہو چکے تھے کہ عیسائی ہمسایوں کے حوصلہ مندانہ اقدام سے ان کے لئے بچاؤ کی ایک ہی صورت تھی اور وہ سالانہ خراج کا ادا کرنا تھا۔ قشتالہ کا الفانسو ششم اپنے حریفوں کو کمزور پا کر اور بھی حوصلہ مندی کا اظہار کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اس کا یہودی نمائندہ اشبیلیہ میں کچھ گستاخی سے پیش آیا جس کی پاداش میں اسے دار و رسن پر لٹکا دیا گیا۔ یہ خبر سن کر الفانسو کے غیظ و غضب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اور اس نے اشبیلیہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کے ارادے سے ایک جرار لشکر جمع کیا۔ اس خطرناک صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے مراکش کے سلطان یوسف بن تاشقین سے مدد کی درخواست کی۔ اس کے بعض بہی خواہوں نے اسے اس قسم کی درخواست کرنے سے باز رکھنا چاہا۔ اور کہا کہ ایک نیام میں دو تلواریں سما نہیں سکتیں لیکن اس پر معتمد نے وہ جواب دیا جو ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے، اس نے کہا کہ میرے لئے اونٹ چرانا سؤر کا رکھوالا بننے سے بہتر ہے (رعی الجمال خیر من رعی الخنازیر) یوسف بن تاشقین اپنے بہادر سپاہیوں کے ساتھ اندلس میں داخل ہوا اور زلاقہ کے مقام پر الفانسو کو بڑی سخت شکست دی۔ اگرچہ اس مہم کے سر انجام پانے پر یوسف مراکش واپس چلا گیا لیکن اس کا دل اندلس کے سر سبز مرغزاروں اور وادیوں میں الجھ کر رہ گیا اور کچھ مدت کے بعد اس کا ایک لشکر سیر بن ابی بکر کی قیادت میں اندلس روانہ ہو گیا ان معرکوں میں معتمد اور اس کے بہادر بیٹوں نے داد شجاعت دی ... لیکن بربری سپاہیوں کے مقابلہ کی تاب نہ لا سکے، شاہزادہ مامون قرطبہ میں اور شہزادہ الراضی زندہ میں کام آئے۔ ان بیٹوں کے قتل پر معتمد نے ایک دردانگیز مرثیہ لکھا جسے ہم بعد میں نقل کریں گے اب معتمد کو ایک

زندانی کی حیثیت میں اس کی بیوی اور بچوں سمیت مراکش بھیج دیا گیا۔ اغمات اس کا زندان خانہ قرار پایا۔ جہاں وہ ۴۸۸ ہجری میں قید بر برا اور قید حیات دونوں سے نجات حاصل کرتا ہے۔ اس ہنگامہ کارزار میں معتمد اور اس کے سپوتوں نے اپنی مردانگی و شجاعت کے وہ جوہر دکھائے کہ اندلس کے مورخ ان کی عالی ہمتی۔ شرافت اور بہادری کی تعریف مبالغہ آمیز پیرایہ میں کرتے ہیں

معتمد کی شاہانہ فیاضیوں نے اس کے دربار میں بڑے بڑے شعراء جمع کر دئے تھے ان سب کا سرفہرست ابن عمار تھا جس کا ذکر ہم پہلے کر آئے ہیں۔ مراکشی اس کے شاعرانہ کمال کا اعتراف ان الفاظ میں کرتا ہے:۔ وہ اندلس کے زبردست شعراء میں سے تھا اور ابوالقاسم محمد ابن ہانی اندلسی کے رنگ میں شعر کہتا تھا۔ بلکہ اس کے اکثر اشعار ابن ہانی سے بھی زیادہ لطیف و شیریں ہیں۔ اس کا دیوان اندلس میں ہاتھوں ہاتھ پھرتا ہے۔ میں نے اپنے ہمعصر علمائے ادب میں کسی کو ایسا نہیں پایا جو اس کے شعر کی خوبی و تاثیر کا قائل نہ ہو" ایک دوسرا شاعر مرسیہ کا رہنے والا عبدالجلیل بن دھیون اپنے عمدہ اور لطیف معانی کے لئے مشہور تھا۔ معتمد کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے اس کے سامنے عبدالجلیل کے یہ دو شعر پڑھے گئے ؎

قل الوفاء فما تلقاہ فی احدٍ ولا یمرُّ بمخلوق علی بال

وصار عندھم عنقاء مغربۃً او مثل ساحت تواعن الف مثقال

(وفا کمیاب ہے اور تو اسے کسی میں بھی نہ پائے گا۔ نہ کسی مخلوق کے دل میں اس کا خیال گذرتا ہے وہ ان کے لئے مثل عنقا کے ہو گئی ہے۔ یا مانند اس کے جیسے لوگ ہزار مثقال کی باتیں کریں) جب معتمد کو معلوم ہوا کہ اس کے خدام میں سے کوئی شخص ایسی بات کہتا ہے تو اسے بڑا تعجب ہوا اور اس نے حکم دیا کہ عبدالجلیل کو ایک ہزار مثقال دئے جائیں۔

صقلیہ کا ایک شاعر ابوالعرب معتمد کے دربار میں حاضر ہوا۔ یکسال سے

نئے لائے ہوئے دیناروں کی دو تھیلیاں شاعر کو انعام میں دی گئیں۔ جس کی توجہ عنبر کے بنائے ہوئے اس مرصع اونٹ کی طرف گئی جو معتمد کی مجلس کی زینت تھا چنانچہ اس نے معتمد سے کہا کہ تھیلوں کو اٹھانے کے لئے ایک اونٹ کی ضرورت ہے۔ معتمد نے وہ گراں بہا مرصع اونٹ شاعر کو بطور انعام کے دیدیا۔ صقلیہ کا ایک دوسرا شاعر عبد الجبار بن حمدیس مدت تک صلہ و بخشش کا انتظار کرتے کرتے تھک جاتا ہے۔ آخر ایک روز اپنی بدیہہ گوئی سے معتمد کو خوش کر کے بڑے انعام و اکرام کا سزاوار ٹھہرتا ہے۔

جب معتمد طنجہ میں بحیثیت زندانی کے پہنچ گیا تو شاعر الحصری نے اپنی کتاب المستحسن من الاشعار (گلدستۂ سخن) معزول بادشاہ کی خدمت میں پیش کی۔ معتمد نے کسی طرح اپنے جوتوں میں چھتیس مثقال چھپا لئے تھے وہی چھتیس مثقال جن پر پاؤں کے خون کے دھبے نمایاں تھے۔ معتمد حصری کو عطا کر دیتا ہے اور ساتھ ہی اس بات کی معذرت بھی کرتا ہے کہ یہ انعام بڑا حقیر ہے۔

معتمد کے مداحوں کا سلسلہ بڑا دراز ہے۔ اور یہ مختصر مضمون ان کے تذکرہ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ تاہم اس سلسلہ میں ایک شاعر ابن اللبانہ کو نظر انداز کیا نہیں جا سکتا۔ جب تک معتمد زندہ رہا ابن اللبانہ اس کے گن گاتا رہا۔ عام شعراء کے برخلاف اس کی اپنے ولی نعمت سے وفاداری بڑی پائدار اور غیر متزلزل رہی۔ عبادی خاندان کی تاریخ اس نے الاعتماد فی اخبار بنی عباد کے نام سے لکھی جس میں مصنف نے بنی عباد کی دل کھول کر تعریف کی۔ اس کے علاوہ اس نے دو اور کتابیں لکھیں جن میں معتمد اور ان کے بیٹوں کے اشعار نقل کئے گئے ہیں۔ ان کتابوں کے نام یہ ہیں۔ نظم السلوک فی مواعظ الملوک اور سقیط الدرر و لقیط الزھر"

معتمد خود ایک بلند پایہ شاعر تھا جس کے حسن کلام کے بڑے بڑے ادبی نقاد معترف تھے۔ ابن بسام اس کے کلام کو شگوفوں کے کھلنے سے

تشبیہہ دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ اگر یہ کلام ایسے شخص کا بھی ہو جس کا پیشہ ہی شاعری ہے۔ جب بھی ان اشعار کی دلفریبی و دلآویزی کا قائل ہونا پڑے گا۔ مراکشی اپنی المعجب میں، ابن خلکان اپنی وفیات میں اور مقری اپنی نفح الطیب میں کثرت کے ساتھ اس کے اشعار نقل کرتے ہیں۔ اور اس کے حسن بیان اور لطف معانی کے مداح ہیں۔ اب ہم ذیل میں اس کے کلام کے چند نمونے پیش کرتے ہیں۔

معتمد کی محفل شراب میں ساغر کا دور چل رہا ہے اور دوسری طرف موسلا دھار بارش کی وجہ سے ہر سمت ندی نالے جاری ہیں۔ اور درختوں کی شاخیں ایک سجی سجائی دلہن کی طرح آراستہ ہیں۔ ایک پری پیکر لونڈی شراب کا پیالہ ہاتھ میں لئے کھڑی ہے کہ اتنے میں بجلی کوندی جس کی وجہ سے وہ کانپ اٹھی ہے۔ اس پر معتمد نے فی البدیہہ کہا ہے:

روّعها البرق وفی کفها
برقٌ من القهوة لماع
عجبت منها وهی شمس الضحیٰ
کیف من الانوار ترتاع

(وہ بجلی کوندنے سے ڈر گئی حالانکہ اس کے اپنے ہاتھ میں شراب کی برق درخشاں ہے، وہ خود چاشت کے سورج کی طرح ہے۔ پھر حیران ہوں کہ وہ کیونکر روشنی سے ڈر گئی)

اپنی محبوب لونڈیوں کو قرطبہ سے اشبیلیہ روانہ کرتے وقت اول شب سے پو پھٹنے تک معتمد ان کے ساتھ ساتھ چلتا ہے، الوداع کہتے ہوئے اس کے دلی جذبات کی جو کیفیت تھی اس کی تصویر اس نے اس طرح کھینچی ہے کہ

سائرتهم واللیل عقد ثوبه
حتی تبدی للنواظر معلما

فونفت موذعًا وتسلمت

منی الاصباح تلک الانجما

(میں اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اس حالت میں کہ رات نے اپنی پوشاک باندھ رکھی تھی۔ یہاں تک کہ وہ آنکھوں کو منقش دکھائی دی میں ان کو الوداع کہنے کے لئے رکا۔ تب صبح کے ہاتھ نے مجھ سے وہ ستارے چھین لئے)

ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ اپنے بیٹوں، ماموں اور الراضی کے قتل کئے جانے پر معتمد نے نہایت موثر اور درد انگیز اشعار لکھے ہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ ایک آشیانے میں دو پرندے باہم مل کر دادِ عیش دے رہے ہیں۔ اور ذوق نوا سنجی انھیں نغمہ سرائی پر اکسا رہا ہے۔ ان سے ذرا فاصلہ پر ایک قمری اپنے ساتھی کی جدائی میں بڑے سوز و درد کے ساتھ نالہ و شیون میں مصروف ہے۔ اور مونس و غم گسار کی یاد اسے بری طرح تڑپا رہی ہے۔ یہ منظر دیکھ کر معتمد کا حساس دل تڑپ اٹھتا ہے۔ قمری کا ایک رفیق گم ہو گیا ہے۔ اور اس کے گم ہو جانے پر وہ اس درجہ پریشان خاطر ہے بھلا معتمد جس کے اتنے عزیز اور ساتھی اس سے جدا ہو گئے ہیں۔ کس طرح اپنے دل کو قابو میں رکھ سکتا ہے۔ اس درد و الم کی داستان خود معتمد کی زبانی سننے کے لائق ہے

بکت ان رأت الفین منتھا وکر

مساء وقد اختی علی الفھا الدھر

وناحت وباحت فاستراحت بسرھا

وما نطقت حرفا یبوخ بہ سر

فمالی لا ابکی ام القلب صخرۃ

وکم صخرۃ فی الارض یجری بھا نھر

بکت واحد الم یشجھا غیر بعدہ

وابکی لالاف عدیدھم کثر

ونجمان زین الزمان بامنواھما
بقرطبه النکراء او برندۃ القابر
عذرت اذن ان ضن خفی بقطرۃ
وان لزمت نفسی صاحب الصابر
فقل للنجوم الزھر تبکیھما معی
لمثلھما فلتحزن الانجم الزھر

(جب سرشام قمری نے دو ساتھیوں کو ایک گھونسلہ میں باہم پایا تو وہ رو پڑی۔ اس لئے کہ زمانہ نے اس کے ساتھی کو اس سے چھین لیا تھا۔ وہ نوحہ کرتی رہی اور اس نے اپنا راز فاش کر دیا۔ اور اس افشائے راز اسکو یک گونہ سکون حاصل ہوا۔ لیکن وہ ایک لفظ ایسا نہ بولی جس سے راز فاش ہو۔ مجھے کیا ہو گیا ہے کہ مجھے رونا نہیں آتا۔ کیا میرا دل ایک پتھر کا ٹکڑا ہے۔ حالانکہ زمین میں کتنے پتھر ہیں۔ جن سے ندیاں جاری ہوتی ہیں۔ قمری صرف ایک ساتھی کے گم ہونے کا رونا رو رہی ہے۔ اور میں بے شمار رفیقوں کا ماتم گسار ہوں۔ میرے بیٹے (ماموں اور الرضی) زمانہ کی زینت ایسے دو ستارے تھے جو قرطبہ اور رندہ کی سرزمین میں قبروں میں مدفون ہیں۔ میں گناہ بے وفائی کا مرتکب ہوں گا اگر میری آنکھوں نے قطرۂ اشک بہانے میں بخل کیا۔ یا میرا نفس اپنی دنایت کی وجہ سے صبر کا دامن پکڑے۔ روشن ستاروں سے کہو کہ میرے ساتھ گریہ و بکا میں شریک ہوں۔ ان جیسے دو کی موت پر ہی درخشاں ستاروں کو غمزدہ ہونا چاہیئے۔

اشبیلیہ میں معتمد کی بہترین نشست گاہ زاہی تھی۔ جس کی دلکشی۔ فواروں کی کثرت، اور زیتون کے درختوں کی وجہ سے دوبالا ہو گئی تھی۔ اس نشست گاہ کا شاندار گنبد بابرکت ہونے کی وجہ سے سعد السعود (مبارک ترین) کہلاتا تھا۔ جب معتمد کو دیار غیر میں بے کسی و بے چارگی کے دن گذارنے پڑے تو

کبھی کبھی اسکو زاہی کی یاد ستایا کرتی تھی چنانچہ وہ کس حسرت سے کہتا ہے:۔

غریب بارض المغربین اسیر
یبکی علیہ منبر و سریر
وتند بہ البیض الصوارم والقضا
وینھل دمع بینھن غزیر
فیالیت شعری ھل ابیتن لیلۃ
امامی وخلفی روضۃ وغدیر
بمنبتۃ الزیتون مورثۃ العلیٰ
تغنّی حمامٌ او ترن طیور
بنارھا السامی الذری جادہ الحیا
تشیر الثریا نحونا ونشیر
ویلحظنا الزاھی وسعد سعودہ
غیورین والصب المحب غیور
تراہ مسیر الاسیر منالہٗ
الا کل ماشاء الالہ یسیرٗ

دیر پردیسیوں کی سرزمین میں ایک غریب الوطن زندان کی مصیبتیں جھیل رہا ہے دوسری طرف تخت و منبر اس کا ماتم کر رہے ہیں اور براق و تیز تلواریں اور نیزے اس پر رو رہے ہیں۔ اور ان کے آنسوؤں کی ایک جھڑی لگ گئی ہے۔ کاش میں جانتا کہ کبھی میرے نصیب میں کسی ایسی رات کا سونا بھی نصیب ہوگا۔ جبکہ میرے سامنے اور پیچھے باغ اور جھیل ہوں۔ اور جہاں زیتون کے درخت صفیں باندھے کھڑے ہیں اور ان پر کبوتر اور دوسرے پرندے چہچہا رہے ہیں۔ جہاں بلند ٹیلہ ہے۔ جس کو بارش نے شاداب کر رکھا ہے۔ جہاں ثریا اور ہم ایک دوسرے کو اشارے کر رہے ہیں۔ جہاں زاھی کی نشست گاہ اور اس کا گنبد

سعد السعود ہماری طرف جھانک رہے ہیں۔ یہ دونوں غیرت مند ہیں، اور ایک عاشق غیرت مند نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا۔ اے معتمد تو اس مقصد کے حصول کو مشکل سمجھتا ہے۔ تجھے یاد رہنا چاہیے کہ جو چیز خدائے تعالیٰ چاہے وہ آسان ہوا کرتی ہے)

ظاہر ہے کہ ایک قیدی کی عمر کتنی حسرتناک ہوتی ہے۔ جب معتمد اغمات میں بحالت اسیری درد و محن میں گھر جاتا ہے تو پردیس میں پہلی عید کے موقع پر اس کے بچے سلام اور عید مبارک کہنے کے لئے اس کے پاس جاتے ہیں۔ اپنی بیٹیوں کی پراگندہ حالی دیکھ کر معتمد کا دل کڑھتا ہے۔ اور وہ اپنے رنج و اضطراب کا اظہار ان درد انگیز اشعار میں کرتا ہے۔

فیما مضیٰ بالاعیاد مسروراً
فساءك العید فی اغمات ماسورا
تری بناتك فی الاطمار جائعۃ
یغزلن للناس ما یملکن قطمیرا
برزن نحوك للتسلیم خاشعۃ
ابصارھن حسیرات مکاسیرا
یطان فی الطین والاقدام حافیۃ
کانما لم تطأ مسکا و کافورا

(گزشتہ زمانہ میں عید تیرے لئے مسرت کا پیغام لائی تھی۔ لیکن ہائے کیا بری ہے یہ عید کہ تو اغمات کے زندان میں سڑ رہا ہے۔ تیری بیٹیاں چیتھڑوں میں ملبوس اور بھوک کی ماری ہیں۔ ان کی ناداری حد سے بڑھی ہوئی ہے۔ اور وہ دوسروں کے لئے سوت کاتتی ہیں۔ آج وہ تیرے سلام کو باہر نکلی ہیں۔ ان کی آنکھیں شرم کے مارے جھکی ہوئی ہیں۔ اور ملال و کوفت کے آثار ان کے چہروں پر نمایاں ہیں۔ ننگے پاؤں وہ کیچڑ میں سے گزرتی ہیں۔ زمانہ کی نیرنگی

دیکھو گویا وہ کبھی مشک وکافور پر چلی ہی نہ تھیں۔

معتمد کے بیٹے بھی شعر وادب کے ویسے ہی دلدادہ تھے۔ جیسے کہ ان کا باپ، چنانچہ ان کی بدیہہ گوئی اور نازک خیالی کے کئی نمونے ادب کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ اشبیلیہ میں قتل وغارت کے وقت معتمد کی ایک بیٹی بثینہ نامی جو حسن وجمال، بذلہ سنجی اور سخن گستری میں اپنی ماں اعتماد کا جواب تھی لوٹنے والوں کے ہاتھ میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ اشبیلیہ کا ایک سوداگر اس کو خرید کر اپنے بیٹے کے سپرد کرتا ہے۔ بثینہ اپنے ہونے والے شوہر سے صاف صاف کہہ دیتی ہے کہ وہ اس کی بیوی تو بن سکتی ہے لیکن لونڈی کی حیثیت میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ اپنے والد معتمد اور رمیکیہ کو چند اشعار میں اپنے حالات سے مطلع کر کے ان کی رضامندی اور دعاؤں کی خواستگار ہوتی ہے۔ معتمد اور اعتماد یہ معلوم کر کے کہ ان کی لاڈلی بیٹی زندہ ہے بہت خوش ہوئے اور بہ رضا ورغبت اس کو شادی کی اجازت دی۔

۴۸۸ ہجری میں معتمد دنیا کے مصائب سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا حاصل کرتا ہے۔ اور شہر اغمات میں ایک بلند ٹیلے پر اپنی آخری آرام گاہ میں میٹھی نیند سونے کے لئے فروکش ہوتا ہے۔ قدرت کا کرشمہ دیکھئے کہ وہ عظیم الشان بادشاہ جس کی کثرت حشم کی سارے اندلس میں دہوم تھی بے یار و مددگار پردیس میں بے کسی کی موت مرتا ہے۔ اور لوگ پردیسی کی نماز جنازہ (الصلوٰۃ علی الغریب) کی صدائیں بلند کرتے ہیں۔ معتمد کی بلند مرتبت شخصیت میں کچھ ایسی دلکشی اور جاذبیت تھی کہ دور دراز علاقوں میں لوگوں نے اس کا ماتم کیا اور شعراء وادبا نے اس کے اوصاف ومحاسن بیان کرنے میں ایک دوسرے سے گوئے سبقت لے جانے کی کوشش کی۔ مقری نے سچ کہا ہے کہ معتمد کے حالات دلوں کو پگھلا دیتے ہیں۔ ان کی موت کے کچھ عرصہ بعد ایک شاعر ابو بحر بن عبدالصمد جو بارہا معتمد کے انعام وبخشش سے سرفراز ہو چکا تھا۔ عید

کے دن اس کی قبر کا طواف کر کے اُسے چومتا ہے۔ اور اُسے خطاب کر کے مرحوم بادشاہ کی خوبیوں کا ذکر ایسے موثر پیرایہ میں کرتا ہے کہ سننے والوں کے دل دہل جاتے ہیں۔ اور وہ کبھی خراج تحسین کے بطور اشکبار آنکھوں کے ساتھ معتمد کی قبر کا طواف کرتے ہیں۔

اندلس کا مشہور ادیب اور مورخ اور غرناطہ کا وزیر لسان الدین بن الخطیب ۷۹۱ ہجری میں معتمد اور اعتماد کی قبروں کی زیارت کر کے انتہائی اشتیاق ومحبت میں اپنے دلی جذبات کا اظہار ان اشعار میں کرتا ہے۔

لقد زرت قبرك عن طوع باغمات
رايت ذالك من اولى المهمّات
لم لا ازو رك يا اندى الملوك ندىً
ويا سراج الديالى المد لهمات
كرمت حيًا وميتًا واشتهرت
فانت سلطان احياءٍ واموات
ولا يرى مثلك فى ماضٍ ومعتقدى
ان لا يرى الدهر فى حال ولا آت

(میں نے برضا ورغبت اغمات میں تیری قبر کی زیارت کی اور اس کو اپنے لئے ایک اہم اور ضروری کام سمجھا۔ اے فیاض ترین بادشاہ اور اے تاریک راتوں کے روشن چراغ۔ میں تیری زیارت کیوں نہ کروں۔ زندگی اور موت دونوں حالتوں میں تو شریف اور ممتاز ہے۔ اور زندوں اور مردوں سب کا بادشاہ ہے۔ گذشتہ زمانے میں تمہارا مثل نہیں دیکھا گیا۔ اور میرا ایمان ہے کہ حال اور مستقبل میں تمہارا نظیر ملنا ناممکن ہے۔

نفح الطیب کا مصنف مقری ۱۰۱۰ھ ہجری میں معتمد اور اعتماد کی قبروں پر جاتا ہے جہاں اس کی رہبری ایک بہت بوڑھے آدمی نے یہ کہہ کر کی کہ یہ

اندلس کے ایک بادشاہ کی قبر ہے۔ اور یہ اسکی محبوب بیوی کی قبر ہے، جس پر وہ سو دل سے قربان تھا۔ یہ منظر دیکھ کر مقری کے دل پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔

مقری نے بالکل سچ کہا ہے کہ معتمد کے حالات کے لئے کئی جلدیں درکار ہیں۔ اور آج تک مغرب میں اس کے کارنامے زندہ جاوید ہیں۔ (اخبار المعتمد تحتمل مجلدات و آثارہ الی الان بالغرب مجلدات)

ماخذ:۔ نفح الطیب از مقری، المعجب از المراکشی۔ اور اس کا اردو ترجمہ از مرحوم پروفیسر نعیم الحق، وفیات الاعیان از ابن خلکان، ڈوزی کی ہسپانیہ میں مسلمان۔ وزڈم آف دی ایسٹ سیریز میں بادشاہ اشبیلیہ معتمد کی نظمیں۔

باقر علی ترمذی مرحوم

خوش درخشید ولے کوکب مستعجل بود

۱۱ر جون ۱۹۵۱ء سے پہلے اس بات کا کبھی وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ مجھے اس شخص پر مضمون لکھنے کی ضرورت پڑے گی جو گزشتہ تین سال کے دوران میں مجھ سے متعدد مضامین لکھوا چکا ہے۔ جس کے پیہم اصرار کے باوجود کئی بار میں اپنی طبیعت کو کچھ لکھنے پر مائل نہ کر سکا لیکن جس کی ترغیب و فرمائش میں کبھی ذرہ بھر کمی واقع نہ ہوئی۔ ان کی زندگی میں میں نے بارہا لکھنے کے معاملہ میں تساہل سے کام لیا ہے۔ لیکن آج جبکہ وہ ملأ اعلیٰ میں پہنچ چکے ہیں، کسی قسم کی سہل انگاری کو روا نہیں رکھا جا سکتا۔

مارچ ۱۹۳۹ء کا ذکر ہے کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کی تشریف آوری پر پروفیسر نجیب اشرف ندوی نے صوبہ کے مختلف اضلاع سے انجمن ترقی اردو کی شاخوں کے نمایندوں کو دعوت دی تاکہ وہ موصوف کے مکان پر مولوی عبدالحق صاحب سے اردو کی ترقی کے سلسلہ میں بات چیت کر سکیں۔ اس زمانے میں تعلیم بالغان کا بڑا چرچا تھا۔ چنانچہ بمبئی میں کئی جگہ اسی غرض سے شبینہ مدارس کھولے گئے تھے۔ مولوی صاحب کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر انجمن ترقی اردو بمبئی کے ارباب حل و عقد نے ان سے ان مدارس کے معائنہ کی استدعا کی جسے انھوں نے بہ طیب خاطر منظور کیا۔ مولوی صاحب اور پروفیسر نجیب اشرف کے ہمراہ مجھے بھی ان مدارس کے دیکھنے کا موقع ملا۔ اندھیری کے ایک مدرسہ میں جو ورسوا روڈ پر واقع تھا، ایک مستعد نوجوان بالغوں کو بڑے شوق

اور جوش سے سبق پڑھا رہا تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ نوجوان جوناگڈھ کالج کے پروفیسر سید محمد علی ترمذی کے صاحب زادے ہیں۔ انھیں اسی تعلیم و تدریس کے عالم میں محو چھوڑ کر مہمان وہاں سے چل دیئے اس لئے تعارف کی صورت پیدا نہ ہو سکی

حسن اتفاق سے نومبر ۱۹۳۹ء میں اسمٰعیل کالج کے سابق پرنسپل مرحوم ڈاکٹر محمد بذل الرحمٰن نے مجھے احمد آباد سے کھینچ بلایا۔ ہر چند میں نے کوشش کی کہ یہ تبادلہ منسوخ ہو جائے لیکن اس میں ناکام رہا۔ جن احباب اور کرم فرماؤں کی بدولت میں نے نئی فضا کو اپنے لئے سازگار پایا ان میں میرے مکرم دوست ڈاکٹر حسین الہمدانی بھی تھے۔ ان کو عربی زبان اور عربیت سے حد درجہ شغف تھا اور ان کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ زیادہ سے زیادہ طالب علم عربی سیکھیں۔ ان کے ہونہار طالب علموں میں ایک باقر علی ترمذی بھی تھے۔ باقر علی کی سب سے بڑی تعریف یہ ہے کہ وہ صحیح معنی میں طالب علم تھے۔ میں نے بارہا دیکھا کہ وہ جماعت کے کمرے سے باہر کسی علمی، ادبی یا دینی موضوع پر اپنے کسی اُستاد یا طالب علم دوست سے مذاکرہ و مکالمہ میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ ان کی متجسسانہ نگاہیں ایسے لوگوں کو ڈھونڈھ لیتی تھیں جن کی صحبت میں وہ اپنی علمی پیاس بجھا سکیں۔ ہمدانی صاحب کے مکان پر وہ اکثر آتے رہتے اور مختلف علمی مسائل میں ان سے استفادہ کرتے۔ اپریل ۱۹۴۲ء کے ایم۔ اے کے امتحان میں انھوں نے عربی میں اول درجہ ہی حاصل نہیں کیا بلکہ چانسلر کے طلائی طمغے کے بھی مستحق ٹھہرے جو بمبئی یونی ورسٹی میں ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔

امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد وہ جوناگڈھ واپس چلے گئے اور وہاں دو تین سال تک مہابت مدرسہ، بہاء الدین کالج اور راجکوٹ کالج میں معلمی کے فرائض ادا کرتے رہے۔ اس قیام گاہ جوناگڈھ کے اثنا

میں بھی وہ کبھی کبھی بمبئی آتے اور اپنے اساتذہ اور احباب سے تجدید ملاقات پر ہی اکتفا نہ کرتے بلکہ اپنے علمی ذوق اور سرگرمی کا ثبوت بھی دیتے جب کبھی بھی وہ میرے یہاں آئے اور مجھ سے گفتگو کی ان کی جس چیز کا مجھ پر سب سے زیادہ اثر پڑا وہ ان کا علمی انہماک اور تجسس تھا۔ مبدء فیاض سے انھیں ایک تجسس پسند طبیعت اور بیقرار دل ملا تھا۔ ان کی یہ بیقراری انھیں ہمیشہ لیلائے کتب کی تلاش میں سرگرداں رکھتی۔ جب بھی دیکھئے کسی نئی کتاب کا سودا انھیں پریشان کئے ہوئے ہے۔

قیام جوناگڈھ کے دوران میں باقر علی اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ کے لئے ضروری مواد فراہم کرتے رہے۔ ان کے والد اور قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڈھی نے ان کی علمی امداد اور رہنمائی کی لیکن انھوں نے اسی پر اکتفا نہیں کی، وہ شیخ شیراز کے اس اصول پر عمل پیرا تھے کہ

تمتع زہر گوشۂ یافتم ‏ ‏ ‏ ‏ زہر خرمنی خوشۂ یافتم

چنانچہ عربی زبان کے مشہور ادیب اور محقق مولوی عبدالعزیز میمن پروفیسر مسلم یونی ورسٹی علی گڈھ سے بھی انھوں نے استفادہ کیا۔ اگرچہ جوناگڈھ میں ان کی علمی جستجو اور تلاش جاری تھی۔ تاہم انھیں اس دور افتادہ مقام پر وہ سہولتیں میسر نہ تھیں جن کے وہ آرزو مند تھے۔

حسن اتفاق سے ۲۶۔ نومبر ۱۹۴۳ء کو اسمٰعیل یوسف کالج جوگیشوری بمبئی میں ان کا تقرر بحیثیت لکچرر عمل میں آیا یہاں کی سازگار فضا میں ان کے اصلی جوہر کھلے اور انھیں اپنے ذوق تحقیق و جستجو کی تسکین کے لئے ایک وسیع میدان مل گیا۔ طابہ نے فوراً محسوس کیا کہ علمی افق پر ایک نیا ستارہ نمودار ہوا ہے اور ڈاکٹر بندل الرحمٰن اور دوسرے رفقائے کار نے اس سچے طالب علم کی حوصلہ افزائی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ تدریس و تعلیم سے کہیں زیادہ باقر علی کا دل علمی

مسائل کی چھان بین میں لگتا تھا، چنانچہ وہ فرائض منصبی کی ادائگی کے ساتھ ساتھ اپنے شفیق استاد ڈاکٹر حسین الہمدانی کی رہنمائی میں علمی مقالہ کی ترتیب و تکمیل میں پوری تندہی سے مصروف رہے اور کئی سال کی پیہم محنت اور جانفشانی کے بعد ۱۹۴۷ء میں انھوں نے ڈاکٹریٹ کے لئے مقالہ پیش کیا جس کی ممتحنین نے بہت تعریف کی۔

باقر علی کا خاندان اپنی علمی روایات کے لئے مشہور رہا ہے۔ ان کے دادا ایک اچھے شاعر تھے اور ان کے والد سید محمد علی تہذی کئی سال تک جوناگڈھ کالج میں فارسی اور عربی کے پروفیسر تھے۔ درحقیقت باقر علی کو علمی ذوق اپنے بزرگوں سے بطور ترکہ ملا تھا۔ اس ذوق کے ساتھ ساتھ بلا کے محنتی اور جفاکش تھے اور ہر وقت نئے نئے موضوع تلاش کرتے جن پر یا تو خود مضمون لکھتے یا اپنے دوستوں سے لکھواتے۔ ان کی طالب علمانہ زندگی ان کے رفقائے کار کے لئے ایک شمع راہ تھی۔ جس کسی کا بھی ان سے ربط ضبط بڑھتا ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ ان کے پاس ترغیب و تحریص کے ایسے موثر اسلحہ تھے کہ جوان تو جوان بوڑھوں کو بھی رام کر لیتے تھے اور ان سے مضمون لکھوا کر ہی دم لیتے تھے۔ وہ زیادہ تر انگریزی میں لکھتے تھے لیکن آخر آخر میں اُردو کی جاذبیت نے بھی انھیں اپنی طرف مائل کر لیا تھا آخری تین چار سال کے عرصہ میں انھوں نے کئی مضمون سپرد قلم کئے جو ہندوستان، پاکستان، انگلستان اور جنوبی افریقہ کے جرائد و رسائل میں شائع ہوئے۔ یوں تو ان کے مضامین تفتیش و تحقیق کے آئینہ دار ہوتے تھے لیکن ان کا شاید بہترین علمی مضمون وہ تھا جو انھوں نے نومبر ۱۹۴۸ء میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے اجلاس بمبئی میں پڑھا اور جو اسلامک کلچر حیدرآباد کے شمارہ بابت اکتوبر ۱۹۵۰ء

میں شائع ہوا۔ اس محققانہ مقالہ میں انھوں نے مسلمان سیاحوں کے بیانات کی مدد سے یہ بات پایۂ تحقیق تک پہنچائی ہے کہ ایران میں زرتشتیوں کے آتش کدے بالکل سرد نہ پڑ گئے تھے بلکہ چھٹی۔ ساتویں صدی ہجری تک مشہور عبادت گاہوں میں مقدس آتش حسب دستور روشن تھی۔ ان کا ایک فاضلانہ تحقیقاتی مقالہ گجرات میں عربی زبان کی خدمت سے متعلق ہے۔

باقر علی مانگرول کے مشہور ترمذی خاندان کے نونہال تھے۔ اس خاندان میں یہ روایت نسلاً بعد نسل چلی آرہی ہے کہ ان کے جدامجد سید سکندر ترمذی مانگرول کے فاتح تھے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس روایت میں واقعیت کس قدر ہے۔ البتہ یہ سچ ہے کہ مانگرول میں ترمذی خاندان کو ہمیشہ ایک امتیازی حیثیت دی جاتی رہی ہے۔

چونکہ سید سکندر حضرت مخدوم جہانیان جہاں گشت سے بیعت تھے اس لئے اُن کی اولاد کو بخاری بزرگوں سے بڑی عقیدت رہی ہے ہمارے باقر علی بھی حضرت شاہ عالم احمد آبادی کے ساتھ عقیدتمندانہ وابستگی رکھتے تھے۔ جہاں کہیں انھیں بخاری سادات کے تذکرہ کا موقع ملتا وہ ان کے اوصاف و محاسن مزے لے لے کر بیان کرتے اور پھر بھی اُن کی طبیعت کو سیری نہ ہوتی۔ تصوف کی طرف ان کا میلان بھی اسی دلبستگی کا نتیجہ تھا۔

باوجود اس کے کہ ان کے مذہبی خیالات میں ایک قسم کا تصلب پایا جاتا تھا وہ زندہ دل، شگفتہ مزاج اور یار باش تھے۔ خلوت سے زیادہ انھیں جلوت پسند تھی، ہر وقت دوستوں کے جھرمٹ میں نظر آتے تھے۔ خوش قسمتی سے انھیں ہر طبقہ کے لوگوں سے دوستی کا فخر حاصل تھا۔ اسمٰعیل کالج کا کامن روم ہو یا چائے کی میز ان کا

ایک خاص انداز سے گفتگو کرتا ہر شخص کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔ ان کے چہرے سے بظاہر ان کا بھاری بھرکم ہونا نظر آتا تھا لیکن حقیقت میں وہ ایک دل گداختہ رکھتے تھے، ان کو ہر مظلوم سے ہمدردی تھی اور ان کا محبت آمیز سلوک کسی ایک طبقہ یا فرقہ تک محدود نہ تھا بلکہ سب کے ساتھ ان کا یکساں طور پر دوستانہ برتاؤ تھا۔ گو وہ طبعاً متین اور آہنی عزم کے آدمی تھے تاہم احباب کی محفل میں ان کی بے تکلفی اور گل افشانی حاضرین کے لئے انبساط و مسرت کا سرمایہ ہوا کرتی تھی۔ وہ عملی طور پر رندی کے کوچے سے ناآشنا رہے تاہم ان کی زندہ دلی اور ہنگامہ آرائی ایک رند خراباتی کی یاد تازہ کر دیتی۔ وہ محض زندہ رہنے کے قائل نہ تھے بلکہ حقیقی اور بھرپور زندگی گذارنے کے فن سے بھی آشنا تھے۔ خواہ وہ گھر پہ ہوں یا کالج میں ان کی زندہ دلی اور ہنگامہ پسندی ان کا ساتھ نہ چھوڑتی تھی۔ ان کے جوش کا بے پناہ سیلاب کبھی کبھی اعتدال کی حد سے بھی گزر جاتا تھا۔ لیکن بقول اقبال ع

گناہ گاہ گاہ من صوابیست

مطالعہ کتب کے علاوہ بھی وہ گوناگوں مشاغل میں اُلجھے رہتے تھے۔ کبھی خاندانی الجھنیں سلجھانے میں مصروف ہیں اور کبھی خانگی امور کی غور و پرداخت ان کی سرگرمیوں کا محور ہوتی۔ ان میں کام کرنے کی صلاحیت حد سے زیادہ تھی۔ ان کے فلسفۂ زندگی کا مرکزی نقطہ عمل پیہم تھا۔ نہ وہ خود چین سے بیٹھتے اور نہ دوسروں کو بیٹھنے دیتے۔ کالج سے اپنے فرائض منصبی ادا کرنے کے بعد اکثر وہ شہر کا رخ کرتے۔ شہر کا شاید ہی کوئی قابل ذکر کتب خانہ ہوگا جس کی انھوں نے سیر نہ کی ہو۔ بمبئی یونی ورسٹی، بمبئی ایشیاٹک سوسائٹی، کاما انسٹی ٹیوٹ اور جامع مسجد کے کتب خانے ان کی علمی فتوحات کے مرکز تھے۔ ان کتاب خانوں میں اسلامیات سے متعلق تمام نادر مخطوطات ایک ایک کر کے ان کے علم میں تھے اور وقتاً فوقتاً وہ ان سے

اقتباس کرتے رہتے۔ فرصت کی اکثر شامیں باندرہ میں دریا کے کنارے گذارتے تھے جو ان کی روانگی کے بعد سے سنسان نظر آتا تھا۔ کبھی کبھی اپنے خاص دوستوں کی صحبت میں "مرین ڈرائیو" پر چہل قدمی اور خوش گپی کرتے دکھائی دیتے۔ سیر کے حد درجہ شوقین تھے۔ چلنے پھرنے سے کبھی نہ گھبراتے تھے ان کی مجلس آرائیاں اپنے لئے بمبئی کے اچھے اچھے مقامات کو ڈھونڈھ لیتی تھیں۔ برسات کے موسم میں "کافے ناز" میں بیٹھ کر دریا کے نظارے سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ دوستوں کو اپنے گھر پر انھوں نے کبھی مدعو نہیں کیا، البتہ بعض اچھے "ریسٹوراں" میں بارہا میزبانی کے فرائض انجام دیتے اور دوستوں کی خاطر مدارات کر کے خوش ہوتے۔

مذہبی عقائد میں باقر علی بڑے پکے حنفی تھے اور دیوبند کی گلابی وہابیت کو بھی برداشت نہ کر سکتے تھے۔ شروع شروع میں ان کے رفقائے کار کو شبہ ہونے لگا کہ شاید وہ "بریلویت" کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ لیکن خود باقر علی کو بریلوی کہلانا پسند نہ تھا۔ مذہبی معاملات میں وہ تجدد اور عقلیت کے سخت مخالف تھے۔ لیکن اس راسخ الاعتقادی کے باوجود ان میں کافی رواداری تھی۔ انھوں نے اپنے دوستوں سے مذہبی امور میں بارہا بحث و مباحثہ کیا لیکن اس میں کبھی تلخی پیدا ہونے نہ دی۔ ماہ رمضان میں روزہ قضا نہ ہونے دیتے اور بلاناغہ باندرہ کی جامع مسجد میں نماز تراویح ادا کرتے تھے، اسمٰعیل کالج کی مسجد میں خطیب کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ ان کا خطبہ "ماقل و دل" کی شان لئے ہوتا۔ پروفیسر نجیب اشرف اکثر ان کے مختصر مگر جامع خطبے کی تعریف کرتے۔ مسجد کا یہ خطیب محض بلائے خشک ہی نہ تھا بلکہ ذائقہ بدلنے کے لئے کبھی کبھی فلم کے پردے پر اداکاروں کے حسن کردار سے لطف اندوز بھی ہوتا اور ان کے کمال فن کی داد دیتا۔

باقر علی اپنے اوضاع و اطوار میں بہت سادہ تھے۔ تکلف کا ان میں

شائبہ تک نہ تھا۔ بے تکلفی ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں بہت نمایاں تھی۔ اپنے اساتذہ اور بزرگوں کا ادب اور احترام کرتے اور ان کی خاطر ہر بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے پر آمادہ ہوتے لیکن اس کے باوجود اخلاقی جرأت کے جوہر سے بھی آراستہ تھے۔ جب کبھی انھیں اس بات کا احساس ہوتا کہ ان کا کوئی استاد یا بزرگ غلط طریق اختیار کر رہا ہے تو بلاحجاب بڑے ادب کے ساتھ ان کو اس غلطی پر متنبہ کرتے اس پر بھی اگر وہ بزرگ اپنے اختیار کئے ہوئے راستے پر گامزن ہوتے تو باقر علی اپنی فرماں برداری اور سعادت مندی کی بدولت ہر قسم کی امداد کرنے میں دریغ نہ کرتے۔ ان کی وضع قطع میں مشرق ومغرب کا امتزاج تھا۔ اکثر مغربی لباس زیب تن کرتے۔ خاص خاص موقع پر شیروانی اور ترکی ٹوپی کا استعمال بھی کرتے تھے لیکن لباس کے معاملہ میں حد درجہ سادہ تھے۔ انھیں کبھی اس کی پرواہ نہ ہوتی تھی کہ پتلون کی سلوٹ درست ہے یا نہیں۔ پھٹے پرانے کپڑے پہننے میں بھی وہ کوئی عار محسوس نہ کرتے تھے۔ جوتوں کے معاملہ میں وہ بڑے بے نیاز تھے۔ ہر چار پانچ ماہ کے بعد انھیں جوتا بدلنے کی ضرورت ہوتی تھی بمبئی کی برسات میں چھتری کے بغیر چارہ نہیں چنانچہ وہ کئی بار چھتری خریدتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اکثر چھتری رکھ کر بھول جاتے تھے جس کا خمیازہ انھیں بھگتنا پڑتا تھا۔

دوستی کے معاملہ میں خلوص باقر علی کا امتیازی وصف تھا۔ اپنے اساتذہ اور احباب کے سلسلہ میں انھوں نے عدیم النظیر خلوص کا ثبوت دیا۔ وفاداری کے ساتھ ساتھ وہ بڑے جری اور دلیر بھی تھے۔ مشکل سے مشکل موقع پر بھی وہ اپنے حواس قائم رکھ سکتے تھے۔ ان کی بہادری کی بعض مثالیں آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ رازداری میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔ یہی نہیں کہ دوستوں کے راز کا افشا جائز نہ رکھتے تھے بلکہ

اپنے رازہائے سربستہ کی بھی پوری پوری حفاظت کرتے تھے حکومت ہند کے فیصلے کے مطابق انھیں اکتوبر ۱۹۵۰ء کے پہلے ہفتہ میں مصر روانہ ہو جانا چاہئے تھا، لیکن نہ معلوم وہ کن مصلحتوں کی بنا پر نومبر کے آخر میں عازم سفر ہونا چاہتے تھے۔ جب کبھی ان سے التوا کے اسباب دریافت کئے گئے تو وہ حسب عادت ٹال گئے۔ لیکن اپنے فیصلہ سے سرِمو انحراف نہ کیا۔

باقر علی اپنے ارادے کے بڑے پکے تھے۔ راستے کی مشکلات سے انھیں لاکھ متنبہ کیا جاتا وہ اپنے عزم بالجزم سے باز نہ آتے بمبئی ایشیاٹک سوسائٹی کے کتاب خانے میں ایک اُردو مثنوی جنگ نامۂ رستم علی خاں کے نام سے موجود ہے۔ انھیں ایک بسیط مقدمہ کے ساتھ اس مثنوی کو مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ میں نے ہر چند سمجھایا نہ مانے اور اپنے ارادے پر قائم رہے اور آخر کار اس معاملہ میں کامیاب ہو کر چھوڑا۔

وہ تھے تو کاٹھیاواڑ کے سادات میں سے لیکن دنیاوی سوجھ بوجھ، مصلحت شناسی اور دور اندیشی میں جوناگڑھ کے ناگر برہمنوں کی یاد دلاتے تھے۔ ان کے ایک عزیز دوست انھیں گوپال سوامی آینگر کے خطاب سے موسوم کیا کرتے۔ وہ بہت سی اپنی باتیں صیغۂ راز میں رکھتے یا اشاروں کنایوں میں اس طرح کہتے کہ دوسرے لوگ ان کے سمجھنے سے یکسر قاصر رہتے۔ ان کا دماغ قسم قسم کے منصوبوں کا مخزن تھا۔ نئی نئی ترکیبیں تراشنے میں انھیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ اس قسم کی ایک نئی ترکیب "مقالہ نما" ہے جو انھیں کی دماغی اپج کی پیداوار ہے۔ اُردو رسائل نے اس "بدعت حسنہ" کا جس تپاک سے خیر مقدم کیا وہ باقر علی کے ذہن کی تیزی و براقی پر شاہد عادل ہے۔

باقر علی خط و کتابت انگریزی، اُردو اور گجراتی تینوں زبانوں میں

کرتے تھے۔ مراسلت کو بڑی اہمیت دیتے اور جی لگا کر خط لکھتے۔ ویسے تو ان کے خطوط اکثر دلچسپ ہوا کرتے تھے لیکن ان کے وہ خطوط جو انھوں نے قاہرہ سے لکھے ہیں دلچسپی، رنگینی اور دل کشی کا نہایت عمدہ مرقع ہیں آٹھ آٹھ، دس دس صفحے کا خط لکھتے لیکن اس طوالت کے باوجود دلچسپی میں کوئی فرق نہ آنے دیتے۔ دل کشی کے علاوہ ان کے خطوط ایک ادبی شان لئے ہوتے۔ چنانچہ ارادہ ہے کہ ان کے خطوط کے بعض اقتباسات شائع کر دئے جائیں۔

ان کے احباب کو پورا یقین تھا کہ وہ مصر سے واپسی کے بعد علمی افق پر آفتاب بن کر چمکیں گے۔ اپنی وفات سے آٹھ نو دن پہلے جب قاہرہ کے ہوائی جہاز کے اڈے پر انھوں نے مسز کلثوم پاریکھ کا استقبال کیا تو وہ نہایت خوش و خرم اور تندرست تھے۔ مرتے وقت ان کی عمر پینتیس برس کے قریب تھی۔ کسے اس بات کا گمان ہو سکتا تھا کہ عین شباب کے زمانہ میں موت کا آہنی پنجہ ان کو ہم سے چھین لے گا اور ان کی والدہ، بیوی، بھائی، بہنوں، بچیوں اور بے شمار احباب اور تلامذہ کو سوگواروں کی صف میں کھڑا کر دے گا۔ اگرچہ وہ خود ہم میں باقی نہیں رہے لیکن ان کی یاد ہمارے دلوں میں ہمیشہ تازہ رہے گی۔ ع

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما!

(قادری پریس نور منزل محمد علی روڈ بمبئی ۳)

G/R

~~380~~

6 copies

951